میرزا یگانہ شخصیت اور فن

مرتبین

مشفق خواجہ

پاشا رحمان

آمنہ مشفق

حسنین سیالوی

آصف پبلیکیشنز۔ علی گڑھ

میرزا یگانہ شخصیت اور فن

مرتبین
مشفق خواجہ
پاشا رحمان
آمنہ مشفق

آصف پبلیکیشنز۔ علی گڑھ

© مرتبین

سنہ اشاعت ۱۹۹۲ء
بہ اہتمام عبدالعزیز
طباعت ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دلّی
قیمت ۱۰۰ روپے

MIRZA YAGANA SHAKHSIAT AUR FAN
Edited by Mushfiq Khawaja, Pasha Raheem & Amna Mushfiq
Published by Asif Publications,
Teela Upper Fort
ALIGARH
Price Rs.100/-

ملنے کے پتے

انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر - راؤز ایونیو نئی دلّی
مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دلّی
شمشاد بلڈنگ۔ علی گڑھ
عبدالحق اکیڈمی۔ ای ۹۴ گنیش نگر۔ دلّی ۹۲

آصف پبلیکیشنز
ٹیلہ اپر فورٹ، علی گڑھ

کتب کو بِنا کسی مالی فائدے کے (مفت) پی ڈی ایف کی شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے

حسنین سیالوی

0305-6406067

حسنین سیالوی

فہرست

کچھ اس کتاب کے بارے میں

علی گڑھ کے ایک پبلشر آصف صاحب میرے پاس آئے اور انھوں نے کسی ممتاز محقق یا ناقد کی کتاب کی اشاعت کے بارے میں ذکر کیا۔ میں نے محترم مشفق خواجہ صاحب کی مرتب کردہ کتاب "میرزا یگانہ شخصیت اور فن" کا نام تجویز کیا جو تخلیقی ادب حصہ دوم ۱۹۸۰ء میں چھپی تھی۔ انھوں نے اسے پسند کیا میں نے مالک رام صاحب سے اس کے بارے میں مشورہ کیا تو انھوں نے بھی اس کی اشاعت کو فال نیک تصور کرتے ہوئے کہا کہ "حقیقت میں یگانہ کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوئی ہے۔ انھیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ حقدار تھے۔" مالک رام صاحب کے یگانہ سے بڑے گہرے تعلقات تھے تقسیم ہند کے بعد بھی ان سے خط و کتابت جاری رہی۔ انھوں نے یگانہ پر مضمون بھی لکھا تھا جو "وہ صورتیں الٰہی" میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کا پہلا مضمون یہی ہے اس کے مطالعے سے مالک رام صاحب اور یگانہ کے تعلقات کا بھی کچھ اندازہ ہوگا اور یگانہ کی زندگی کے بعض ایسے واقعات بھی ہمارے علم میں آئیں گے جن کے بارے میں اس سے پہلے معلوم نہ تھا۔ غرض یگانہ کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس مضمون سے بڑی مدد ملے گی۔

مشفق خواجہ صاحب اردو کے ممتاز محقق، نقاد اور شاعر ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی نظر انتخاب جب ان پر پڑی تو انھوں نے انھیں انجمن میں اپنا رفیق کار بنا لیا۔ یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو پاکستان میں مولوی صاحب کے ساتھ قاموس الکتب کی ترتیب و تدوین میں کام کیا۔ اس طرح مولوی عبدالحق کے ساتھ ساڑھے چار سال تک علمی، ادبی اور تحقیقی کام انجام دیے۔ انجمن کا سہ ماہی مجلہ "اردو" اور ماہنامہ "قومی زبان" کے مدیر اور انجمن کے اسسٹنٹ سکریٹری رہے۔ ۱۹۷۳ء میں انجمن سے مستعفی ہو گئے، جب سے گھر پر تصنیف و تالیف کے کاموں میں مشغول ہیں۔ خامہ بگوش کے عنوان سے سیکڑوں طنزیہ اور مزاحیہ تحریریں ان کی شناخت بن چکی ہیں۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست درج ذیل ہے:

خوش معرکۂ زیبا۔ سعادت خاں ناصر: اردو شعراء کا یہ اہم تذکرہ عرصے سے غیر مطبوعہ تھا اسے دو جلدوں میں ایڈٹ کیا جسے مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں یکے بعد دیگرے شائع کیا۔

ابیات: (شعری مجموعہ) اس مجموعے میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۸ء تک کا کلام ہے جسے مکتبہ نیا دور کراچی نے شائع کیا۔

جائزہ مخطوطات اردو: جلد اول اس میں پاکستانی کتب خانوں کی قلمی کتابوں کا سوانحی اور کتابی جائزہ پیش کیا ہے۔

اقبال از احمد دین: اقبال پر سب سے پہلی کتاب جو ۱۹۲۳ اور ۱۹۲۶ء میں طبع ہوئی لیکن ضائع کر دی گئی۔ اس کو از سر نو تفصیلی مقدمے کے ساتھ مرتب کر کے انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کیا۔

غالب اور صفیر بلگرامی: غالب اور ان کے مشہور شاگرد صفیر بلگرامی کے حالات اور ان کی نادر تحریریں عالمانہ انداز میں پیش کی ہیں۔ اسے عصری مطبوعات کراچی نے شائع کیا ہے۔

تحقیق نامہ: خواجہ صاحب نے اس کتاب میں اپنی تحقیقی کتابوں کے مقدموں کے علاوہ بھی چند مضامین اس میں شامل کیے ہیں۔ اس کا ایک اڈیشن کراچی سے اور دوسرا مکتبہ جامعہ نئی دلّی سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا ہے۔

غرض خواجہ صاحب کی ان کتابوں کے علاوہ تخلیقی ادب کے وہ پانچوں شمارے بھی ہیں جو انھوں نے بڑی دیدہ ریزی اور محنت سے مرتب کیے تھے اور وہ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء تک یکے بعد دیگرے شائع ہوئے تھے۔ تخلیقی ادب کے دوسرے حصے کا ایک گوشہ میرزا یگانہ شخصیت اور فن سے متعلق ہے اس میں یگانہ کی دو غیر مطبوعہ تحریریں "خاصہ خاصان ادب" اور "اپنا کریکٹر" یگانہ کا غیر مطبوعہ کلام اور وہ وار کا داس شعلہ کے نام ۹۵ غیر مطبوعہ خطوط شامل ہیں جن سے یگانہ کی شخصیت اور ان کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان تمام خطوط پر خواجہ صاحب نے تفصیل سے حواشی لکھے ہیں۔ تخلیقی ادب حصہ دوم میں خواجہ صاحب نے یگانہ کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "میرزا یگانہ بلاشبہ موجودہ صدی کے اہم شعرا میں سے ہیں لیکن ان کی ادبی اور غیر ادبی ازم آرائیوں کی وجہ سے عام طور پر ان کے شاعرانہ کمالات کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں تفصیلی جائزوں کا کیا ذکر مختصر تنقیدی مضامین بھی دو چار سے زیادہ نہیں لکھے گئے۔ ہم نے یگانہ کے فکر و فن اور شخصیت کے چند مطالعے پیش کیے ہیں اور سلسلہ میں ان کی بہت سی غیر مطبوعہ تحریریں (نظم و نثر دونوں) بھی شائع کی جا رہی ہیں۔ یگانہ کے مطالعے کے سلسلے میں یہ تحریریں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔" (تخلیقی ادب حصہ دوم ص ۹)

"نشتر یاس"، "آیات وجدانی"، "ترانہ"، "گنجینہ"، "غالب شکن"، "شہرت کاذبہ" اور "چراغ سخن"، یگانہ چنگیزی کی مشہور تصانیف ہیں۔ میرزا یگانہ چنگیزی یوں تو زندگی بھر تنگ دست رہے اور تلاش معاش کے سلسلے میں مختلف شہروں میں قیام کرنا پڑا جب تک وہ عثمان آباد اور لاتور حیدرآباد دکن میں سب رجسٹرار کے عہدے پر رہے مالی حالت نسبتاً بہتر رہی۔ اس کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو کر مستقل طور پر لکھنؤ آ گئے اور زندگی کے آخری ایام بڑی مصیبت اور بدحالی میں گزارے۔ اس وقت لکھنؤ میں ان کے ہم عصروں میں صفی، عزیز اور ثاقب کا طوطی بول رہا تھا۔ ان سے یگانہ کے ادبی معرکے بھی ہوئے ان کو طرح طرح سے دق کیا گیا قتل تک کی دھمکی دی گئی مگر وہ بڑے دلیر اور جری انسان تھے انا ایسی کہ کبھی کسی کے آگے نہیں جھکے۔ بڑے طنطنے کے انسان تھے۔ علمی تمکنت اور نازک مزاجی ان کا سب سے بڑا خاصہ تھا شاعری میں میر انیس اور آتش کے قائل تھے۔ تخلیقی ادب حصہ دوم کے مرتبین کے نام جناب پاشا رحمان، جناب مشفق خواجہ اور محترمہ آمنہ مشفق ہیں۔ اور ان تینوں کی کاوشیں اس میں شامل ہیں۔ اسی لیے کتاب پر بھی مرتبین کی حیثیت سے ان تینوں حضرات کے نام درج کیے گئے ہیں۔ یہ ہندوستان اور پاکستان میں اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے اور پہلی بار ایک ادیب اور شاعر کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے میں اس سلسلے میں ان تمام مقالہ نگاروں اور خاص طور سے مشفق خواجہ صاحب پاشا رحمان صاحب اور آمنہ مشفق صاحبہ کا شکر گزار ہوں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلّی

۱۰ نومبر ۱۹۹۲ء

ایم۔ حبیب خاں

خاصۂ خاصانِ ادب

(غیر مطبوعہ تحریر)

وہ جانِ ادب ، خاصۂ خاصانِ ادب
ساتھ اپنے یگانہ لے گئے شانِ ادب

میرزا یگانہ دو سو برس کی ادبی تاریخ میں خود اپنے تئیں خاصۂ خاصانِ ادب جانتے تھے اور وہی لکھ سکتے تھے، دوسرا کبھی نہ لکھتا۔ انجمن ترقی اُردو نے میرزا صاحب کی پچاس سال کی ادبی زندگی دیکھ لینے کے بعد بھی اتنا نہ جانا کہ میرزا یگانہ نامی اردو ادب میں کوئی شخصیت تھی۔ نہ اردو ادب کے تذکرہ نویسوں نے اپنی اپنی تصنیفوں اپنے اپنے مضامین میں یگانہ کا نام آنے دیا۔ شاباش!

کافر کوئی اپنا ہے نہ دیں دار اپنا | اچھا نہ سہی کوئی خریدار اپنا
ٹیکا ہے نہ گنٹھا ہے یہاں ماتھے پر | سیرت اپنی ہے اور کردار اپنا

سیرت ہی اپنا مذہب ہے۔

مرزا کا قدم غلط نہ پڑتے دیکھا | ناحق کبھی یاروں سے نہ لڑتے دیکھا
سیدھے سے آدمی تھے بالکل سیدھے | جھکتے کبھی دیکھا نہ اکڑتے دیکھا

اکڑنا یہ ہے کہ امر ناحق پہ اڑے رہیں۔ امر حق پر قائم اور ثابت رہنا اکڑنا نہیں ہے، استقامت ہے۔ وہی خود اعتمادی، وہی ثابت قدمی جو انسانیت کے اعلیٰ جوہر ہیں جو یگانہ کی ذات میں روزِ روشن کی طرح آشکارا ہیں، انھیں شیخی یا اکڑ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ افسوس!

A truth cannot be killed by giving it a bad name

اپنا کیریکٹر

(غیر مطبوعہ تحریر)

عیب و ہنر سے کوئی بشر خالی نہیں۔ کمزوریاں مجھ میں بھی ہیں مگر بعض ایسی خصوصیات بھی ہیں جنہیں میں نعمتِ الٰہی سمجھتا ہوں۔

(۱) غلامانہ ذہنیت سے میری طبیعت ہمیشہ نفرت کرتی رہی ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا، مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی غلامانہ ذہنیت کا مجھ پر غلبہ ہُوا ہو یا کسی کے آگے جھکنے کا میلان پایا گیا ہو۔ میرا یہ طبعی خاصہ اُس وقت بھی کافی قوت کے ساتھ موجود تھا جب میں بہت کم سن تھا اور ناموافق و نامساعد حالات میں پرورش پا رہا تھا۔ خاندان کی حیثیت مٹ چکی تھی۔ موروثی جاگیر تباہ ہو چکی تھی۔ خاندانی اعزاز اور ظاہری وجاہت پر پانی پھر چکا تھا۔ اُس وقت اور اُس سن میں مزاج کی یہ حالت (کہ عمائد شہر کی شانِ امارت نگاہوں میں جچتی نہ تھی) بادی النظر میں مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ اسکول کے بعض طلبہ میری بددماغی پر ہنستے تھے کیونکہ میں اپنے سن اور غربت کے سبب اس امر کا مستحق نہ تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کو بے حقیقت سمجھوں، اُن کا رعب نہ مانوں۔

زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ دُنیا ترقی کی منزلیں طے کرتی گئی مگر اپنی زندگی آسودہ حالی سے بیگانہ رہی۔ کشمکشِ زندگی بڑھتی ہی گئی مگر اِس کشمکش، اس امتحان، اس ابتلا میں وہ ذاتی جوہر فنا تو کیا ہوتا اور چمکتا گیا۔ ممکن ہے میں دنیا کی نگاہ میں فنا ہو گیا ہوں (حالانکہ آثار سے یہ ثابت نہیں ہوتا) مگر اپنی نگاہ میں فنا نہ ہوا۔ غلامانہ ذہنیت نے کبھی مجھ پر غلبہ نہ پایا۔

(۲) سہو و خطا بھی ودیعتِ فطرت ہے۔ مگر اس امر میں میری فطرت طلبِ عفو سے متنفر رہی ہے۔ اپنی خطاؤں پر معافی مانگنے کا خیال (اگر فی الواقع کوئی خطا میری نگاہوں میں خطا ثابت بھی ہو جائے) میرے نفس پر نہایت گراں گزرتا ہے۔ معافی مانگنا میرے نزدیک نہایت مذموم بات ہے۔ خطا اگر ہو گئی تو اُس کی سزا بھگت لینا ہی بہترین عمل ہے کیونکہ معافی مانگنے سے روح ذلیل اور سزا بھگت لینے سے پاک ہو جاتی ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ آخر معافی مانگنے کا خیال میرے نفس پر گرانی کیوں کرتا ہے۔ مگر آخر کو پتا یہ چلا کہ یہ بھی مُغلوں کا اک طبعی خاصہ ہے کہ کسی کے آگے سر نہ جھکائیں۔ پادری کا رمین نے مغلوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مغل اگر دشمن کے ہاتھ میں گرفتار ہو جاتا ہے تو کبھی ان سے امان نہ مانگتا اور اگر دشمن مغل کے قبضے میں آ جائے تو مغل کبھی اسے زندہ نہیں چھوڑتا۔ غالباً اسی طبعی خاصہ کے تحت اپنی خطا پر معافی مانگنے کا خیال نفس پر گراں گزرتا ہے۔

میرزا یگانہ چنگیزی

(۱)

میں نے مارچ ۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ انٹر کالج، گجرات سے انٹر کا امتحان دیا۔ چوں کہ اس کے بعد بی اے میں داخلے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ تھا، میں نے سوچا کہ جب تک نتیجے کا اعلان نہیں ہوتا، کیوں نہ لاہور کا ایک چکر لگایا جائے! چناں چہ میں ایک ہم جماعت دوست کی معیت میں لاہور پہنچا۔ میں ایک مرتبہ اس سے پہلے ۱۹۱۷ء میں جب کہ میری عمر دس گیارہ برس کی تھی، ایک تقریب میں شمولیت کی خاطر لاہور آیا تھا؛ لیکن ایک تو وہ کم عمری کا زمانہ تھا، اور اب اس پر بھی بہت دن گزر چکے تھے، اس لیے میں صحیح معنوں میں اس ۱۹۲۶ء کے سفر ہی کو لاہور سے اپنا سابقہ خیال کرتا ہوں۔ یہاں لاہور میں میرے عزیز دوست احمد حسن پہلے سے موجود تھے۔ ہم دونوں نے ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۴ء وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول وزیر آباد میں یکجا تعلیم پائی تھی۔ وہ رہتاس (ضلع جہلم) سے ورنیکلر مڈل کر کے آئے تھے اور میں اپنے وطن پھالیہ (ضلع گجرات) سے۔ جونیر اور سینیر اسپیشل کے اور دونویں اور دسویں درجے کے۔ چار برس ہم ایک ساتھ رہے۔ تعلیم کی یکسانیت کے باعث ہمارے پسند اور ناپسند کے بیشتر موضوع ایک سے تھے۔ پسند میں منجملہ اور باتوں کے اردو اور فارسی کا ذوق بھی تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم گھنٹوں سوائے اردو ناول یا مختلف اساتذہ کے دیوان پڑھنے کے اور کچھ نہیں کرتے تھے۔ اور تو اور، درجے میں بھی (جہاں ہم دونوں ایک ہی بنچ پر ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے)، یہی شغل رہتا تھا۔ اس شوق نے ہمیں ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا، اور ہم سارا وقت اکٹھا گزارتے تھے۔

۱۹۲۴ء کے اوائل میں ہم نے دسویں درجے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے

حالات کی مجبوری سے آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے، لاہور چلے آئے اور ملازمت اختیار کرلی۔ میں نے گجرات کالج میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے اب ۱۹۲۷ء میں انٹر کا امتحان دیا تھا۔ اِن ایام میں وہ مشہور انگریزی روزنامے "مسلم آؤٹ لُک" میں ملازم تھے اور اس کے دفتر سے قریب ہی محلہ چابکسواراں میں رہتے تھے۔ ہم یہاں آئے، تو سیدھے ان کے کمرے پر پہنچے۔

ہمارے یہاں آنے کے دوسرے دن اتوار تھا۔ احمد حسن نے کہا: چلو، مشاعرے چلیں۔ یہ مشاعرہ موری دروازہ کے باہر ایس، پی، ایس کے ہال میں ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں یہاں دو ادبی محاذ تھے۔ ایک "انجمنِ اربابِ علم وادب" کا — اس کے سرخیل مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم تھے۔ وہ مقامی دیال سنگھ کالج میں اردو اور فارسی اور عربی کے شعبے کے صدر تھے۔ اور دوسرا "بزمِ ادب، پنجاب" کا — اس کے کرتا دھرتا نیازمندانِ لاہور یعنی سالک تاثیر، بطرس وغیرہ تھے۔ تاجور عمر میں سب سے بڑے تھے۔ ان کی دنیوی سوجھ بوجھ اور انتظامی قابلیت بہت اچھی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے لاہور کے مشہور ناشرِ کتب عطر چند کپور کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ لگا کے ایک ادارہ "اردو مرکز" کے نام سے قائم کریں۔ مقصد یہ تھا کہ مستند مصنفین سے اردو کتابوں کا ایک سلسلہ اور انتخاب تیار کرایا جائے، جسے صوبے کے مدارس میں نصاب کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے بااثر حلقے بھی غالباً اس منصوبے کی پشت پر تھے کیوں کہ ظاہر ہے، اگر کتابیں شائع ہونے کے بعد مدارس کے لیے منظور ہی نہ ہوں، تو یہ پوری اسکیم بے کار تھی۔ بعد کو اردو مرکز سے یہ منتخبات ۲۷ جلدوں میں شائع ہوئے تھے۔

تاجور خود اس ادارے کے مہتمم بنے اور انھوں نے اس میں کام کرنے کے لیے متعدد مقامی حضرات کے علاوہ باہر کے بعض مشاہیر کو بھی لاہور میں جمع کرلیا۔ ان باہر سے آنے والوں میں اصغر گونڈوی، میرزا یاس عظیم آبادی ثم یگانہ لکھنوی (جو ابھی چنگیزی نہیں بنے تھے) جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی، مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی اور بعض اور اصحاب بھی تھے۔ ماشاءاللہ ان میں کثرت شعرا حضرات کی تھی۔

دونوں پارٹیاں اپنے ہفتہ واری مشاعرے کرتی تھیں۔ عام لوگوں کو ان پڑھے لکھے

جنون کی ذاتی مخالفتوں اور رنجشوں سے کیا سروکار! وہ بے جھجک دونوں کے مشاعروں میں خاصی تعداد میں آتے۔ ایک طرف ملک کے مشاہیر کا گروہ تھا، تو دوسری طرف پنجاب کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا۔ یہی زمانہ ہے، جب ابوالاثر حفیظ جالندھری منصۂ شہود پر آئے، یہ دوسری پارٹی کے گلِ سرسبد تھے۔

تو خیر، جس مشاعرے میں ہم لوگ اس اتوار کے دن گئے، یہ تاجور پارٹی یعنی انجمنِ اربابِ علم و ادب کا مشاعرہ تھا۔ یہیں میرزا یاس یگانہ کو پہلی مرتبہ دیکھا اور سنا۔ مشاعرے کی صدارت سر شیخ عبدالقادر مرحوم نے کی تھی۔ انھوں نے میرزا سے اپنا کلام سنانے کو کہا، تو وہ منبر پر تشریف لائے۔ لگ بھگ ۴۵ برس کا سن متوسط قد، سانولا رنگ تیکھا ناک نقشا، بڑی بڑی ذہین اور چمکدار سیاہ آنکھیں، چشمہ لگائے ہوئے، یہ بڑی گھنی مونچھیں جنھیں بھرپور تاؤ دے رکھا تھا۔ سر پر اونچی دیوار کی سیاہ کپڑے کی ٹوپی اور گلے میں معمولی سپید کپڑے کی شیروانی تھی، جس کی بائیں طرف کی جیب کے باہر گھڑی کی زنجیر دکھائی دے رہی تھی، نیچے سپید لٹھے کا پاجامہ، پیروں میں سیاہ رنگ کا پمپ شو اور ہاتھ میں ہلکی سی بید کی چھڑی۔ یہ تھے میرزا یاس عظیم آبادی۔ غائبانہ طور پر میں انھیں بہت دن سے جانتا تھا، میں نے مخزن (دورِ اول) میں، اور بعض دوسرے رسائل میں بھی، اُن کا کلام پڑھا تھا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ غالب کے مخالف ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں بھی، خود انھیں اچھا شاعر قبول کر لینے کے باوجود، مجھے ان کی غالب دشمنی پسند نہیں تھی۔ اس لیے غیر شعوری طور پر میں انھیں کبھی کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔

قصہ کوتاہ، وہ کلام پڑھنے کو منبر پر آئے۔ انھوں نے ایک پرانی غزل سنائی۔ مطلع تھا:

دلیلِ راہِ محبّت ہے فیصلہ دل کا[۱]	چلے چلو، جہاں لے جائے ولولہ دل کا

---

[۱] یہ زمین غالباً آفتاب الدولہ خواجہ ارشد علی خان قلق لکھنوی کی ہے۔ ان کی غزل کا مطلع ہے:

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا	ادا سے دیکھ لو، جاتا رہے گلہ دل کا

لکھنؤ کے اور کئی شاعروں کی بھی اس زمین میں غزلیں موجود ہیں۔

اور مقطع تھا:

پیالہ خالی اٹھا کر ، لگا لیا منہ سے ۔۔۔ کہ یاس! کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

سات آٹھ شعر سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ انھوں نے پوری غزل ترنم سے کچھ ایسے دلکش انداز سے پڑھی کہ کیا عرض کروں: ان کے ہاتھ میں کوئی کاغذ نہیں تھا، وہ حافظے سے پڑھ رہے تھے۔ پڑھتے میں وہ کبھی کبھی سیدھا ہاتھ یوں اُٹھاتے، جیسے دنیا کی نا فہمی سے نالاں اور شاکی ہوں۔ وہ نیم وا آنکھوں سے حاضرین پر کچھ ایسی کھوئی کھوئی نگاہ ڈالتے، جیسے اس بھری مجلس میں اپنے آپ کو اکیلا اور غریب شہر سمجھتے ہوں، اور کسی سخندان کی تلاش میں ہوں، تاکہ اس کے سامنے سخنہائے گفتنی کہہ سکیں۔ یہ واقع ہے کہ میں ان کی غزل سے بہت متاثر ہوا تھا۔ حاضرین نے داد دینے میں بخل نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود، ان کے لب ولہجہ اور ان کے اندازِ سے میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ وہ اس سے مطمئن نہیں اور اپنے آپ کو اس سے زیادہ کا مستحق خیال کرتے ہیں۔

اب عمر کا تقاضا خیال، یا کلام کی بلندی، یا ان کے پڑھنے کے انداز کا اثر۔ اس کے بعد میری تمام پوشیدہ اور غیر شعوری مخالفت ہوا ہو گئی اور اس کی جگہ ہمدردی نے لے لی میں نے اس کے بعد ان کا کلام ان کے منہ سے ــــــ خلوت میں اور جلوت میں بیسیوں مرتبہ سنا، لیکن حال آں کہ اس واقعے پر آج ۴۶ - ۴۷ برس گزر چکے ہیں، اس پہلی مرتبہ کے نقوش اتنے گہرے ہیں کہ ان کی ایک ایک ادا اور ایک ایک انوٹ مجھے یاد آ رہی ہے، اور یوں محسوس ہوتا ہے، گویا ان کی آواز اب بھی فضا میں گونج رہی ہے۔ جب ہم مشاعرے سے نکلے، تو میں نے احمد حسن سے کہا کہ کسی سے پوچھیے، کہ یہ رہتے کہاں ہیں، ممکن ہوا، تو واپس جانے سے پہلے ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ اتنے میں ہال کے پشت والے دروازے سے شاعر حضرات بھی برآمد ہونے لگے تھے۔ احمد حسن نے آگے بڑھ کے خود میرزا صاحب سے ان کے مسکن کا پتا پوچھا اور اگلے دن شام ملنے کا وقت طے کر لیا۔

میرزا صاحب چنگڑ محلے میں رہتے تھے۔ یہاں انھوں نے پیسہ اخبار گلی میں ایک کمرہ کرایے پر لے رکھا تھا۔ اس زمانے میں میرزا فہیم بیگ چغتائی بھی ان کے کہیں قریب ہی مقیم

تھے۔ جب ہم اگلے دن شام کو وہاں پہنچے تو ان دونوں کے علاوہ جناب حفیظ الرحمٰن سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ لاہور ہی کے رہنے والے تھے، اور غالباً منشی محبوب عالم بانی و مدیر پیسہ اخبار کے عزیزوں میں تھے۔ وہ اپنے نام کی مناسبت سے ان دنوں "حفظ العلوم" کے نام سے ایک اردو انسائیکلوپیڈیا مرتب کر رہے تھے۔ انھوں نے ردیف وار مختلف پٹھوں میں متعدد مضامین سے متعلق اپنا جمع کردہ مواد دکھایا تھا۔ یہ اچھی خاصی مقدار میں تھا۔ لیکن انسائیکلوپیڈیا کا کام کسی ایک آدمی کے بس کی بات تو ہے نہیں، نہ ہر شخص دنیا جہان کے سارے علوم کا ماہر سکتا ہے، نہ کسی کے پاس اتنا وقت ہی ہے کہ وہ اور سب کام کاج چھوڑ کر بس اسی کا ہو رہے۔ اس لیے میں نے ان سے کہا کہ آپ اکیلے اتنا بڑا کام مکمّل نہیں کر سکیں گے، ممکن ہو، تو کچھ اور اصحاب کا تعاون حاصل کیجیے، بلکہ حکومت اور محکمۂ تعلیم کو بھی توجہ دلائیے، ورنہ آپ کی یہ ساری محنت رائگاں جائے گی۔

خدا معلوم ان کے جمع کیے ہوئے ذخیرے کا کیا حشر ہوا!

میرزا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بہت بے تکلفی اور تپاک سے ملے۔ میرا اور میرے ساتھیوں کا حال پوچھا۔ اپنا بتایا کہ "اردو مرکز" میں کام کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ ان کا حال اور ماحول دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ یا تو ان کا مشاہرہ بہت کم ہے، یا پھر ان کی نجی ذمّہ داریاں اتنی ہیں کہ وہ اپنی ذات پر زیادہ خرچ کرنے سے معذور ہیں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ دونوں باتیں صحیح تھیں۔

گھنٹہ آدھ ٹھہرنے کے بعد ہم نے اجازت چاہی اور واپس چلے آئے۔ فرمایا: اگر اور کچھ دن یہاں قیام ہو، تو بے تامّل آ جائیے؛ میں شام بالعموم گھر ہی پر رہتا ہوں اور کہیں جاتا آتا نہیں۔

دو تین دن بعد پھر ایک شام حاضر ہوا فہیم گوالیاری، ان کے صبح و شام کے جلیس، اس دن بھی موجود تھے۔ دو تین اور مقامی دوست بھی بیٹھے تھے۔ بات اردو زبان اور ان کے کلام سے متعلق چھڑ گئی۔ فہیم کی اردو محاورے اور روزمرّے پر اچھی نظر تھی۔ میں نے میرزا صاحب سے کہا: کسی نے آپ کے شعر ؂

وحشت آبادِ جہاں کی دلفریبی دیکھیے ‏ ‏ ‏ ‏ سیکڑوں آزاد پابندِ سلاسل ہو گیا

پر اعتراض کیا ہے کہ جمع فاعل (سیکڑوں) کے ساتھ فعلِ واحد (ہو گیا) ٹھیک نہیں ہے۔ میرزا صاحب نے تو کوئی جواب نہیں دیا، سنی اَن سنی کر دی۔ لیکن فہیم چمک کے بول اٹھے: اس سے معترض نے اپنی اردو روزمرے سے ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے، بول چال میں عام طور پر اسی طرح سے بولتے ہیں۔ مثلاً وہاں میدان میں سیکڑوں آدمی جمع ہو گیا۔ آتش کا شعر سند میں پیش کیا جا سکتا ہے:

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے ‏ ‏ ‏ ‏ ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

اتنے میں حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ آپ کا مطلع ہے:

کہاں تلک دلِ غمناک پردہ دار رہے ‏ ‏ ‏ ‏ زبانِ حال پہ جب کچھ نہ اختیار رہے

کیا تلک اب متروک نہیں ہے؟ اب کے مرزا صاحب نے جواب دیا۔ کہنے لگے کہ تلک کو کس نے متروک قرار دیا، اور یہ کہاں لکھا ہے؟ صرف یہی نہیں، میں پوچھتا ہوں، کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ جس لفظ کو چاہے، متروک قرار دے دے؟ حضرت حال آنکہ ہم اہلِ زبان ہیں، ہم بھی یہ نہیں کر سکتے کہ کسی لفظ کو زبان سے خارج کر دیں۔ ہاں، اگر رفتہ رفتہ کسی لفظ کا استعمال کم ہو جائے، یا بالکل نہ رہے تو ہم اعتراض نہیں کریں گے۔ زبان لوگوں کے لیے ہے کہ وہ اس سے اپنا مافی الضمیر ایک دوسرے سے کہہ سکیں۔ اگر وہ کسی لفظ کو کسی وجہ سے مفیدِ مطلب نہیں پاتے، تو اُن کا حق ہے کہ اس کی جگہ کسی اور لفظ کو بازار کا سکہ بنا لیں۔ لیکن بڑے سے بڑے اہلِ زبان اور استاد کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ تحکّم سے کوئی لفظ زبان سے خارج کر دے۔ پس اگر اس شعر میں "تلک" کا استعمال اپنے لغوی معنوں میں درست ہے، تو مجھے پروا نہیں کہ کوئی صاحب اسے متروک خیال کرتے ہیں۔ دو مہینے بعد ہمارے امتحان کا نتیجہ نکل آیا اور اب میں مستقل طور پر لاہور آ گیا۔ یہاں میں نے ڈی، اے، وی کالج میں بی اے کے درجے میں داخلہ لیا اور کالج کے ہوسٹل میں رہنے لگا۔ میرزا صاحب سے تعارف تو ہو ہی چکا تھا، جونہی یہاں جم گیا، میں نے اولیں فرصت میں ان سے رابطہ قائم کر لیا۔ رفتہ رفتہ ہمارے تعلقات بہت

گہرے ہو گئے۔ چوں کہ ان کا مسکن چنگڑ محلہ میرے ہوسٹل سے دور نہیں تھا، اس لیے آسانی سے
ہر دوسرے تیسرے دن ملاقات ہونے لگی۔

جب ہم بے تکلف ہو گئے، تو لامحالہ سب سے پہلے غالب پر بحث ہوئی۔ میں نے ایک دن
ذرا شکوے کے انداز میں ان سے پوچھا کہ آخر آپ غالب کے اتنے مخالف کیوں ہیں؟ فرمایا:

"یہ کس نے آپ کو بہکا دیا کہ میں غالب کا مخالف ہوں! وہ یقیناً بہت بڑا شاعر ہے۔
صاحب! غالب کی صحیح قدر و منزلت مجھ سے زیادہ کون سمجھیگا۔ مجھے غصہ اس بات پر
آتا ہے کہ لوگ اس کے جائز مقام سے زیادہ اسے دینا چاہتے ہیں۔ اور پھر ستم یہ ہے کہ یہ بھی وہ
لوگ نہیں، جو اس کا صحیح مقام سمجھتے ہوں، بلکہ وہ جو تقلیداً اسے بڑا سمجھتے ہیں۔ یعنی اس
لیے نہیں کہ انھوں نے خود سوچ سمجھ کے، اور اس کے کلام کی خوبیوں کا اندازہ کر کے، یہ فیصلہ
کیا ہو، بلکہ اس لیے کہ زید یا بکر ایسا کہہ رہے ہیں۔ ایسے رکابی مذہب لوگوں کی مادر ان کی رائے کی
کیا وقعت؟ اور اگر یہ لوگ غالب کو بڑا کہیں، تو اس سے ان کی عزت میں کیا اضافہ
ہو جائے گا! میں اسے تحسینِ ناشناس سے زیادہ نہیں سمجھتا۔"

"میں نے جب دیکھا کہ لکھنؤ کے بعض چھُٹ بھیئے محض بھیڑ چال میں غالب کی تعریف
کر کے دوسرے واقعی قابلِ قدر شاعروں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ،
اس سے مطلب سعدی دیگر تھا۔ وہ اس پردے میں اپنی خامیاں چھپانا اور اپنی
تعریف کرانا چاہتے تھے۔ میں نے دونوں پہلوؤں سے ان کی قلعی کھول کے رکھ دی۔
آتش بہت بڑا شاعر ہے، اتنا بڑا کہ آج تک لکھنؤ نے اتنا بڑا شاعر پیدا نہیں کیا،
بلکہ سچ یہ ہے کہ پوری اردو شاعری میں، شاید میر کو چھوڑ کر، اس کا جواب نہیں۔ میں نے غالب
کا آتش سے مقابلہ کیا اور ثابت کر دیا کہ آتش کو ہر پہلو سے غالب پر فوقیت حاصل ہے۔
دوسرے میں نے ان اناڑیوں کے میرِ کارواں عزیز کی شاعری پر تنقید کر کے اس کے
ڈھول کا پول کھول کے رکھ دیا۔ اس پر عزیز اور اس کے چیلے چانٹے بہت تلملائے اور
انھوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن کسی سے میرے اعتراض اٹھائے نہ اٹھ سکے۔"

"تو صاحب! میں غالب کے خلاف نہیں تھا، اور نہ ہوں۔ لیکن میں اس کی جائز

جگہ سے زیادہ اس کے حوالے کر دینے پر تیار نہیں۔ اب ان سورماؤں سے اور کچھ تو ہو نہ سکا، کھسیانی بلّی کھمبا نوچے، سازش کر کے چڑھ آئے۔ عوام کو میرے خلاف بھڑکایا کہ میں غالب کی ہتک کر رہا ہوں۔ بیرونی کہہ کر میرا بائیکاٹ کیا۔ میری بے عزتی کی گئی۔ یہاں تک کہ میرے بیوی بچّوں کا گھر سے نکلنا محال ہو گیا۔ غرض بہت فضیحتا ہوا۔ لیکن کیا اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ غالب واقعی آتش سے بڑا شاعر ہے، یا عزیز کی خرافات کسی توجہ کے قابل ہیں؟ میری یہ دونوں باتیں آج بھی جوں کی توں اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ اور ابھی کیا ہے! اور سو پچاس برس میں اردو زبان اور ادب کا مورّخ جو فیصلہ کرنے والا ہے، اس کا بھی مجھے یقین ہے۔"

انھوں نے غالب کی نسبت سے دو لفظ بھی وضع کیے تھے: ایک غلبانا مصدر۔ اگر کوئی شخص غالب سے غیر معمولی طور پر مرعوب ہو جائے، یا اس کی تعریف کرنے لگے، تو فرماتے: "لیجیے، فلاں صاحب بھی غلبا گئے۔" دوسرا غلبچی، وہ شخص، جو اٹھتے بیٹھتے غالب کا ڈھنڈورا پیٹے اور اس کی بڑھ بڑھ کر تعریف کرے یعنی غالب کا مؤیّد، مدّاح وغیرہ۔

اس پر مجھے ایک بات یاد آ گئی:۔

میرزا یگانہ نے کہا کہ میں نے عزیز کی شاعری پر تنقید کی۔ یہاں ان کا اشارہ اپنے مختصر رسالے "خرافاتِ عزیز" کی طرف تھا۔ بہت دن کی بات ہے، کوئی پندرہ سولہ برس کی، ایک دن میں جناب گوپی ناتھ امن کے ساتھ تھا۔ باتوں باتوں میں یگانہ اور عزیز کی اس چپقلش کا ذکر آ گیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، امن صاحب نے منشی بیج ناتھ فگار کے علاوہ عزیز سے بھی اپنے کلام پر اصلاح لی ہے۔

جس زمانے میں لکھنؤ کے شعرا نے یلغار کر کے یگانہ۔ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا، امن صاحب بھی وہیں لکھنؤ میں تھے اور ان واقعات میں ان کی حیثیت گویا عینی شاہد کی ہے۔ فرمانے لگے! "صاحب! عزیز میرے اُستاد تھے اور ہمارا فرض تھا کہ ہم ان کی حمایت اور یاس کی مخالفت کریں۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ یاس صاحب کے اعتراضات کا جواب ممکن نہیں تھا۔ چناں چہ ہمیں کچھ کرتے بن نہ آئی۔"

یہ امر واقع ہے کہ لکھنؤ کے شاعروں نے اس زمانے میں یاس سے جو سلوک کیا،

اسی نے رفتہ رفتہ انھیں یگانہ بنا دیا۔ اس کا حال بھی انھیں کے لفظوں میں سنیے۔ ایک دن باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا: آخر آپ کی لکھنؤ والوں سے بگڑی کیوں اور کیسے؟ کہنے لگے:

'میں ۱۹۰۹ء میں اپنے علاج کے لیے لکھنؤ آیا۔ علاج سے جسم تو ٹھیک ہو گیا اس کی جگہ ایک ذہنی روگ نے لے لی۔ اس زمانے میں لکھنؤ کی فضا شعر و شاعری سے معمور تھی۔ یہاں کی خاک کچھ ایسی دامنگیر ہوئی کہ عظیم آباد واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ حسنِ اتفاق سے کچھ مدّت بعد یہیں ایک شریف گھرانے میں، حکیم میرزا محمد شفیع کی بیٹی سے میری شادی ہو گئی۔ لیجیے، پانو میں ایک اور بیڑی پڑ گئی۔ یہ ۱۹۱۳ء کی بات ہے۔ اس کے بعد میں وطن گیا اور بزرگوں سے جو تھوڑا بہت ورثے میں ملا تھا، اسے اونے پونے داموں پر ٹھکانے لگا، مستقل طور پر لکھنؤ چلا آیا۔ یہاں جو مشاعرے ہوتے تھے، میں ان میں برابر شریک ہوتا۔ اب اس میں میرا کیا قصور! یہ خدا کی دین ہے، میرا کلام پسند کیا جانے لگا۔ باہر کے مشاعروں میں بھی اکثر جانا پڑتا۔ میری یہ ہر دلعزیزی اور مقبولیت ان تنگ دلوں سے دیکھی نہ گئی۔ اسی زمانے میں ان لوگوں کو مخاطب کر کے میں نے ایک فخریہ قطعہ کہا تھا۔ آپ بھی سنیے:

کون ہوں، کیا ہوں، مجھے بھی دیکھ لیں اہلِ نظر — کوچہ گردِ لکھنؤ، خاکِ عظیم آباد ہوں

مردِ جاہل ہوں، مگر جہلِ مرکب سے بری — شخصِ خود بیں ہوں، نہ میں خود ساختہ استاد ہوں

ہوں ادب پروردۂ بیتاب فخرِ روزگار — ناز اس پر ہے کہ خاکِ آستانِ شاد ہوں

شیر و رنجور و تمنا و مبارک کا غلام — خادمِ امداد ہوں، میں بندۂ آزاد ہوں

میرے محسن ہیں: نہال و شائق و شیدا و راز — یاد ہیں مجھ کو تو سب، میں بھی کسی کو یاد ہوں؟

جان سے بڑھ کر سمجھتے ہیں مجھے یاس اہلِ دل — آبروے لکھنؤ، خاکِ عظیم آباد ہوں

بعد کو میں نے شوخی سے داماد کے قافیے میں اس پر ایک شعر کا اضافہ کر دیا:

لکھنؤ کے فیض سے، ہیں دو دو سہرے سر — اک تو استادِ یگانہ، دوسرے داماد ہوں

یہ قطعہ میں نے علی الاعلان عظیم آباد کے ایک مشاعرے میں پڑھا، اور لکھنؤ واپس آکر روزنامۂ ہمدم، میں شائع کرا دیا۔ اب تو ان خود رو استادوں کے تلووں سے لگ گئی، یہ کون ہوتا ہے، اپنے آپ کو آبروے لکھنؤ کہنے والا! تخلص یاس سے یگانہ کرنے کی ابتدا بھی اسی

سے ہوئی۔ یہ ۱۹۲۰ کی بات ہے۔

اب ان اصحاب نے جتھا بنالیا۔ ہر طرف سے میرے خلاف پروپگنڈا ہونے لگا جہاں کہیں سے مشاعرے کا دعوت نامہ آتا، یہ لوگ کہتے کہ اگر یاس کو بلایا جائے گا، تو ہم شرکت نہیں کریں گے۔ ایک مرتبہ پنڈت مدن موہن ناتھ رینہ نے الہ آباد سے ہم سب لوگوں کو مشاعرے کا دعوت نامہ بھیجا۔ صفی نے کہا کہ اگر یگانہ اس مشاعرے میں ہوں گے تو ہم نہیں جائیں گے۔ یہ خبر مجھ تک بھی پہنچ گئی۔ میں نے کہلا بھیجا کہ آپ پریشان نہ ہوں، میں نہیں جاؤں گا۔ اور رینہ صاحب کو لکھ دیا کہ آپ میرے دوست ہیں، مجھے آپ کا مشاعرہ خراب کرنا منظور نہیں ہے۔ اس لیے میں نہیں آؤں گا، آپ شوق سے ان حضرات سے مشاعرہ کیجیے۔ یہ اوچھی حرکتیں ان لوگوں نے اور بھی کئی جگہ کیں۔ لیکن کبھی کبھی انھیں منہ کی بھی کھانا پڑتی تھی۔ داعی حضرات ان کی دھمکی کی پروا نہ کرتے اور کہہ دیتے کہ یاس تو ضرور آئے گا، آپ چاہیں آئیے چاہے، نہ آئیے۔"

۱۹۱۴ء میں میرا پہلا مجموعۂ کلام "نشترِ یاس" شائع ہوا۔ دنیا انصاف پسندوں سے خالی نہیں ہوگئی۔ اسی لکھنؤ کے بعض اصحاب نے اس پر تقریظیں لکھیں۔ یہ لوگ وہ تھے جنھیں معیار پارٹی بھی استاد تسلیم کرتی تھی۔ سید حامد علی خاں بیرسٹر نے ایک بسوط دیباچہ لکھا۔ حضرت علی محمد عارف، سید محمد کاظم جاوید، قبلہ محمد جعفر اوج خلف دبیر اعلیٰ اللہ مقامہ اور حضرت پیارے صاحب رشید نے تقریظیں لکھی تھیں۔ یہ نشترِ یاس کے ساتھ چھپی ہوئی موجود ہیں۔ اب اور کچھ تو ہو نہ سکا، یہ حضرات ان بزرگوں کے خلاف ہو گئے کہ انھوں نے ایک "بیرونی" کی تعریف کر کے لکھنؤ والوں کی ناک کاٹ دی ہے۔

میں اس زمانے میں محلہ باغ قاضی میں رہتا تھا۔ یہیں میرے پڑوس میں سید بہادر حسین انجم بھی رہتے تھے، خاصے شعر کہہ لیتے تھے۔ میرے ان سے اچھے مراسم تھے۔ ان کی نوشتہ چند سطریں بھی نشترِ یاس کے شروع میں ہیں۔ جب معیار پارٹی نے اساتذہ کی مخالفت شروع کی، تو انجم سے نہ رہا گیا۔ انھوں نے ایک رباعی کہی، جس میں ان اساتذہ کی تائید کی تھی۔ رباعی تھی:

اس عہد میں ہیں پانچ شاہانِ سخن — حقّا کہ انھیں کے دم سے ہے شانِ سخن
جاوید و عروج و عارف و اوج ورشید — یہ پنجتن پاک ہیں ایمانِ سخن

اس زمانے میں لکھنؤ سے ایک ہفتے وار "سیّارہ" نکلتا تھا۔ انجم نے یہ رباعی اس میں چھپوادی۔ بس پھر کیا تھا، ایک ہنگامہ بپا ہوگیا، خاص طور پر لفظ "پنجتن" پر بہت لے دے کی گئی۔ چوں کہ یہ لفظ ایک خاص تعلق سے ہمارے عقائد سے وابستہ ہوگیا ہے، اس لیے اس کی آڑ میں غریب انجم پر بہت پھبتیاں کسی گئیں۔ دنیا کی بھیڑ چال تو آپ جانتے ہی ہیں، عوام کا کیا قصور! معیار پارٹی کا اس زمانے میں پڑھے لکھے حلقوں میں بہت چرچا تھا، اور یہ پارٹی چاہتی ہی یہ تھی کہ کسی طرح سے عوام کو بھڑکا کر مجھے دق کیا جائے۔ چناں چہ ان حضرات نے اس لفظ پر گرفت کی، تو جہلا نے یقین کر لیا کہ یقیناً انجم نے کوئی بیدینی کی بات کی ہے۔

اس پر میں نے پوچھا کہ آخر عوام کو پتا کیسے چلا؟ کیا کوئی مضمون شائع کیا گیا تھا؟ فرمایا! نہیں صاحب! صفی کے چھوٹے بھائی ظریف کا نام تو آپ نے سُنا ہوگا وہی مقبول حسین اس مسخرے نے "سبع سیّارہ" کے عنوان سے سات رباعیاں لکھیں: سنیے:

(۱)

زیبا ہے، کہو کر انھیں شاہانِ سخن — یا فارس و یکہ تازِ میدانِ سخن
گر پنجتنِ پاک سے دو گے تشبیہ — انجم! تمھیں سب کہیں گے شیطانِ سخن

(۲)

جب مدح سرائی کی لیاقت نہ رہی — پھر یہ ہیں عبث نظم کی تکلیف سہی
زیبا نہیں اس طرح کی پھبتی، انجم! — پنجتنِ پاک کی بھی ایک کہی

(۳)

تعریف کے دائرے میں یوں سے بڑھے — کیا خوب! اپنے پنجتنِ پاک گڑھے
سیّارے میں دیکھ کر رباعی ایسی — انجم پہ نہ کیوں ہر ایک لاحول پڑھے

(۴)

گو مومنو! شاعرہ ہے بڑھا انجم — معلوم نہیں بکتی ہے کیا کیا انجم
جاوید و عروج و عارف و اوج ورشید — ان پنجتنِ پاک کی فضا انجم

(۵)

مدّاح ہیں پنجتن کے یہ مطلق پانچوں
شیعہ ہیں علی کے سب یہ برحق پانچوں
خود پنجتنِ پاک بنیں اور خوش ہوں
انجم کی طرح نہیں ہیں احمق پانچوں

(۶)

مذہب ہے تمھارا کیا؟ بتاؤ، انجم!
کچھ اپنے عقائد تو سناؤ، انجم!
تصنیف کیے پنجتنِ پاک، تو خوب
اب بارہ امام بھی بناؤ، انجم!

(۷)

ہوا ایسا خوشامدی تو کیا چارہ ہے
انجم میں ہوا بھری ہے، غبّارہ ہے
آتی ہے یہ نقّارۂ گردوں سے صدا
"تو مرثیہ گو نہیں، بھٹیارا ہے"

ظریف اس سے پہلے شفق لکھنوی کے مشاعرے میں خود یگانہ کی موجودگی میں ان کی ہجو پڑھ چکے تھے۔ حاضرین میں لکھنؤ کے جملہ اساتذہ موجود تھے، کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ اسے ٹوکے! سب کے سب چپ سادھے سنتے رہے۔ خود یگانہ نے بھی ان مغلظات کا نوٹس نہیں لیا فرماتے تھے: میرا کیا بگڑا! اس احمق نے خود ہی اپنے آپ کو ذلیل ثابت کیا۔ ہاں ذلیل وہی تو ہے، جو ذلیل کام کرتا ہے! انسان کسی کے کہنے سے ذلیل نہیں ہو جاتا۔

۳

ایک دن اصغر گونڈوی مرحوم کا ذکر آگیا۔ لیکن پہلے ایک واقعہ سنیے:

اصغر مرحوم کا پہلا دیوان "نشاطِ روح" غالباً ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا غلغلہ سُنا، تو میں نے بھی اسے دیکھا۔ میری عمر اس وقت یہی ۱۶۔۱۷ سال کی تھی۔ اب جو شعر سمجھ میں آگئے، وہ تو بہت پسند آئے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کئی شعر سمجھ میں نہیں آئے اور مجھے کھینچ تان کر ان کے معنی سمجھنا پڑے۔ میری نظر میں یہ کلام کا نقص تھا اور ہے کہ شعر خود بخود سمجھ میں نہ آئے۔ غرض اس سے طبیعت کچھ منغض ضرور ہوئی۔ لیکن مجموعے کے شروع میں دو صاحبِ علم حضرات کے لمبے لمبے مقدمے شامل تھے، اور انھوں نے کلام اور صاحبِ کلام کی بہت تعریف کی تھی۔ لہذا میں نے یہی خیال کیا کہ اگر کچھ شعر میری سمجھ میں نہیں آئے، تو یہ میری کم علمی

یا کوتاہ فہمی کے باعث ہے۔ لیکن یہ بات تو اپنی جگہ رہی، ان دونوں مقدموں کے پڑھنے سے مجھ پر خود اصغر کے ذاتی کردار کی بلندی کا بہت گہرا اثر قائم ہوا۔

اس کے کچھ دن بعد "نیرنگِ خیال" (لاہور) میں "نشاطِ روح" سے متعلق ایک مضمون شائع ہوا۔ مضمون پر کسی کا نام نہیں تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں، غالباً یہ "ادب آموز" یا کسی اسی طرح کے نام سے چھپا تھا۔ بہرحال مضمون مخالفانہ تھا۔ اس حد تک تو اعتراض کی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی چیز مجھے پسند آئے، تو وہ آپ کی نظر میں بھی اچھی ٹھہرے۔ اختلافِ رائے بشرطے کہ وہ نیک نیتی پر مبنی ہو، بسا اوقات اصلاح کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے اور اس لحاظ سے مستحسن ہے۔ لیکن اس مضمون کا لہجہ ٹھیک نہیں تھا۔ خاص طور پر اس میں جو عامیانہ محاورے استعمال کیے گئے تھے، ان سے مجھے بہت کوفت ہوئی۔ چناں چہ جب میں لاہور آیا (جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا ہے)، تو میں "نیرنگِ خیال" کے دفتر گیا۔ ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن صاحب تو موجود نہیں تھے۔ البتہ جناب محمد دین تاثیر سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس زمانے میں رسالے کے ادارۂ تحریر میں شامل تھے؛ بلکہ بعد کو کسی نے مجھے بتایا کہ کام سارا تاثیر ہی کرتے ہیں، حکیم صاحب تو صرف انتظامی معاملات اور اخراجات کے لیے روپیہ مہیا کرنے کے ذمے دار ہیں کیوں کہ پرچے کے مالک وہی ہیں۔ غرض میں نے تاثیر سے شکایت کی کہ اس مضمون کی زبان بہت عامیانہ اور قابلِ اعتراض ہے؛ آپ کو اسے شائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ حقیقت میں مجھے زیادہ اندیشہ اس بات کا تھا کہ اصغر یو۔پی کے رہنے والے ہیں، اور مضمون پنجاب کے پرچے میں چھپا ہے؛ لوگ اسے صوبائی تعصب پر محمول کریں گے۔ تاثیر نے میرے اعتراض پر کہا کہ مضمون تنقیدی ہے۔ اگر کوئی شخص اس کا جواب لکھنا چاہے تو ہم اسے "نیرنگِ خیال" میں شائع کرنے کو تیار ہیں وغیرہ۔ انھوں نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی بتایا کہ مضمون نگار بھی یو۔پی کے ایک صاحب ہیں، جنھوں نے مصلحتاً اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ میں نے پھر بھی یہی کہا کہ کسے باشد، یہ مضمون آپ کو نہیں چھاپنا چاہیے تھا۔

اب جو یگانہ سے اصغر کا ذکر آیا تو بولے: صاحب! اصغر صوفی ہوں گے، ولی اللہ ہوں گے، صاحبِ الہام ہوں گے، مجھے ان کی بزرگی تسلیم کر لینے میں قطعاً کوئی عذر نہیں ہے۔ وہ اور سب کچھ

ہوں گے، لیکن شاعر یقیناً نہیں۔ ذرا ان کا کلام دیکھیے۔ کیا یہ شعر ہیں! کسی تصوف یا اخلاق کی کتاب کا شعر میں ترجمہ کر دینے سے کوئی آدمی شاعر نہیں ہو جاتا۔ یوں ہوتا، تو مولانا روم فارسی زبان کے سب سے بڑے شاعر نا گنے جاتے! پھر فرمایا:

"بات یہ ہے کہ سیاست کی طرح بعض لوگوں نے ادب میں بھی اپنے اپنے جتھے اور گروہ بنا رکھے ہیں۔ جب کوئی اپنے فریق کا آدمی کتاب چھاپتا ہے تو پہلے تو اس پہ لمبے لمبے مقدمے لکھیں گے، پھر اس پر تعریفی تبصرے اور تنقیدیں چھپوائیں گے۔ اس سے جہلا کو تو مرعوب ہونا ہی چاہیے، خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ ہر فرعونے را موسیٰ۔ وقت آنے پر کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ کھڑا ہو جاتا ہے اور سارا طلسم چاک کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس وقت یہ مقدمے اور تقریظیں اور تبصرے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ بتائیے! چند روزہ واہ واہ سے حاصل؟"

اس پر مجھے وہ "نیرنگ خیال" والا مضمون یاد آ گیا۔ میں نے کہا کہ ایک مخالفانہ مضمون "نیرنگ خیال" میں چھپا تھا، تو کہنے لگے: "وہ میں نے لکھا تھا" اس پر مجھے کچھ تعجب ہوا۔ حال آنکہ تاثیر نے کہا تھا کہ مضمون ایک یوپی کے ادیب کا لکھا ہوا ہے، لیکن میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی، اور یقیناً اس کا تو مجھے گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے یگانہ نے لکھا ہو گا۔

جب انھوں نے خود اعتراف کیا، تو میں نے اعتراض کیا کہ صاحب! اس میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ کسی سنجیدہ تنقید کے شایانِ شان نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تنقید سے زیادہ اس کا مقصد مقدمہ نگاروں اور خود شاعر کا مضحکہ اڑانا تھا۔ کہنے لگے:

"آپ کا خیال بالکل درست ہے، جزاک اللہ، آپ نے واقعی میرے مقصد کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ چوں کہ میں اصغر کو شاعر مانتا ہی نہیں، نہ ان کی فکر شاعرانہ ہے، نہ زبان شاعرانہ، اس لیے میں انھیں شعر و سخن کی کسوٹی پر کسنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مضمون میں میرا لہجہ شروع سے آخر تک غیر سنجیدہ رہا۔"

میں اسرارِ حیات اور تصوف و روحانیت کے مضامین کو نظم میں لکھنے کا مخالف نہیں ہوں۔ خود میرے یہاں ان کی کمی نہیں ہے مجھے اصرار اس پر ہے کہ نظم کی زبان، اردو کے محاورے اور اردو غزل کی روایت اور اسلوب کے مطابق ہونا چاہیے۔ آخر معرفت کا وہ کونسا نکتہ ہے،

جو غزل کی مجازی زبان میں ادا نہیں ہو سکتا! میرا کلام دیکھیے، کیسے کیسے اَدق مضامین، کتنی شگفتہ زبان ہیں، فصاحت اور بلاغت کی تمام رعایتوں کے ساتھ ادا ہوئے ہیں۔ جہاں آپ نے مضامینِ حقیقت کو تصوف کی زبان میں لکھا، غزل غائب ہو گئی۔ یہ قدرتِ بیان نہیں، عجز کی دلیل ہے۔ غرض میں اصغر کی شاعری کا اس باعث قائل نہیں ہوں کہ ان غریب کو غزل کی زبان پر قدرت حاصل نہیں ہے۔ یوں مجھے ان کے اچھا اور شریف آدمی ہونے میں کلام نہیں۔ اردو مرکز میں مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے انھیں ہمیشہ ہمدرد، بااخلاق اور منکسر مزاج پایا ہے۔ لیکن اس وقت گفتگو ان کی شاعری کے بارے میں ہو رہی ہے۔

۴

۱۹۲۶ء کے آخر کی بات ہوگی، یہی نومبر یا دسمبر کا مہینا۔ یگانہ ابھی تک لاہور میں تھے اردو مرکز سے ان کا تعلق ختم ہو چکا تھا۔ بیشتر اصحاب جنھیں تاجور نے اس کام کے لیے نہ جانے کہاں کہاں سے جمع کر لیا تھا، ایک ایک کر کے واپس جا رہے تھے۔ میرزا ایک دن آئے اور بتایا کہ بیوی بچوں کو لکھنؤ بھیج رہا ہوں، میں نے چنگڑ محلّے کی سکونت ترک کر دی ہے اور بھاٹی دروازے کے باہر میلارام کے منڈوے کے مقابل، کونے والے مکان میں منتقل ہو رہا ہوں۔ اس مکان کی شکل کچھ عجیب بے ڈھنگی سی تھی۔ ممکن ہے، اسی باعث اس کا کرایہ بھی کچھ سستا ہو اور اسی کفایت کے سبب انھوں نے اُسے لے لیا ہو۔ میرزا یگانہ کو ٹھٹھول کی سوجھی، انھوں نے اس کا نام ٹیڑھا بنگلہ رکھ دیا، اور اپنے خطوط میں بھی یہی نام استعمال کرنے لگے۔ پتا لکھتے: میرزا یاس یگانہ لکھنوی، ٹیڑھا بنگلہ، بیرونی بھاٹی دروازہ، لاہور۔ اس علاقے کا جو ڈاکیا تھا، اس سے کہہ دیا کہ میاں، ذرا خیال رکھنا، اس عنوان سے کوئی خط آئے، تو وہ ہمارا ہے۔ دو چار خط جو اس پتے سے آئے، تو اس کے بعد یہ گویا "رجسٹرڈ" ہو گیا۔

اب بظاہر ان کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا اور انھیں لاہور میں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن رکنا پڑا۔ اس اثنا میں انھوں نے لاہور کے مشہور تاجر کتب، شیخ مبارک علی صاحب سے اپنا دوسرا دیوان (آیاتِ وجدانی) چھاپنے کا معاملہ کر لیا۔ طے پایا کہ وہ ایک اڈیشن کے پانچ سو ادا کریں گے؛ سو روپیہ پیشگی ادا کیا، بقیہ کتاب کے چھپ جانے کے چھ مہینے کے بعد

دینے کا وعدہ کیا۔ غرض دیوان شائع ہوگیا۔ اس کے بعد تشریف لائے، تو میرے لیے ایک جلد ساتھ لیتے آئے۔ اس دن نا بے حد خفا تھے۔ ہوا یہ کہ انھوں نے کتاب کا انتساب جرمن قوم کے نام کیا تھا کہ "آج ان سے بڑا مشرقی علوم وفنون کا قدردان اور ایسے دقیق اور فلسفیانہ مضامین کا سمجھنے والا کوئی نہیں۔ لیکن ناشر کی بددیانتی اور بدتمیزی دیکھیے کہ اس نے کتاب سے انتساب کی عبارت ہی حذف کر دی ہے۔ جب میں نے اصرار کیا، اور اپنے ہاتھ سے کتابت کے کاغذ پر انگریزی میں جرمن قوم کے نام انتساب لکھ کر اسے اُن کے حوالے کیا کہ اسے چھپوا کر کتاب میں چسپاں کر دیا جائے، تو شیخ صاحب نے ایک اور ستم ظریفی کی ہے کہ جہاں دیوان ختم ہوا تھا، اس کے بعد اپنی مطبوعات کا اشتہار لکھوایا اور بالکل آخری صفحے پر انتساب کی عبارت رکھ دی۔" ظاہر ہے کہ یہ کتاب کے شروع میں ہونا چاہیے تھی۔ میرزا صاحب اسی لیے بہت ناراض تھے۔

یہاں تک مجھے معلوم ہے، ناشر نے اس کے بعد انھیں صرف ایک سو روپیہ اور ادا کیا تھا، بقیہ تین سو حساب دوستاں کی مد میں چلا گیا۔

"آیات وجدانی" کے اس ایڈیشن کے شروع میں میرزا مراد بیگ شیرازی کے نام سے خاصا طویل دیباچہ تھا، جس میں یگانہ کے حالات کے بعد ان کے شعری نظریے اور کلام پر کچھ رائے زنی کی گئی تھی۔ پھر دیوان میں غزلوں اور شعروں کے درمیان بھی جا بجا نثر میں داد کلام دی گئی تھی۔ جیسا کہ میں نے کہا، سرورق پر چھپا تھا کہ یہ محاضرات، میرزا مراد بیگ شیرازی نے لکھے ہیں۔ جس لب ولہجہ اور غیر متوازن اسلوب میں پیار کی عبارت قلمبند ہوئی تھی، اس کے پڑھنے سے میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ کاشکے، یہ نثر دیوان میں نہ چھپی ہوتی۔ اب میں ان کی خدمت میں کافی بے تکلف بلکہ کسی حد تک گستاخ ہو چکا تھا۔ ایک دن میں نے ان "محاضرات" کا ذکر چھیڑا۔ راہ صاف کرنے کو میں نے پوچھا کہ یہ میرزا مراد بیگ شیرازی کون صاحب ہیں جنھوں نے یہ محاضرات لکھے ہیں؟ کہنے لگے: ایک ہمارے عزیز دوست ہیں۔ لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، یہ سب کے سب انھیں کے خیالات نہیں، بلکہ انھوں نے کئی دوسرے احباب سے مشورہ کرنے کے بعد انھیں اپنے الفاظ میں قلم بند کر دیا ہے۔ اب میں نے براہِ راست حملہ کیا، اور کہا: حضرت! یہ جا بجا "اللہ اللہ"، "اللہ اکبر!" "سبحان اللہ" وغیرہ کا استعمال جس فیاضی سے کیا گیا ہے، وہ

مذاقِ سلیم پر بہت گراں گزرتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس میں تو دآپ کے بارے میں تعریفی کلمات اور جملے جس تواتر سے اور جس زبان میں لکھے گئے ہیں، وہ بہت بھدّے معلوم ہوتے ہیں۔

فرمایا: ظاہر ہے کہ ہر ایک شخص اپنے خیالات اور ان کے اظہار میں آزاد ہے۔ لیکن اصلی بات یہ ہے کہ اردو والوں نے جس بھونڈے طریقے سے میری مخالفت کی ہے اور پچھلے بیس برس میں جو کچھ میرے خلاف کہا اور لکھا گیا، اس میں کون سا مذاقِ سلیم کا مظاہرہ ہوا ہے! اب اگر کسی نے ردِ عمل کے طور پر میری تعریف میں مبالغہ کر دیا، تو کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑا! اسے بھی معاف کر دینا چاہیے۔ اور ظاہر ہے کہ میں تو اس کے لیے ذمہ دار ہوں ہی نہیں۔ بہر حال، آئندہ ایڈیشن میں اسے حذف کرا دوں گا۔ غالباً ۱۹۲۷ء کے وسط میں وہ لاہور سے روانہ ہوئے۔ اٹاوہ، علی گڑھ، آگرہ اور دوسرے مقامات پر قیام کرتے ہوئے حیدر آباد پہنچ گئے۔ وہاں مہاراجا سر کشن پرشاد شادؔ، اپنے جدِ اعلیٰ مہاراجا چندو لال شاداںؔ کے حقیقی معنوں میں جانشین موجود تھے۔ ملک کے گوشے گوشے سے، شاعر، ادیب اور فنکار کھنچ کھنچ کر ان کے دربار میں پہنچ رہے تھے اور مہاراجا بہادر ان کی پذیرائی فرماتے تھے۔ یگانہ کو بھی توقع تھی کہ اس سرکار میں ان کی بھی مناسب آؤ بھگت ہوگی۔ لیکن ان کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ ہو بھی نہیں سکتی تھیں۔ میرزا یگانہ بھلا کیا جانیں دربار داری کے آداب اور طور طریقے! اور جانتے بھی، تو ان کے لیے ان پر عمل کرنا محال تھا۔ دربار داری اور مصاحبت کے بنیادی اصول ہیں، خوشامد، تملّق، ہر جائز ناجائز پر آمنا و صدقنا کہنا، صبح شام ہر وقت طبیعت کو حاضر رکھنا کہ فرمایش بلکہ اشارے پر بھی فوراً کچھ عرض کر دیا جائے۔ میرزا ان میں سے کسی بات کے اہل نہیں تھے۔ ایسے میں ان کی یہاں کیسے نبھ سکتی تھی۔ بارے، مہاراجا بہادر نے بشیر یار جنگ (انسپکٹر جنرل رجسٹریشن و اسٹامپ) کو اشارہ کیا اور یگانہ کو ان کے محکمے میں ملازمت مل گئی؛ اور وہ اضلاع میں سب رجسٹرار مقرر ہو گئے۔ اولاً عثمان آباد میں تقرر ہوا؛ بعد کو لاتور تبادلہ ہو گیا۔ وہ آخر تک لاتور ہی میں رہے، اور یہیں سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ مشاہرہ اگرچہ زیادہ نہیں تھا، غالباً ساٹھ روپے حالی۔ لیکن یہی کیا کم تھا کہ جان و تن کا رشتہ بر قرار رکھنے کو ایک باعزت اور کم و بیش مستقل انتظام ہو گیا تھا۔

افسوس کہ نواب بشیر یار جنگ کا عین عالمِ شباب میں، اس کے تین چار سال بعد انتقال ہوگیا۔ چوں کہ وہ یگانہ کے محسن تھے، انھوں نے اس موقع پر دو رباعیاں کہیں:

بیرنگ ہے آج دل کا رنگ، آہ یہ کیا
پھر ہونے لگی درد سے جنگ، آہ یہ کیا
دُکھ درد کے ماروں کو کہاں چھوڑ چلے؟
نواب بشیر یار جنگ، آہ، یہ کیا؟

کیا ہنستے ہیں بے کسوں پہ، ہنسنے والے
آنسو کہیں تھمتے ہیں برسنے والے
کس دل سے بشیر جنگ کو مُردہ کہوں
مرتے ہیں کہیں دلوں میں بسنے والے

۵

میں جب تک لاہور میں رہا، بہت حد تک اُن سے خط و کتابت باقاعدگی سے جاری رہی۔ وہ اس دوران میں دو (یا شاید تین مرتبہ) لاہور آئے بھی؛ اور ان کے قیام لاہور کے دنوں میں ان سے ملاقات رہی۔ ۱۹۳۹ء میں مجھے بسلسلۂ ملازمت ہندستان سے باہر جانا پڑا۔ میری سہل انگاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو تین سال کے بعد ان سے رسل و رسائل کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ تاہم ان کی یاد رہ رہ کے ہمیشہ آتی رہی۔

میں جب تک طالب علم تھا، بلکہ اس کے بعد بھی بہت دن تک، میرا ہاتھ کبھی اتنا نہیں کھلا کہ کسی کی کچھ مدد کر سکتا۔ افلاس میں کئی قباحتیں ہیں۔ جسمانی اور ذہنی تکلیف تو ہونا ہی چاہیے کہ پریشان حالی کا اور کیا نتیجہ ہوگا! لیکن اس سے ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کتنی نیکیوں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ جو غریب اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے قابل نہیں، وہ کسی اور کی کیا مدد کرے گا۔ اور کسی کارِ خیر میں کیا حصّہ لے گا! یہ سارا زمانہ کم و بیش یہی میری حالت رہی۔ رہ رہ کے خیال آتا کہ میرزا کی کچھ خدمت کرنا چاہیے۔ لیکن حالات کی مجبوری سے دل مسوس کے رہ جاتا۔

جب سرکاری ملازمت میں شامل ہوا اور اتنی آمدنی ہوگئی کہ گھر کا اُجلا خرچ چلنے کے بعد کچھ پس انداز بھی ہونے لگا، تو پھر یگانہ کی یاد آئی۔ یہ تو میرے علم میں تھا کہ وہ حیدرآباد میں ہیں؛ لیکن اس کا یقین نہیں تھا کہ ہنوز لاتور ہی میں ہیں۔ اتنا البتہ جانتا تھا کہ کہیں بھی ہوں ان

کی تنخواہ اتنی نہیں ہو سکتی کہ فارغ البالی سے اپنی اور اپنے گھر بار کی دیکھ بھال کر سکیں۔ ان کی خود داری، دیانت اور راستبازی اور فرض شناسی بھی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ وہ اپنی مقررہ تنخواہ کے علاوہ کسی بالائی آمدنی کے روادار ہوتے۔ کنبہ بہت بڑا تھا اس وقت ان کے سات بچے تھے (چار بیٹے، تین بیٹیاں) دو خود میاں بیوی۔ سماں لاکھ سستا سہی، نو آدمیوں کو کھانا کپڑا تو چاہیے ہی۔ آمدنی صرف ساٹھ روپے ماہانہ۔ وہ تو بیوی بڑی سلیقہ شعار اور وفادار ملی تھی، ورنہ ناک میں دم کر دیتی۔

القصہ، میں نے دوار کا داس شعلہ کو لاہور خط لکھا اور ان کا پتا پوچھا۔ شعلہ سے ان کے تعلقات بہت عزیزانہ تھے اور مجھے یقین تھا کہ ان سے خط و کتابت ضرور ہوگی۔ تھوڑے دن بعد ان کا جواب ملا۔ اور معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک لاتور ہی میں ہیں۔ اس پر میں نے براہِ راست ان کی خدمت میں لکھا۔ فوراً جواب آیا۔ حالاں کہ تقریباً دو سال سے میں نے کوئی خط نہیں لکھا تھا، انھوں نے اس پر نہ خفگی کا اظہار کیا، نہ کبیدگی کا؛ بلکہ تجدیدِ مراسلت پر اظہارِ مسرت کیا۔ بارے، وہی پرانے اخلاص و مودت کے تعلقات از سرِ نو قائم ہو گئے۔

اس کے تھوڑے دن بعد عید الفطر تھی۔ میں نے اس تقریب کو غنیمت خیال کیا، اور ڈرتے ڈرتے ایک معمولی سی رقم منی آرڈر سے ان کی خدمت میں بھیجی اور لکھا کہ کاش میں وہاں ہوتا، اور عید کی خوشی میں بچوں کو مٹھائی کھلاتا۔ اب آپ میری نمایندگی کیجیے اور انھیں عید کی مٹھائی لا دیجیے۔ انھوں نے اس پر کسی ناراضی کا اظہار تو نہیں کیا، بلکہ رسمی طور پر شکریہ ادا کیا؛ لیکن بین السطور سے یہ بھی عیاں تھا کہ انھوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ چوں کہ میں نے وہ رقم بچوں کے لیے بھیجی تھی، وہ انکار نہ کر سکے؛ اور یہی میرا مقصد تھا۔ بہر حال میں نے محسوس کیا کہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ میں ان کی افتادِ طبع سے خوب واقف تھا، اور نہیں چاہتا تھا کہ وہ بدک جائیں۔ میری مخلصانہ خواہش یہ تھی کہ حتی الوسع ان کا بوجھ کچھ ہلکا کیا جائے؛ ان پر احسان رکھنا یا اپنی داد و دہش کی نمایش میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھی۔ اسی لیے مجھے اطمینان تھا کہ میری کوشش رایگاں نہیں جائے گی۔

قصہ کوتاہ، میں کبھی کبھار اسی بہانے خدمت کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ ان کا ذہنی تناؤ کم ہو گیا؛

اور ہم اپنایت کے اس مقام پر پہنچ گئے، جہاں ایک دوسرے سے کچھ طلب کرنے میں تامل یا تکلف نہیں رہتا۔

مجھے معلوم ہے کہ ان کے ایسے ہی تعلقات دوار کا داس شعلہ سے بھی تھے۔ یہ بھی ان کی خدمت میں دلی مسرت محسوس کرتے تھے۔ نیز میرا گمان بحدِ یقین ہے کہ بمبئی کے ہاشم اسمعیل مرحوم بھی گاہے گاہے مدد کرتے ہوں گے۔

۶

میں جولائی ۱۹۳۹ء کا گیا ہوا، کہیں دسمبر ۱۹۴۶ء میں وطن واپس آیا تھا۔ میں یہ پورا زمانہ اسکندریہ (مصر) میں مقیم رہا تھا، جو دوسری عالمی جنگ کے دوران میں ہٹلر اور مسولینی کی افواج کی یلغار کا ہدفِ اوّلین رہا تھا۔ خیر یہ دوسرا موضوع ہے اور اس کا یگانہ سے کوئی تعلق بھی نہیں، اس کے بیان سے احتراز کرتا ہوں۔ میں اگرچہ یہاں تین چار مہینے رہا، لیکن اس دوران میں یگانہ سے ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ اس زمانے میں ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات اور کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ پنجاب میں صورت حال خاص طور پر بہت مخدوش تھی۔ میں لمبی غیر حاضری کے بعد ہندستان آیا تھا، اس لیے مجھے رشتہ داروں سے ملنے کی خاطر کئی جگہ جانا پڑا۔ اسی میں رخصت کا بیشتر زمانہ نکل گیا اور میں وسطِ اپریل ۱۹۴۷ء میں پھر باہر چلا گیا۔ جون میں اعلان ہو گیا کہ ملک تقسیم کر دیا جائے گا اور اس کی آزادی کے لیے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ اس کے بعد یہاں جو ناگفتہ بہ حالات پیش آئے، وہ ہم میں سے اکثر کے چشم دیدہ ہیں، اُن کے دُہرانے سے حاصل!

"آیاتِ وجدانی طبعِ اوّل (شیخ مبارک علی، لاہور) کا جو نسخہ یگانہ نے اپنے دستخط کر کے لاہور میں دیا تھا، وہ تقسیمِ ملک کی نذر ہو گیا۔ میں باہر جانے سے پہلے اپنا سارا ذخیرۂ کتب جس میں کم و بیش چار ہزار جلدیں ہوں گی، لاہور میں اپنے ایک عزیز کے وہاں چھوڑ گیا تھا۔ نہ جانے، تقسیم ملک کے بعد اس پر کیا بیتی! اس کے بعد میں لاہور جا ہی نہیں سکا۔ بعض مواقع پیدا ہوئے۔ پاکستان کے دوست احباب نے بھی بہت اصرار کیا کہ آؤ، مل جاؤ۔ لیکن کیا کہوں! دونوں ملکوں کے سیاسی تعلقات جیسے کچھ غیر یقینی رہے ہیں، وہ کسی سے

مخفی نہیں۔ شاید عمر کے ساتھ اب زیادہ نقل و حرکت کی خواہش میں بھی کچھ کمی آگئی ہو۔ بہر حال میں پاؤں توڑ کے بیٹھا رہا اور وہاں نہیں جا سکا، ورنہ شاید کوئی سراغ نکل سکتا کہ ان کتابوں کا کیا حشر ہوا۔ غرض میرے پاس "آیاتِ وجدانی" کا کوئی نسخہ نہیں تھا۔ میں نے یگانہ کو لکھا کہ اگر کہیں سے ایک جلد مل سکے، تو بھجوا دیجیے۔ خدا معلوم، ان کے جی میں کیا آئی! انھوں نے پورا "کلیات" جس میں آیاتِ وجدانی اور ترانہ (رباعیات) کے بعد کا کلام بھی تھا، اپنے ہاتھ سے نقل کر کے بھیج دیا۔ اس کے ملنے پر جو مسرت ہوئی، آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ بے بہا نسخہ آج بھی میرے پاس ہے اور میرے کتاب خانے کی زینت۔

۷

اس کے بعد جنوری ۱۹۵۲ء میں چھٹی پر وطن آیا، اور لکھنؤ گیا۔ میرزا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کے بڑے صاحبزادے آغا جان آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ملک کے وقت آغا جان نے اپنی ملازمت کے لیے پاکستان کا انتخاب کیا۔ اس پر سارے خاندان نے ان کے ساتھ پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے میرزا صاحب سے بھی ساتھ چلنے کی درخواست کی اور کہا کہ آپ اکیلے یہاں کس کے ساتھ رہیں گے! لیکن یہ ٹس سے مس نہ ہوئے اور جانے سے انکار کر دیا۔

اس زمانے میں وہ برعکس نہند نام زنگی کافور سلطان گنج کے ایک حصے میں تن تنہا رہتے تھے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں ان کے مسکن پر پہنچا۔ ان کی زدہ حالت دیکھ کر واقعی بہت دکھ ہوا۔ آمدنی مقصود، بڑھاپا، تنہائی۔ یہ سب باتیں بجائے خود کیا کم تھیں کہ ان پر بیماری کا اضافہ ہو گیا۔ ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی لیکن کیا ہو سکتا تھا! میں دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔

وہ مذہب کے معاملے میں کچھ آزاد خیال تھے۔ غالباً میں جس زمانے میں بغداد میں تھا، انھوں نے ایک خط میں تحویلِ قبلہ سے متعلق ایک رباعی لکھی، جس کا لہجہ میرے نزدیک ٹھیک نہیں تھا۔ چوں کہ ہمارے درمیان بے تکلفی کا تعلق تھا، میں نے اس پر انھیں توجہ دلائی، اور مشورہ دیا کہ جہاں ہر شخص کسی مسئلے کے بارے میں اپنی آزادانہ رائے رکھنے کا حق دار

ہے، وہیں اس کے اظہار میں اسے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس سے کسی کی دل آزادی نہ ہو۔
انھوں نے اس پر کوئی حجت نہیں کی" اور ظاہراً مجھ سے اتفاق کیا۔ بہر حال بات اسی پر ختم ہوگئی۔
اب جو ان سے ملاقات ہوئی، تو ہم مختلف مسائل پر گفتگو کرنے لگے۔ وہیں قریب ایک
چوکی پر ان کے کلام کا مجموعہ رکھا تھا (اب یاد نہیں رہا گنجینہ تھا، یا آیاتِ وجدانی کا کوئی ایڈیشن)
میں نے بے خیالی میں کتاب اٹھالی، تو دیکھا کہ اس کی پیشانی پر بسم اللہ کے بعد ۹۲ لکھا ہے۔
میں نے فوراً کہا کہ یہ رسول کے نام کے ساتھ آپ کو اپنا نام لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ مسکرائے
اور کہا کہ بڑے زود رس ہیں آپ" ایک نظر میں نکتہ پا گئے۔ میں اس پر کیا کہتا۔ لیکن مجھے اس
پر افسوس اور تشویش ضرور ہوئی۔ لامحالہ اس سے بات کا رُخ مذہب کی طرف ہوگیا۔
میں نے دیکھا کہ مذہب کے بارے میں ان کی رائے میں بہت شدت آگئی ہے۔ وہ جس
طرح سے اور جس لہجے میں بات کر رہے تھے۔ اس سے میرے دل میں ایسا شبہہ گزرا کہ کم از کم
اس پہلو سے ان کے دماغ کا توازن بگڑ گیا ہے۔ جب مجھے یہ احساس ہوا، تو ظاہر ہے کہ اس
کے بعد میں نہیں چاہتا تھا کہ اس موضوع پر زیادہ بات چیت ہو، کیوں کہ مجھے اندیشہ تھا کہ
کہیں وہ جذبات سے مغلوب ہو کر اناپ شناپ باتیں، نہ کرنے لگیں۔ لہٰذا میں نے بلطائف
الحیل گفتگو کا موضوع بدل دیا اور ہم ان کے کلام پر باتیں کرنے لگے۔ لیکن یہ بھی میری غلطی تھی۔
کیوں کہ اگر وہ مذہب کے بارے میں ایک انتہا پر تھے، تو اپنی شاعری کے بارے میں دوسرے
سرے پر تھے۔ اس پر بھی انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا، ان سے، ان کے پورے پس منظر
کو جانتے ہوئے بھی، مجھے کچھ تعجب ہوا۔ ان کی باتوں سے یوں معلوم ہوتا تھا، گویا شعر ان سے
پہلے کسی نے کہا ہی نہیں، اور آیاتِ وجدانی، اردو شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔ میں دل ہی دل میں
افسوس کر رہا تھا کہ کتنا طباع شاعر، کیسا ذہین اور قابل دماغ، کتنا وسیع المطالعہ اور فاضل
شخص زمانے کی بےمہری اور عزیز ملت کے ہاتھوں تباہ ہوا ہے کہ آج وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا
ہے۔ میں اس کے لیے لکھنؤ اور اہلِ لکھنؤ اور خاص کر ان کے معاصر شعرائے لکھنؤ کو ذمہ دار
گردانتا ہوں، جنھوں نے سالہا سال تک ان کا بائیکاٹ کر کے اور انھیں ذہنی اور جسمانی
کوفتوں میں مبتلا رکھ کر انھیں اس حالت کو پہنچا دیا تھا۔

میں جب ان سے رخصت ہوا ہوں، تو واقع یہ ہے کہ میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ اگر یہ اسی انداز پہ سوچتے رہے، تو یقیناً بہت جلد پاگل ہو جائیں گے۔ اور یہی ہوا۔

۸

نیاز فتحپوری مذہب کے بارے میں بہت آزاد خیال تھے۔ بعض لوگوں نے ان کے اسلام پر شبہے کا اظہار کیا ہے۔ یہ بے بنیاد ہے۔ میرے ان کے برسوں کے تعلقات تھے۔ میں پورے اطمینان اور شرحِ صدر سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا اسلام کے بنیادی عقاید پر پورا اطمینان تھا۔ وہ خدا اور رسول پر ایمان رکھتے تھے۔ البتہ یہ درست ہے کہ وہ لفظی الہام کے قائل نہیں تھے، وہ قرآن کو کلامِ الٰہی مانتے ہوئے بھی کئی مقامات پر اس کی تفسیر و تشریح میں قدما کی آرا کے پابند نہیں تھے لیکن ہر زمانے میں اس قسم کے اختلاف رہے ہیں، اور تاویل کرنے کا ہر کسی کو حق ہے۔ بہر حال، نیاز کے ایمان پر کسی تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔

یگانہ کی جو شامت آئے، انھوں نے نیاز کو ایک خط میں چند رباعیاں لکھ بھیجیں جن پر مذہبی مسائل پہ شوخی، بلکہ بیباکی اور گستاخی سے رائے زنی کی تھی۔ انھوں نے شاید نگار کی تحریروں سے قیاس کیا کہ نیاز بھی ان کے ہم خیال ہوں گے اور داد دیں گے۔ یہ ان کی غلط فہمی تھی اور اس کا انھیں بڑا ہی المناک خمیازہ بھگتنا پڑا۔ جب یہ خط نیاز کو ملا تو انھیں شرارت کی سوجھی۔ انھوں نے وہ خط اٹھا کر مولانا عبدالماجد دریا بادی کے پاس بھیج دیا۔ غالباً مولانا دریا بادی کا ہفتہ وار اخبار "صدق جدید" اس زمانے میں نیاز فتحپوری ہی کے مطبعے میں چھپتا تھا۔ مولانا مذہب کے معاملے میں جیسے متشدد اور قدامت پرست ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ انھوں نے یہ رباعیاں دیکھیں، تو بے حد خفا ہوئے۔ رباعیوں کا موضوع اور لب و لہجہ دیکھتے ہوئے خفا ہونے کی بات بھی تھی۔ اس پر انھوں نے صدق جدید (۷ مارچ ۱۹۵۲ء) میں اداریہ لکھا:

ایک شاتمِ رسول مطاعنِ قرآن

"مسلمان"

کل ہی ڈاک سے مجھے ایک لفافہ (منصور نگر، سلطان بہادر روڈ لکھنؤ سے) موصول

ہوا۔ خط تین صفحے کا ہے، جس کی ایک سطر بھی کوئی مسلمان بغیر اپنا خون کھولائے ہوئے اور بے انتہا جوش میں آئے ہوئے نہیں پڑھ سکتا۔ خط ایک نام کے مسلمان کا ہے، جو شاید اصلاً تو بہاری ہے، مگر اب مدت سے لکھنؤ پر مسلط ہے۔ دوسرے مضمون روک کر خط کی چند سطریں، جو نسبتۃً ہلکی ہیں، دل پر شدید جبر کر کے صدق میں دے رہا ہوں تاکہ سب مسلمان، خصوصاً شیعہ حضرات (اس لیے کہ اس بدبخت کا پیدائشی تعلق فرقۂ شیعہ سے ہے) اسے پڑھیں، اور اپنی ذمہ داری محسوس کریں کہ کس طرح اپنے اندر ایک آستین کے سانپ اور خبثِ مجسم کو پرورش کر رہے ہیں۔

(یہاں سے کچھ حصہ حذف کر رہا ہوں، جس میں کچھ نثر ہے
کچھ نظم، لیکن سب کی سب قابلِ اعتراض)

پورے تین صفحے کی گندگی بکھیرنے کے بعد غلاظت کی پوٹ کا خاتمہ اپنی اس شاعری پر کرتا ہے:

سچا نقاد اور سچا شاعر — مردانہ صفت بت شکنی میں ماہر
کس دل سے یگانہ کو بھلا دے کوئی — قرآن پہ بھی چوٹ دھک دیں آخر

اب تو واقفکار ناظرین نے پہچان لیا ہوگا کہ یہ وہی شخص ہے، جو کسی زمانے میں مرزا واجد حسین عظیم آبادی کہلایا، اور مرزا غالب اور عزیز لکھنوی وغیرہ کے خلاف مسلسل اپنے خرافات شائع کرتا رہا۔ پھر اور ترقی کر کے اقبالؒ کے خلاف اس نے زہر اگلنا شروع کیا، اور کوئی بدتمیزی ان کے حق میں اٹھا نہیں رکھی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنا تخلص یگانہ رکھا، اور اپنا نسب نامہ چنگیز جہانسوز سے ملا کر اپنے آپ کو فخر سے چنگیزی لکھنا شروع کر دیا۔ سیاہ بختی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب کئی سال سے برابر شتمِ رسولؐ وطعنِ قرآن مجید کے ہذیان میں مبتلا ہے، اور مسلمانوں کے دل و جگر پر اپنے زہریلے تیر چلا رہا ہے۔
جنون کی حد یہ ہے کہ ابتدا بسم اللہ کے جوڑ پر ان الفاظ سے کی ہے:

بہ نامِ یگانہ جل جلالہٗ

فرعونِ بے ساماں کی مثال اس سے بہتر اور کیا ملے گی:
بہرحال خباثت و شیطنت کا یہ تازہ شاہکار کل مسلمان قوم کے سامنے حاضر ہے

جمیعۃ العلما اور سارے مسلم اخبارات، خواہ وہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں، اپنی ذمّے داری محسوس کریں۔ سوال نفسِ عقاید کا نہیں، وہ کیسے ہی ہوں، بہر حال وہ برداشت کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن شرافت کا یہ یکسر فقدان کوئی کیسے برداشت کرے؟

خاص لکھنؤ میں شیعہ حضرات میرے علم میں ایک دو نہیں، کثرت سے ایسے ہیں جو غیرتِ توحید و احترامِ ناموسِ رسول میں ہر گز کسی سے پیچھے نہیں۔ مولانا سید علی نقی اور دوسرے علما و مجتہدین ہیں، شمس العلما مولوی مہدی حسن ہیں، راجہ احمد علی خاں والی سلیم پور ہیں، ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسین کامونپوری ہیں، شیخ ممتاز حسین جونپوری ہیں، ایڈوکیٹ سید کلب مصطفےٰ ہیں وغیرہم۔ ایسے حضرات اگر آمادہ ہوں، تو ایسے بدزبان کو سبق سکھا سکتے ہیں۔ شیعہ فقہ سے مجھے کچھ زیادہ واقفیت نہیں، لیکن اتنا یقین ہے کہ شتمِ رسول اور طعنِ قرآن پر طرح دے جانے والے ان کے علما بھی ہر گز نہیں۔"

مولانا عبد الماجد دریا بادی نے یگانہ غریب کو مستوجب سزا ثابت کرنے کے لیے اس مضمون میں ان کے خلاف فردِ جرم اچھی خاصی طویل کر دی ہے:

۱۔ وہ بہاری ہے، مگر مدّت سے لکھنؤ پر مسلّط ہے۔

۲۔ وہ مرزا غالب اور عزیز لکھنوی وغیرہ کے خلاف مسلسل اپنے خرافات شائع کرتا رہا ہے۔

۳۔ اور ترقی کر کے اقبالؒ کے خلاف اس نے زہر اگلنا شروع کیا، اور کوئی بدتمیزی ان کے حق میں اٹھا نہ رکھی۔

۴۔ اپنا نسب نامہ چنگیز جہانسوز سے ملا کر اپنے آپ کو فخر سے چنگیزی لکھنا شروع کیا۔

۵۔ اب کئی سال سے شتمِ رسول اور طعنِ قرآنِ مجید کے بذیان میں مبتلا ہے اور مسلمانوں کے دل و جگر پر اپنے زہریلے تیر چلا رہا ہے۔

۶۔ بسم اللہ کے جوڑ پر اس نے "بہ نام یگانہ جل جلالہٗ" کی ترکیب وضع کی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ لکھنؤ والوں نے روزِ اوّل سے جن اسباب کی بنا پر یگانہ کی مخالفت کی تھی، مولانا عبد الماجد نے وہ سب ایک ایک کر کے گنا دیے۔ اس تحریر میں انھوں نے تمام گڑے مُردے اکھیڑ ڈالے ہیں۔ ۱۹۲۰ء اور اس کے لگ بھگ کے سارے ہنگامے اور

معرکے تازہ ہوگئے، حالاں کہ ان میں حصہ لینے والے بیشتر حضرات اللہ کے ہاں پہنچ چکے تھے۔ لیکن ماہر نفسیات مولانا عبدالماجد دریابادی جانتے تھے کہ پرانے زخموں میں کچوکے دے کر انھیں تازہ کر دینے کا عوام پر کیا اثر ہوگا۔

تو خیر، اس فردِ جرم کے بعد وہ اولاً مسلمان قوم اور پھر خصوصیت سے (۱) جمعیۃ العلماء اور (۲) سارے مسلم اخبارات سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذمّہ داری محسوس کریں۔ یہاں تک مخاطب پوری مسلم قوم اور غالباً اہلِ سنت والجماعت حضرات تھے۔

اس کے بعد (۳) خاص لکھنؤ کے شیعہ حضرات سے نام بنام خطاب کیا ہے کہ اگر وہ آمادہ ہوں، تو ایسے بدزبان کو سبق سکھا سکتے ہیں۔ (۴) اور سب سے آخر میں شیعہ حضرات کو توجہ دلائی ہے کہ ان کے فقہ کی رُو سے شاتمِ رسول اور طاعنِ قرآن کی جو سزا ہے، اسے نافذ کریں۔

نیتوں کا جاننے والا علاّم الغیوب خدا ہے۔ کوئی کسی کے دل کو چیر کر نہیں دیکھ سکتا کہ اس میں کیا ہے۔ مولانا دریابادی نے جو کچھ لکھا، خدا ہی جانتا ہے، اس سے ان کا کیا مقصود تھا اور وہ یگانہ کو سزا دلانا چاہتے تھے؛ یگانہ نے اس خط میں (جو مضمون برائے اشاعت نہیں تھا) جو رباعیاں لکھی تھیں، ان کی شناعت سے انکار نہیں۔ ان پر مولانا کا مشتعل ہو جانا بھی قدرتی بات تھی۔ لیکن سب سے پہلے تو ہمیں الاعمال بالنیات کا اصول سامنے رکھنا چاہیے۔ یگانہ نے وہ خط مولانا عبدالماجد دریابادی کی خدمت میں لکھا ہی نہیں تھا، اگرچہ مولانا نے یہی دعویٰ کیا ہے؛ یگانہ نے یہ "نجی خط" نیاز فتحپوری کے نام لکھا تھا۔ اس لیے ثابت کرنا پڑے گا کہ یہ انھوں نے مسلم قوم کی دل آزادی کی نیت سے لکھا تھا۔

پھر مولانا دریابادی خود مانتے ہیں کہ یگانہ "جنون کی حد تک" پہنچ چکے تھے، اور وہ "ہذیان" بک رہے تھے۔ دنیا کا کوئی قانون یا فقہ ایسے شخص کو اپنے قول و فعل کے لیے ذمہ دار نہیں گردانتا۔

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے۔

اس ملک میں ایک منظم حکومت ہے، اور مسلمہ قانون اور تعزیرات کا ضابطہ ہے یگانہ

نے جو قصور کیا تھا، اس کے لیے ان پر باقاعدہ مقدمہ چلنا چاہیے تھا۔ اگر عدالتِ مجاز ان کی دماغی کیفیت دیکھنے کے بعد انھیں مجرم اور سزا کا مستحق ٹھہراتی، تو کسی کو اعتراض کی گنجایش نہ رہتی۔ اگر یوں ہر کوئی اپنی صوابدید پر فیصلہ کرلے کہ فلاں شخص نے میری یا میرے بزرگوں کی ہتک کی ہے، اور اسے پیٹ ڈالے یا موت کے گھاٹ اتار دے، تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا! ملک کا امن و امان غارت نہ ہو جائے گا؟

بہر حال صدقِ جدید کے اداریے کا بے حد افسوس ناک نتیجہ نکلا۔ مولانا دریابادی نے اپنے مضمون میں شیعی حضرات کو خاص طور پر غیرت دلائی تھی۔ چناں چہ شیعی اخبار "سرفراز" نے معاملہ اٹھایا، بلکہ شاید صدقِ جدید کا پورا مضمون لفظ بلفظ اپنے ہاں نقل کیا۔ اب کیا تھا۔ شہر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، عوام کے مشتعل ہو جانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے! دو تین دن بعد کچھ نوجوان جلوس کی شکل میں یگانہ کے مسکن پر پہنچے، انھیں پکڑ کر ایک رکشا پر بٹھایا، منھ پر کالک تھوپ دی، گلے میں جوتیوں کا ہار پہنا دیا، اور انھیں بازاروں میں گھمانے لگے، قدم قدم پر لونڈے ان کے منھ پر تھوکتے اور فقرے کستے جا رہے تھے۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد پولیس پہنچ گئی اور انھوں نے یگانہ کو ان ظالموں کے چنگل سے نجات دلائی۔

میں اس زمانے میں اسکندریہ (مصر) میں تھا۔ مجھے اس سانحے کی خبر پہلے ایک دوست نے دی۔ تھوڑے دن بعد خود ان کا خط ملا۔ اس میں خاصی تفصیل تھی۔ اور آخر میں لکھا تھا کہ بالآخر رُبع صدی بعد اہلِ لکھنؤ نے اپنی کینہ توزی اور حسد کی جلن کی تسکین کر ہی لی۔ لیکن اس کے باوجود کسی کے خلاف کوئی ناروا کلمہ نہیں لکھا۔ اس طرح کے حالات میں انسان کے مزاج میں قدرتاً تلخی پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ درشتی سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ لیکن آفرین ہے یگانہ پر کہ ایسے شرمناک اور جان لیوا حادثے پر بھی ان کی پیشانی پر بل نہیں آیا اور انھوں نے کسی کے خلاف کچھ نہیں کہا۔

اب کے میں ۱۹۵۴ء کے اواخر میں ہندستان آیا اور جنوری ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ گیا۔ وہ اس زمانے میں شاہ گنج میں مقیم تھے۔ میں نے اپنے آنے کی اطلاع انھیں دی تھی۔ جب پہنچا ہوں تو وہ لیٹے ہوئے تھے۔ میرے پہنچنے پر اٹھ کر بستر ہی پر بیٹھ گئے۔ میں ان کی

حالت دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔ ہڈیوں کا پنجر ہو کر رہ گئے تھے۔ دمے کا عارضہ تھا۔ بات کرتے ہیں، تھوڑی دیر بعد کھانسی کا دورہ پڑ جاتا تھا، جس سے نڈھال ہو جاتے۔ میں نے یہ حالت دیکھی، تو خیال کیا کہ بہتر ہے، وہاں سے چلا جاؤں کیوں کہ جب تک بیٹھا رہوں گا، وہ باتیں ضرور کریں گے، اور اس سے ان پر کھانسی کا دورہ بھی ضرور ہوگا۔ لیکن وہ اس پر کسی طرح راضی نہ ہوئے، اصرار کر کے مجھ سے بیٹھنے کو کہا۔ کیا کرتا، بیٹھا رہا۔ اس پر میں نے یہ کیا کہ اب انھیں زیادہ بات چیت کرنے کا موقع نہیں دیا۔ خود ہی اپنے سفر کے حالات، آیندہ کا پروگرام، موسم اور کیا کیا الم غلم باتیں کرتا رہا۔ یوں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ نکل گیا۔ اب میں نے اجازت چاہی۔

یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ میں ان کے پاس سے یہ احساس لے کر اٹھا کہ اب ساحل صرف دو چار ہاتھ دور رہ گیا ہے۔

خبر ملی کہ ۴ فروری ۱۹۵۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

پروانے اپنی آگ میں جل کر ہوئے تمام
اب کوئی بارِ خاطرِ محفل نہیں رہا

یگانہ فن

سرسید اور حالی نے اپنی ہم عصر شعر و شاعری کی مصنوعیت کو دیکھتے ہوئے اصلیت، دیچپی، جوش
اور تاثر پر اس قدر زیادہ زور دیا کہ حالی کے بعد غزل گو شعرا کی جو کھیپ بالخصوص لکھنؤ میں ابھری،
اس نے اپنی شاعری میں ایک نیا طرز اختیار کیا۔ لفظوں سے کھیلنے کی پرانی عادت نہ گئی لیکن لفظوں
کی شعبدہ گری سے متعجب کرنے کی بجائے ایک شعوری کوشش، یعنی اظہارِ غم، آہ و بکا اور ماتم
کی نظر آتی ہے۔ اسی نسبت سے سامعین کو متاثر کرنے کا مقصد بھی ان کی شاعری میں راہ پاتا ہے۔

عزیز، صفی، ثاقب، محشر، آرزو اور فانی بھی (دورِ اول کے) یہ سب کے سب عاشق
کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھاتے ہیں۔ میر نے دلِ غمزدہ کی بات کو دل کے مرثیے کا نام دیا، ان شعراء
نے پیرویِ میر میں دل کا مرثیہ سچ مچ میں لکھنا شروع کر دیا۔ شاعری کتنی ہی فطری ہو، ایک مصنوعی شے
بھی ہے۔ شاعر کوئی بھی سوانگ رچا سکتا ہے۔ چنانچہ ان کے اشعار میں اظہارِ غم موجود ہے، لیکن وہ
کسی فطری حالت کا نہیں بلکہ زبان کا پروردہ اور نقلی چہرے کا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ان اشعار
میں تاثیر کی بجائے تاثر ہے۔ ثاقب کا ایک غمناک شعر ملاحظہ ہو :

روتے روتے شام ہوئی ہے کب تک اشک بہائیں گی
بہتے بہتے تھمتے ہیں دریا، آنکھیں بھی تھم جائیں گی

انھی کا ایک اور متعجب کرنے والا شعر ملاحظہ ہو :

غیروں کو دکھایا مرا دل کھول کے مُٹھی
مجھ سے دمِ پرسش یہ کہا اور ہی کچھ ہے

مگر یہ بزم کچھ انہیں پر ختم نہ تھی۔ انہیں ایسے شعرا کی ہم عصری کا بھی شرف مِلا جو صحیح
معنوں میں حقیقی شاعر تھے اور جنھوں نے حقیقی شاعری کی۔ نام تو کئی ایک ہیں اور سب اہم ہیں
لیکن اس وقت گفتگو ان کی ہے جنھوں نے شاعری انتخابِ خیال سے نہیں بلکہ اپنے تجربات
سے کی ہے۔ اس سلسلے میں جہاں حسرت کا نام لیا جا سکتا ہے وہاں یگانہ کا بھی —

حالی سے پہلے ہماری غزل شخصی جذبے کے اظہار کی شے تھی۔ اس شخصی جذبے کے اظہار میں بہت سی باتیں آجاتیں، قتلِ عام کا ذکر ہوتا، صید اور صیاد کا ذکر ہوتا۔ لیکن اس کی حیثیت ایک پبلک فورم کی نہ تھی۔ حالی نے اپنی شاعری کے اصلاحی دَور میں، غزل کو پبلک فورم یا منبر کی شے بنا دیا اور اس سے پند و موعظت کا کام لیا اور سایۂ عشقِ بتاں سے مکمل گریز کا انداز اختیار کیا:

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بُتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

حالی کا یہ ردِّ عمل کچھ بے جا نہ تھا۔ کیونکہ سلاطینِ دہلی کے زمانے سے لے کر مغلیہ دورِ حکومت کے اختتام تک، مسلمان اُمرا کی زندگی تعیش اور اسراف میں بسر ہوتی اور اس کا اثر نچلے طبقوں کے لوگوں کی زندگی پر بھی محسوس کیا جاتا۔ عرس، میلے ٹھیلے سب عیاشی کے اڈے تھے۔ بازار طرح طرح کے اربابِ طرب سے مزیّن رہتا۔ غلام بچے اور کنیزیں بازاروں میں بکتیں، اُمرد اور طوائفیں دکانیں سجا کر بیٹھتیں۔ یہ بازاری کلچر، مسلمانوں کے اخلاق کو تباہ کیے جا رہا تھا۔ جب دورِ محکومی میں اُمرا کا طبقہ باقی نہ رہا کیونکہ وہ سب کے سب خانہ جنگیوں میں کٹ مر کر ختم ہو گئے تھے اور صرف بازار کے لوگ رہ گئے تھے جو ہنرمند یا چھوٹے دکاندار تھے، تو درمیانہ طبقے میں زندگی کی طرف ایک نیا رویّہ کفایت شعاری اور بچت وغیرہ کا پیدا ہوا۔ اس زمانے میں ایک عام تنقید، اوباشی، رندی، امرد پرستی اور طوائف بازی کے خلاف تھی۔ حالی نے یہ صحیح طور سے محسوس کیا کہ مسلمانوں کا جنسی زندگی سے حد سے بڑھا ہوا شغف ان کی تباہی و بربادی میں مددگار ثابت ہوا۔ چنانچہ یہ اسی کا ردِّ عمل تھا کہ ہماری غزلوں کو ناپاک دفتر کہہ کر اسے غرق دریا کرنا چاہا اور ملک میں یہ منادی کرادی کہ رسم و رہ عاشقی منسوخ۔ مگر اس کا ردِّ عمل بھی ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ زندگی قطبین کے درمیان نقطۂ توازن کی تلاش میں رہتی ہے۔ حسرت نے زندگی کی اسی ضرورت کو محسوس کیا اور رسمِ عاشقی کو از سرِ نو تہذیبی عمل کا تقدس بخشتے ہوئے عاشقانہ غزل کا احیا کیا اور اس پر اصرار کیا کہ حسرت کو فاسقانہ غزل کہنے کا بھی حق ہے کیونکہ حسرت حق پرست ہے۔ جنسی زندگی کوئی شر نہیں بلکہ خیر ہے کہ اس سے بقائے حیاتِ انسانی ہے اور بدن روح کا ایک فطری اور مقدس گھر ہے ——— یگانہ بھی حسرت کی طرح حق پرست تھے مگر ان کی حق پرستی کا میدان مختلف تھا:

کیا بتاؤں کیا ہوں میں، قدرتِ خدا ہوں میں
میری خود پرستی بھی عین حق پرستی ہے

بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یگانہ کی شاعری کا موضوع خود پرستی ہے مگر ان کی

خود پرستی محیط ہے حیاتِ انسانی کی تفہیم اور اس کی تنقید و تشریح پر اور چونکہ حیاتِ انسانی کو کائنات اور قضا و قدر کے رشتوں کے بغیر سمجھنا مشکل ہے اس لیے ان کے بارے میں بھی یگانہ نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ مگر کس طرح؟ ایک شاعر کے طرزِ سخن میں جو شخصی جذبات سے مملو ہوتا ہے۔ یگانہ کوئی فلسفی نہ تھے جو بھولے سے شاعری کے میدان میں آگئے تھے۔ وہ ایک حقیقی شاعر تھے۔ ان کی فکر ان کے اپنے تجرباتِ زندگی کی پروردہ تھی۔ چنانچہ اسی لیے ان کی فکر میں ایسے تضادات بھی ہیں جو بدلتے ہوئے موڈ یا تغیرِ کیفیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ کبھی جبر تو کبھی اختیار کی باتیں بھی کرتے ہیں مگر نہ اس طرح کہ دونوں میں تضاد نہ ہو۔ زندگی کی کوئی صورتِ حال ایسی ہے جو تضاد ہے اور کیا عجب جو آدمی کی زندگی ہی مجموعۂ اضداد ہو۔ ایسی صورت میں اس قسم کی حرف گیری غالباً جائز نہ ہوگی کہ انہوں نے کہیں کہیں اپنے ہی کو مسترد بھی کیا ہے۔ لیکن جب یگانہ کی مجموعی فکر کا احاطہ کیا جائے گا تو ان کے فلسفیانہ اور مذہبی عقائد کے بہت سے واضح خطوط ابھریں گے اور ان کا شمار ایسے شاعروں میں کیا جائے گا جن کا کوئی مثبت پیغام بجز تنقید عصر نہیں۔ یگانہ چنگیزی بغیر کسی تلوار کے تھے لیکن وہ نوکِ قلم سے کام تلوار کا لیتے۔ اپنوں بیگانوں کی پیٹھ پر اس مکھی کی طرح بیٹھ گئے تھے جو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر ہمیشہ ڈسا کرتی ہے اگر گھوڑا اچھلتا اور کودتا ہے تو ایسا کیا کرے، وہ اپنا کام کیے جاتی ہے۔ مگر یگانہ کا کام صرف دوسروں ہی کو ڈسنا نہ تھا:

موذیوں کے موذی کو فکرِ نیشِ عقرب کیا

بلکہ اپنے ضمیر کی چبھن کو بھی پیش کرنا تھا۔ ایک کانٹا ضمیرِ ملامت شعار کا ان کے دل میں ایسا چبھا ہوا تھا جو انہیں ہر غلط کام پر ٹوکتا اور سرزنش کرتا رہتا۔ یہ کانٹا علی الرغم ان کے اس عقیدے کے تھا کہ وہ جبر کے قائل تھے:

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری کا موضوع اخلاقِ انسانی ہے اور اس نسبت سے نیک و بد کے مابعد الطبیعیاتی ماخذ، جبر و قدر، سزا و جزا وغیرہ کے مسائل بھی ہیں۔ لیکن وہ ان ساری باتوں کو انسانی رشتوں یا محسوس رشتوں اور حسنِ تغزل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا لب و لہجہ نرم اور شستہ نہیں۔ بلکہ سخت گیر اور کہیں کہیں جارحانہ بھی ہے۔ وہ ایک خدائی فوجدار کی طرح کہیں اخلاق تو کہیں اصلاح کی جنگ لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے یہ کردار خدائی فوجدار کا خود شناسی کے فریب میں اختیار کیا۔ وہ لاکھ ٹوکن

کا خبط مذہب تو دیکھئے :

سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا
سر پھرا دے انسان کا ایسا خبط مذہب کیا

مگر وہ خود جس خبط میں گرفتار تھے اس کے شدائد دیکھ نہیں پاتے تھے، ان کا وہ خبط اصلاح ادب اور تکمیل کردار کا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ میری شاعری میری عملی زندگی کا آئینہ ہے۔ یگانہ کو اپنے کردار پر ناز تو نہ تھا لیکن ان کی زندگی میں جو ریاضت اپنے کردار پر قائم رہنے، اپنی کھال میں مست رہنے اور اپنی چادر سے باہر پاؤں نہ پھیلانے کی ملتی ہے، وہ اردو شاعروں کی زندگی میں بالعموم نظر نہیں آتی ہے۔ چنانچہ غالب اور اقبال پروہ معترض اس نقطۂ نگاہ سے بھی تھے کہ وہ کردار کے غازی نہ تھے۔ اس کے برعکس وہ اپنے خیال میں میر تقی میر اور آتش کو صاحب کردار سمجھتے۔

یگانہ، میر کو اردو کا سب سے بڑا شاعر جائز طور سے تصور کرتے اور وہ میر کے فن شعر سے کسی قدر متاثر بھی ہیں۔ لیکن میر کی شاعری کا دائرہ ان کی شاعری سے خاصا مختلف تھا۔ میر بنیادی اعتبار سے حسن و عشق اور لہجے کی نرمی اور سپردگی کے شاعر تھے۔ مگر میر کے کردار کا ایک پہلو یگانہ کے کردار سے میل بھی کھاتا۔ وہ پہلو خود شناسی اور خودداری کا تھا :

اٹھیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں

اور وہ نازک مزاجی بھی جو کبھی کبھی اکل کھرے پن کا روپ اختیار کر لیتی :

تری چال ٹیڑھی تیری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

یگانہ بھی میر کی طرح وحدت الوجودی شاعر ہیں۔ وہ اپنے سے باہر خدا کو ڈھونڈنے کے قائل نہیں اور نہ اس بات کے قائل تھے کہ جز، کل سے الگ ہو سکتا ہے۔ لیکن یگانہ کا یہ وحدت الوجودی تصور ایک غیر شخصی خدا کا تھا۔ وہ خدا کو احساسات کی دسترس سے ماورا تصور کرتے۔ وہ اس کو خواہ تجلی کی صورت میں ہو یا وحدتِ ذات کی صورت میں، مظاہر فطرت اور انسان میں نہ دیکھ پاتے۔ لہذا ان کا تصورِ وحدت الوجود ایک سیل محبت بن کر ان کے دل میں اُتر نہ پایا۔ اس قسم کے اشعار :

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

یگانہ کے ہاں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں فلسفۂ وحدت الوجود، انسان دوستی کی تحریک کا ایک زبردست ستون تھا۔ اسی سے احترامِ آدمیت احساسِ بردست اور ناز و نیاز حسن و عشق کی باتیں تھیں، اسی سے زلف و خال، کفر و اسلام کی بھی حکایتیں تھیں اسی سے مساوات کا رشتہ انسان اور انسان کے درمیان پیدا ہوا تھا۔ ورنہ اس دور میں کوئی آئینی تصورِ مساوات کا تو نہ تھا۔ ہمیں یگانہ کے یہاں اس انسان دوستی کی بڑی کمی ملتی ہے، صرف ایک آدھ شعر سے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی ہے:

صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ
داورا نمی زیبد بال و پر من تنہا

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کرکے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تلخیٔ حیات نے اور کچھ شعر لئے لکھنؤ کی بدسلوکی نے ان سے وہ گداختگی دل چھین لی تھی جس سے دردِ انسانیت کی قدر مشترک جنم لیتی ہے۔ ایک کڑوا گھونٹ زہر کا ان کی روح میں گھلا ہوا نظر آتا ہے۔ کاش وہ اس کو پی کر اسے امرت میں تبدیل کر دیتے۔ وہ اس پائے کے نہ تو کوئی رشی منی تھے اور نہ شاعر۔ اس کے برعکس وہ امر ہو قف کے قائل تھے:

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
یاس کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

دنیا مری بلا سے خوش ہو کہ نہ ہو،
میں اپنے سے خوش ہوں تو غمِ دنیا کیا!

یگانہ کے ہاں اس حق پرستی کا معیار کیا تھا؟ جب میں اس بات پر غور کرتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ وہ راہِ اعتدال کو پسند کرتے اور ہر چند کہ وہ دل کو "ذلیل راہ" (رہ نما) قرار دیتے ہیں، لیکن وہ جنون کی کیفیت سے کبھی دوچار نہیں ہوتے ہیں۔

ذرا اس شعر پر غور کیجیے:

اُمیدِ صلح کیا ہو کسی حق پرست سے
پیچھے وہ کیا ہٹے گا جو حد سے بڑھا نہ ہو

اور پھر اسی شعر کے ساتھ ساتھ یہ شعر بھی پیشِ نظر رہے:

ادب کے واسطے کتنوں کے دل دکھائے ہیں
یگانہ حد سے گزرنا نہ تھا مگر گزرے

بہرحال یہ اسی میانہ روی اور اعتدال پسندی کا نتیجہ تھا کہ ہرچند کہ ان کے دل میں ارمانوں کے طوفان اٹھتے مگر وہ دل مار کر رہتے :

اسیرِ شوق آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

مگر وہ اس سیاسی غلامی کو بھی منجملۂ اسبابِ جبر ہی تصور کرتے :

بڑھ گئی قیدِ خودی سے اور اِک قیدِ فرنگ
آزماتے ہیں وہ اب طوق و سلاسل سے مجھے

جبر کا یہ فلسفہ یگانہ کے یہاں اتنی بہت سی چیزوں کے حوالے سے آیا ہے کہ اگر اس مسئلے سے متعلق ان کے موقف کی وضاحت نہ کی جائے تو ان کی تنقید کی تیزی اور کاٹ نمایاں نہ ہو سکے گی۔ جبر و اختیار کے مسئلے پر ہمارے شعراء عام طور سے اظہارِ خیال اس لیے کرتے آئے ہیں کہ اس سے خیر و شر، سزا و جزا کے مسائل وابستہ ہیں اور کسی بھی مذہبی فکر کے دائرے میں رہتے ہوئے انسانی اخلاق کی گفتگو اس مسئلے سے دامن چھڑا کر ممکن نہیں۔ لیکن جبر و اختیار کی بحث ہمیشہ بے معنی بھی رہی ہے کیونکہ یہ مسئلہ "یا یہ یا وہ" کا نہیں ہے۔ نہ تو انسان مجبورِ محض ہے اور نہ مختارِ مطلق ——— وہ اپنی مجبوری میں آزاد اور آزادی میں مجبور بھی ہے۔ یہ دونوں صورتیں اضافی ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اس بات کا جاننا ہے کہ انسان ایک BECOMING خود گر حقیقت ہے۔ وہ اپنے کو اپنے سے بنا رہا ہے۔ چنانچہ اسی نسبت سے اس کی آزادی کا دائرہ بھی بڑھتا اور پھیلتا رہا ہے۔ انسان کا ایک ارتقا نوعی یا فطری ہے جس کے ذریعے وہ حیوانِ ناطق یا صاحبِ شعور بنا ہے۔ ایک بار اس مرحلۂ حیات کو پہنچ کر اس نے ایک تمدنی اور تہذیبی دائرہ اپنی ترقی کا پیدا کیا جس کی رو سے اس نے ترقی کی کچھ نئی جہتیں نکالی ہیں۔ انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ انسانی زندگی میں شر کے عنصر کو سماجی رشتوں کی تبدیلی سے کم کیا جاسکتا ہے اس حد تک کم کیا جاسکتا ہے کہ وہ غیر اہم ہو جائے لیکن بہت سے لوگ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے ہیں کہ فطرتِ انسانی تغیر پذیر ہے، وہ پچھے سے کچھ ہوتی رہی ہے، بدلتی رہی ہے یا یہ کہ وہ بدل سکتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح حیوانات کی ایک معین فطرت ہے، جس کا اظہار بہ تکرار ہوتا رہتا ہے، اسی طرح انسان کی فطرت بھی ہے۔ وہ اپنی ایک فطرت لے کر آتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس طرح سوچتے ہیں وہ خیر و شر کو اس کی فطرت میں دیکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان کے علاوہ بھی کسی دوسرے

حیوان میں خیر و شر کی ملی جلی فطرت ملتی ہے؟ کیا کوئی شیر جب اپنی غذا کے لیے کسی جانور کا شکار کرتا ہے، یا تحفظِ جان کے لیے اپنے سے کسی قوی تر جانور سے لڑ پڑتا ہے یا یہ کہ انسان پر حملہ کرتا ہے تو ایسا اپنی فطرت کے مطابق کرتا ہے یا کسی خیر و شر کے تصور کے تحت۔ جواب واضح ہے کہ خیر و شر کا مسئلہ صرف انسان کے ساتھ وابستہ ہے، اس سے باہر نہ تو خیر ہے اور نہ شر، بلکہ زندگی کا ایک ایسا سانچہ ہے جو خیر و شر کے سوال سے بے نیاز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی اہم ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ انسان میں خیر و شر کی تمیز ہے اور ایسا کیوں نہیں ہے کہ وہ خیر و شر کی تمیز سے مبرا ہو۔

میں اس مسئلے پر گفتگو اس روایتی فکر سے کروں گا جو ہمارے معاشرے میں ابتدائی دور سے جاری رہی ہے۔ ایک گروہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خیرِ محض ہے اور خیرِ محض سے کوئی شر پیدا نہیں ہو سکتا اور اگر یہ کہا جائے کہ قدرتِ کاملہ سے کچھ بعید نہیں اور نہ کچھ محال تو یہ یوں درست نہیں ہے کہ خدا اپنی نفی پر قادر نہیں ہے ——— چنانچہ شر کی ذمہ داری ابلیس پر ڈالی جاتی ہے اور وہی ابلیس جس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور پھر بعد میں بی بی حوا کو بہکایا اور پھر بی بی حوا نے آدم کو پھسلایا۔ بہرحال ان کا خیال ہے کہ وہی ابلیس انسان کو شر کے لیے ورغلاتا رہتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو انسان کے سارے بُرے افعال کی سزا شیطان کو ملنی چاہیے نہ کہ انسان کو اور پھر یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا نے اسے اسی کام کے لیے پیدا کیا ہے؟ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ انسان میں منجانب رب، نیک و بد کی تمیز اسی لیے دی گئی ہے کہ وہ شیطنت اور برائیوں کو پہچانے اور اگر وہ شیطان کو دور رکھنے اور برائیوں سے بچنے میں ناکام رہتا ہے تو اس کی ذمہ داری خود اس کے سر ہے نہ کہ شیطان کے سر۔ اسی صورتِ حال سے متعلق یہ شعر کہا گیا ہے:

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اب یہاں ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان میں نیک و بد کی تمیز کیوں کر پیدا ہوئی۔ کیا یہ تمیز از خود اس نے اپنے اندر پیدا کی یا یہ کہ یہ شے کسی غلط راستے سے اس کے اندر آئی اور بعد میں ایک خوبی میں تبدیل ہو گئی ——— مذہبی فکر خواہ وہ مسیحی ہو یا اسلامی، اسی آخر الذکر نقطۂ نظر کو اپناتی آئی ہے کہ نیک و بد کی تمیز انسان میں، اس نافرمانی سے پیدا ہوئی جو شیطان کے بہکانے سے حضرت آدم سے سرزد ہوئی اور ابلیس میں شر پیدا کرنے کی آزادی بھی خدا کے حکم کی نافرمانی سے پیدا ہوئی۔ چنانچہ ان دونوں پہلوؤں سے شر بنیادی حیثیت سے حکمِ الٰہی کی نافرمانی

سے پیدا ہوا۔ لیکن اگر ابلیس نے انکار نہ کیا ہوتا :

اُسے روزِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر

اور اگر حضرت آدمؑ شجر ممنوعہ کے پاس نہ گئے ہوتے جو اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی تھی تو نہ تو شر وجود میں آتا اور نہ خیر —— کیونکہ خیر کو شر ہی کے تضاد سے پہچانا گیا ہے۔ فلاسفہ یہ تمثیلی انداز اختیار نہیں کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان اور حیوان کے درمیان بنیادی خط امتیاز شعور کا ہے جس کا خارجی روپ زبان Logos ہے۔ انسان نے اس حیوانی سرحد کو کیوں کر پار کیا؟ ارتقائی فکر کے حکماء اس سے متعلق اپنی تاویلیں پیش کرتے ہیں اور مذہبی مفکرین اسے ایک رمز یا سرّ اللہ تصور کرتے ہیں لیکن یہ بات سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ جب تک انسان کا پیش رو حیوان اپنی فطرت کے ساتھ متحد تھا اور اس کی ہدایت اس طرح ہوتی جس طرح کہ شہد کی مکھی کی ہوتی ہے، وہ نیک و بد سے بے نیاز تھا۔ لیکن جب وہ شعور سے دوچار ہوا یعنی حیوان ناطق بنا، جس کے ایک معنی تمیز کرنے والے انسان کے بھی ہیں HOMO SAPIENS تو اس نے اپنے کو نہ صرف خارج کی فطرت بلکہ اپنی فطرت سے بھی ممیز کیا۔ شعور کے پیدا ہوتے ہی جو زبان LANGUAGE کی اندرونی حقیقت ہے، اس نے ایک کمی، ہیچ میرزی، نہ کچھ ہونے کا احساس، ایک خلا اپنے اندر محسوس کیا اور پھر اسی کے ردعمل میں کچھ بننے، کچھ حاصل کرنے یا تحصیل ذات کا شعور اس میں پیدا ہوا —— لیکن کسی اثباتی عمل سے پہلے اس میں، خود اپنی فطرت کو نہیں کہنے، اسے زیر کرنے، اس پر قابو پانے کا حوصلہ بھی اس میں پیدا ہوا۔ آزادی کا پہلا کلمہ "نہیں" ہے اور اسی "نہیں" سے اخلاق پیدا ہوا ہے —— چنانچہ اخلاقیات کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ قدیم سے قدیم معاشرے میں بھی اس آدمی کی بڑی عزت کی جاتی جو اپنے نفس کو مارتا، جو اپنی ضرورتوں کو کم کرتا، اپنے غم و غصہ اور شہوانی جذبات پر قابو پاتا۔ اسی عمل نفی سے رشی منی، سادھو سنت، متقی پرہیزگار اور صوفی و صافی بنے ہیں۔ چنانچہ جب نٹشے نے اوور مین OVERMAN کے تصور سے مسیحی بساط اخلاق کو الٹ دیا تو اس نے اوور مین کے اخلاق میں پھر بھی اس بات کو قائم رکھا کہ اوور مین وہ ہے جو اپنے اوپر غالب آتا ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ غالب آنے کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک زُہد، تہی دستی سے اور ایک زہد بزدلی سے پیدا ہوتا ہے۔ گوتم ایک راجہ کا بیٹا تھا، اس کی تپسیا (تپش۔ آگ سے گزرنا) بزدلی سے نہ تھی۔ چنانچہ وہ نٹشے کا اوور مین بھی تھا۔ وہ اپنے نفس پر اپنی بزدلی سے غالب آیا تھا لیکن اس کی یہ نفس کشی ایک ذریعہ تھی اس شکتی یا قوت حاصل کرنے کا جس سے عالم انسانی وجود میں آتے ہیں۔ چنانچہ جب گوتم سے اس کے ایک شاگرد نے پوچھا، آپ یہ شکتی کس لیے حاصل

کرنا چاہتے ہیں، کیا آپ کا مقصد ملکوں کی فتح کرنا ہے، کیا آپ کا مقصد انسانوں پہ حکمرانی کرنا ہے، کیا آپ کا مقصد دنیا کے عیش و عشرت کو سمیٹنا ہے۔ تو گوتم نے جواب دیا۔ میرے عزیز شاگرد یہ سب کچھ نہیں تکمیل حاصل کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ ایک نیا عالم خلق کیا جائے۔ انسانی ماحول کو ایک بہتر ماحول سے بدلا جائے۔ لیکن افسوس کہ اس کے پیرو بھکشو حضرات اور زاہدانِ باصفا، گوتم کی اس بات کو پا نہ سکے اور وہ "جادۂ راہِ فنا" میں کھو گئے۔

لیکن ان کی یہ گمرہی ایک دوسری حکایت ہے، مجھے تو یہ بات اس لیے درمیان میں لانی پڑی کہ میں نے محسوس کیا کہ یگانہ کا رویہ انسان کی تخلیقی قوت کے بارے میں وہ نہیں ہے جو اقبالؒ کا ہے:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
تو گل آفریدی ایاغ آفریدم

اس کے برعکس وہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

ازل سے تیرا بندہ ہوں ترا ہر حکم آنکھوں پر
مگر فرمان آزادی بجا لانا نہیں آتا

مگر اس کے باوجود ان کے بدن میں روح ایک سنیاسی کی تھی۔ وہ تکمیل کردار کی خاطر ہر طرح کی آزمائش سے گزرنا گوارا کرتے تھے، اور یہ رجحان ان میں اپنی ذات کو ایذا پہنچانے کی حد تک قوی تھا۔

وحدت الوجودی صوفیوں کے بارے میں یہ اعتراض عام طور سے کیا جاتا رہا ہے کہ جب سب کچھ وہی وہ ہے اور خدا سے باہر کوئی شے نہیں تو پھر نہ تو کچھ شر ہے اور نہ فساد۔ زندگی میں ہر چیز کی آزادی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض شعرا نے فلسفۂ وحدت الوجود کے تحت ایک قسم کی آزادی بعض ایسے امور میں برتی ہے جن پر شریعت نکتہ چیں رہی۔ مثلاً سماع اور نشہ کی حرمت۔ لیکن اس آزادی سے ان کے کردار کے تنزیہی پہلو میں کوئی خاص نقص واقع نہیں ہوا ہے۔ میرؔ ایک وحدت الوجودی شاعر تھے۔ مگر ان کی زندگی میں تنزیہ اور درویشی بھی تھی۔ بات یہ ہے کہ رندانہ زندگی مانع درویشی نہیں ہے اور قلندر کا رویہ رند کے رویے سے ذرا کم ہی مختلف ہوتا ہے۔ غالبؔ بیک وقت رند بھی تھے اور قلندر بھی:

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

چنانچہ قلندر ہو کہ رند دونوں ہی اس طمعِ خام سے آزاد ہوتے ہیں جس کا تعلق حور و غلمان

کے حصول سے ہے۔ یگانہ کا بھی ایک شعر اسی وضع کا ہے :

یادِ خدا کا وقت بھی آئے گا کوئی یا نہیں
یادِ گناہ کب تلک شام و سحر نماز بس

وہ "یادِ خدا" جو طمعِ خام سے آزاد ہو اور وہ نماز جو بے نیازِ اجر ہو، یگانہ اسی یادِ خدا اور نماز کے قائل تھے۔ اس سے ان کی زندگی میں جو تنزیہی اور تجریدی پہلو نکلتا ہے، وہی ان کے ضمیرِ ملامت شعار کی بھی وضاحت کرتا ہے۔ یگانہ ایک شاعر تھے، اور عام طور سے شاعر کی زندگی، دلدادۂ لذتِ حیات کی زندگی ہوتی ہے۔ لیکن یگانہ نے تکمیلِ کردار کے پیشِ نظر بہت سی لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر رکھا تھا ـــــ اور ایسا صرف کردار کی خاطر تھا، ایک ایسا کردار جو آپ اپنا انعام ہوتا ہے۔ کانٹ کے فلسفے میں تو انسان مرنے کے بعد بھی تکمیلِ کردار کے عمل کو جاری رکھتا ہے اور وہ ہر قسم کے اجر سے بے نیاز ہوتا ہے۔ ہندوؤں میں تجسیم INCARNATION کا فلسفہ بھی اسی سے پیدا ہوتا ہے۔

یگانہ کی شاعری میں اس بے نیازی کا مضمون اکثر و بیشتر ملتا ہے :

داورِ حشر ہوشیار، دونوں میں امتیاز رکھ
بندۂ ناامید اور بندۂ بے نیاز میں

وہ خدا کے کرم سے بے نیاز نہ تھے (جیسا کہ بندۂ ناامید لا تقنطوا سے پتا چلتا ہے) بلکہ کارِ خیر کے اجر سے بے نیاز تھے۔ وہ ایک ایسا سجدہ اس کے آستان سے دور اس کے غیب میں چاہتے جس میں کوئی طمعِ خام نہ اس دنیا کی ہو نہ اُس دنیا کی :

طاعت ہو یا گناہ پسِ پردہ خوب ہے
دونوں کا جب مزا ہے کہ تنہا کرے کوئی

اس شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے جب وہ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں :

بندۂ فطرتِ مجبور ہوں مختار نہیں
ہاں ندامت میں ہے شک جرم سے انکار نہیں

اسی کے ساتھ ساتھ ان کے یہ اشعار بھی پیشِ نظر رہیں :

سمجھ میں آگیا جب عذرِ فطرتِ مجبور
گناہگارِ ازل کو نیا بہانہ ملا!

فطرتِ مجبور کو اپنے گناہوں میں ہے شک
وا رہے گا کب تلک توبہ کا در میرے لیے

اوّل تو یہ کہ یگانہ کو شک ہے' وہ پوری طرح اپنی ذمہ داری سے دست بردار نہیں ہوتے ہیں لیکن دبی زبان سے یہ کہتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ گناہ کیا ہو تو توبہ کروں۔ چنانچہ اسی نسبت سے انہیں اپنے کردہ گناہوں پر ندامت میں بھی شک ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کہ انہوں نے جرم کیا۔ ان دونوں پہلوؤں میں ایک خاصا تضاد ہے اور یہ تضاد یگانہ کے یہاں مختلف جگہوں میں ملتا ہے۔ وہ ایک معموں میں پھنسے ہوئے آدمی تھے اور انہوں نے اپنی اس کیفیت کو بیان بھی کیا ہے :

ہاں وسعت زنجیر تک آزاد ہوں میں بھی
ہستی مری مجموعۂ اضداد رہے گی
شیطان کا شیطان فرشتے کا فرشتہ
انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

یگانہ جس قدر قامت کے شاعر تھے اس کے لحاظ سے جبر و قدر کے مسائل سے متعلق ان کی یہ فکر خاصی دلچسپ ہے، مگر وہ چیز وہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ ان مسائل سے متعلق ان کی شاعری میں وہ لطف نہیں ہے جو غالبؔ کی شاعری میں ہے۔ ضد کی بات اور ہے ورنہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ بقید ہوش و حواس وہ غالب کے منہ کیوں آئے۔ شاید اس لیے کہ غالبؔ کا ریختہ اولاً فارسی محاورے میں تھا اور جا بجا انھوں نے عروضی آزادیوں سے بھی کام لیا ہے اور ایسا ہی غیر معتدل رویہ یگانہ اپنی آتش پرستی میں بھی اختیار کرتے ہیں جب وہ غالبؔ کے اشعار کے مقابلے میں آتشؔ کے اشعار پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بہرحال یہ تو ایک ضمنی بات تھی جو اس بات کا ایک اشارہ مہیا کرتی ہے کہ جب خودی بگڑ جاتی ہے تو وہ خود پرستی اور خود رائی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ یگانہ خود پرستی اور خود رائی کا شکار ہو گئے۔

یگانہ کے سلسلے میں ان کی خودی اور یکتائیت کی بات اکثر درمیان میں لائی جاتی ہے اور ان کا یہ دلچسپ شعر بھی نقل کیا جاتا ہے :

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

علّامہ اقبال نے خدا کو انسان کی آئیڈیل فطرت قرار دیا ہے (خطبات) اور تخلقوا باخلاق اللہ کہہ کر انسان کو اس راہ پر ڈالنا چاہا ہے کہ وہ خدا کی صفات اپنے اندر پیدا کرے۔ ویسے بھی چونکہ انسان کو اللہ نے اپنی صورت پر خلق کیا ہے اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے' انسان ایک چھوٹے پیمانے ہی پر سہی، کچھ صفات الہیہ کا حامل ہوتا بھی ہے' چنانچہ اس

میں خود بینی و خود آرائی کی صفات بھی ہیں اور اسی خود بینی اور خود آرائی کو اقبال نے خود گری کا نام دیا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کا نقطۂ نظر دورِ حاضر کے وجودیوں کے نقطۂ نظر سے بہت قریب ہے۔ وجودیوں کا موقف یہ ہے کہ انسان کسی مخصوص جوہر ESSENCE کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا ہے جس کو وہ ممکنہ سے حقیقی بناتا ہے یعنی تحصیل ذات کرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ ایک مستقبل منیر موجود FUTURE ORIENTED EXISTANT ہوتا ہے اور اس کا یہ مقدر ہے کہ وہ اپنا جوہر پیدا کرے خودگری کے ذریعے، چنانچہ اپنے سے اپنے کو بناتے رہنے کا عمل ساری زندگی جاری رہتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ خودی کا فلسفہ معرفت اور علم کا نہیں ہے، یہ چیز عشق کے حصے میں آئی ہے، بلکہ کچھ بننے اور ہونے کا مسئلہ ہے۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے وہ جہاں عمل، یعنی مقصد آگاہ عمل، اور مستقبلیت پہ زور دیتے ہیں وہاں اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ خودی کو خدا میں جذب ہونے سے بچانا بھی ہے۔ کیونکہ انسان کا مقصد آگاہ اور مستقبل منیر عمل، ایک نہ ختم ہونے والا سفر ہے، اس کی زندگی کا انحصار ہی سفر پر ہے، اس میں کوئی منزل نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال مقام بندگی کے بدلے جو اصل میں دردِ سوز آرزومندی کا دوسرا نام ہے، خدائی لینے کے لیے اس لیے تیار نہ تھے کہ خدا ہر خواہش سے بے نیاز ہے

متاعِ بے بہا ہے دردِ سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

میر نے اسی خیال کو اور بھی عمدگی سے پیش کیا ہے:

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

یگانہ مغرب سے واقف تو تھے لیکن غالباً اس حد تک نہیں کہ اس سے صحیح طور سے استفادہ کر سکتے۔ لیکن وہ مشرق اور اپنے معاصر ادب سے خوب واقف تھے۔ جوان کے زمانے میں مغرب سے خاصا متاثر تھا۔ وہ تنقید میں جہاں ڈاکٹر جانسن کی LIVES OF POETS پڑھے ہوئے تھے وہاں حالی اور شبلی کی تنقیدات کا بھی بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ مانند ٹیگور کی شاعری سے بھی خاصے متاثر تھے لیکن ان کا نقطۂ نظر ادب میں کلاسیکیت کا حامل تھا۔ وہ حالی کی طرح قوتِ متخیلہ کو قوتِ ممیزہ کا تابع رکھنا چاہتے اور اشعار میں تعقل کو اس حد تک راہ دیتے کہ ابلاغِ معنی میں نہ تو کسی قسم کا ابہام پیدا کرنے اور نہ کوئی تعقید۔ ان کا تنقیدی رویہ ان کے زمانے کے عام شعری اور تنقیدی رجحان سے مختلف تھا۔ عام رجحان اس انقلابی رومانیت کا تھا جس کی نمائندگی اقبال کا یہ شعر کرتا ہے:

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اور یہی رومانیت شعر و ادب میں نئے فارم اور نئے آہنگ کو اپنانے، الفاظ کو نئے طرز سے برتنے اور ایک جدید جہت کو شاعری میں جگہ دینے میں نظر آتی ہے۔

یگانہ کے لیے نہ تو اقبال اور نہ جوش، نہ اختر شیرانی اور نہ مجاز، ان میں سے کوئی بھی قابل قبول نہ تھا۔ ان کی تمام تر پسندیدگی اکبر الہ آبادی کے کلام اور کم و بیش ان کے جیسے خیالات کی تھی۔ چنانچہ ان کے فلسفۂ خودی کا رخ، باہر کی جانب نہیں یعنی مستقبل آفرینی کی جانب نہیں بلکہ اندر کی جانب یعنی تنقیدِ نفس اور تنقید کلام کی جانب تھا۔ ان کا زمانہ آدمی سے خالی تھا اور وہ چراغ لیے آدمی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ مگر ان کو یہ بتانے والا کوئی نہ تھا کہ وہ جس آدمی کو ڈھونڈ رہے تھے وہ تو روم کے زمانے میں بھی نہ تھا۔ وہ تو سقراط کے پیدا ہونے سے پہلے ہی مر چکا تھا اور سقراط خود بھی ایک رُو بہ انحطاط تہذیب کا ناقد تھا۔ میں یگانہ کا مقابلہ سقراط سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ بات سامنے لانا چاہتا ہوں کہ یگانہ ایک مرتی ہوئی تہذیب کے ناقد تھے۔ وہ میرؔ اور آتشؔ کی درویشانہ زندگی، ان کی خودداری اور غیوری کی طرف بار بار اشارہ کرتے ہیں۔ چند درویش صفت شعرا اور فقرا نے آئی ہوئی دولت کو ٹھکرا دیا مگر یہ کوئی معمول زندگی تو نہ تھا۔ مشرق کیا تھا ؟ ایک مطلق العنان بادشاہ اور سب نوکر چاکر، رعایا اور رعیت۔ ہاں چند درویشوں نے اپنی خودی کو ابھارا۔ یگانہ اس سے کچھ فریب سا کھا گئے۔ بہر حال انہوں نے اسی مشرقی خودی کو اپنایا جس کا اظہار میرؔ کے اس شعر میں ہوا ہے:

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

یگانہ نے بھی اس معنویت کے کئی شعر کہے ہیں:

بندے نہ ہوں گے جتنے خدا ہیں خدائی میں
کس کس خدا کے سامنے سجدہ کرے کوئی

v. Good

بندۂ خود شناس ہے اپنے ہی پیرہن میں مست
بوئے خودی کو پیش کیا سجدہ گہ ایاز میں

زہے معراج انسانی کہ بندہ ہوں تو اپنا ہوں
چڑھایا خود پرستی نے نگاہِ دوست، دشمن پر

نگاہِ یاس سے ثابت ہے سعیِ لاحاصل
خدا کا ذکر تو کیا بندۂ خدا نہ ملا

مشرق کا دہی سنیاسی اور دہی صوفی جس کی عزت اس لیے ہوتی کہ اس کی حاجت محدود، اسے اپنے نفس پر قابو ہے، ان کے اشعار میں بار بار ابھرتا ہے۔ اس کو سیاست سے بھی کوئی غرض نہیں، اس کو طاقت سے بھی کوئی علاقہ نہیں کو سیاسی طاقت بھی اس کے نزدیک شر کا سرچشمہ تھی۔ اس کو فخر اپنے دل کی روشنی اور اس بات پر ہے کہ بغیر کسی طمع خام کے اس نے اپنے نفس کو مار رکھا ہے:

وہ مرد ہے جو زیر کرے دیو نفس کو
وہ مرد کیا جو پیرِ فلک سے پچھڑ گیا

مگر یہ پارسائی، بُزدلی اور ہمت عالی سے ہے نہ کہ فیضِ تنگ دستی سے:

ترکِ لذتِ دنیا کیجیے تو جس دل سے
ذوقِ پارسائی کیا، فیضِ تنگ دستی ہے

یگانہ کی یہ پارسائی یا نفس کشی، کہاں تک اس کے معیار کے مطابق تھی، یہ ایک دوسری حکایت ہوگی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی شاعری ان کی زندگی کا پرتو ہے، نہ کہ ان کی تخیل کی آفرینش محض۔ ان کی شاعری تمام تر ان کی زندگی کا اظہار ہے، مگر زندگی کے صرف ایک پہلو کا اظہار ہے جس کا تعلق دنیا یا زمانے سے پیکار کا ہے۔ وہ بہت ہی زیادہ ایک منفرد آدمی تھے۔ وہ اپنی خودرائی میں کسی کی پیروی کے قائل نہ تھے:

خضرِ منزل اپنا ہوں، اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پہ دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

کوئی بندہ عشق کا، کوئی بندہ عقل کا
پاؤں اپنے ہی نہ تھے قابل کسی زنجیر کے

یہ آزاد روش آدمی یگانہ اپنے کو فرقۂ جبریہ میں شمار کرتا لیکن روح ایسی آزاد پائی کہ اس کے جسم میں کسمساتی رہی:

ایسی آزاد روح اس تن میں
کیوں پرائے مکان میں آئی؟

اور جس طرح ان کی روح ان کے بدن میں اجنبیت محسوس کرتی اسی طرح وہ پورے

معاشرے میں ایک شدید احساسِ بیگانگی محسوس کرتے، بالخصوص اس زمانے سے اور زیادہ جب شعرائے لکھنؤ ان سے بہ محاورۂ غالبؔ "گوہر" لڑنے لگے اور ان پر رزق کے سارے دروازے بند کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس زمانے میں اپنی خودداری اور سفیاسیت کو راہ دیتے ہوئے انہوں نے بڑی سختیاں جھیلی ہیں۔ اس زمانے کی زندگی کا اظہار کئی اشعار میں ہوا ہے مگر اس لطفِ بیان کے ساتھ کہ وہ عمومیت کے حامل ہیں :

دلِ طوفان شکن تنہا جو آگے تھا سو اب بھی ہے
بہت طوفان ٹھنڈے پڑ گئے ٹکرا کے ساحل سے

دیکھتے رہ گئے یاس آپ نے اچھا نہ کیا
ڈوبتے وقت کسی کو تو پکارا ہوتا

چنانچہ ان کا حد سے بڑھا ہوا احساسِ خودی، جسے انہوں نے خود پرستی کا نام دیا ہے، آدمی تو آدمی خدا کے احسان کا بھی روادار نہ تھا۔ بندہ اور بے نیاز، یہ دو متضاد کیفیتیں ہیں لیکن وہ اس کج مرتبے بھی دوچار تھے کہ کیونکر بندگی میں شانِ بے نیازی برتی جائے، وہ اپنی اس جنگ میں ایک شکست خوردہ انسان تھے۔ چنانچہ وہ ساری شکست خوردگی اور شکستگی ان کے طنز اور استہزا کی تلخی میں ڈھل گئی ہے۔ یوں بھی وہ بنیادی جہت سے طنز، نیش زنی، تمسخر اور استہزا کے شاعر تھے۔ ایک شریر مسکراہٹ ان کے چہرے پر ہمیشہ کھیلتی رہتی۔ شاید وہ اپنے طنز کو مزاح سے ملیح اور گوارا کر لیتے مگر شکستِ خودی نے ان کی روح میں ایک ایسی تلخی گھول رکھی تھی کہ ان کے طنز میں کوئی گداز، نرمی اور شفائے زخم نہیں ہے۔ اس فن کا ماہر غالبؔ گزرا ہے۔ غالبؔ کسی پر طنز کرنے سے پہلے اپنے کو پستی میں لے جاتے، اپنی قدر و قیمت کو گھٹاتے، اپنے کو ہیچ ظاہر کرتے پھر اپنے حریف پر اس طرح وار کرتے کہ وہ اپنے بلند بانگ دعووں کے ساتھ ڈھیر ہو جاتا۔ یگانہ اکثر اپنے اشعار میں "ستم ظریفیت" IRONY کی بات کرتے ہیں لیکن وہ IRONY کے بجائے ایسا کھلا زخم لگاتے ہیں کہ اس سے وہ گوشمالیٔ فطرت نہیں ہو پاتی جو طنز کا مقصد ہے۔ یگانہ کا طنز کبھی کبھی بہت ہی بھونڈا ہو جاتا ہے اور مخاصمانہ تو ہمیشہ ہی رہتا ہے۔ ان کے طنزیہ کلام میں یہ دونوں ہی عیب ملتے ہیں :

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے
کس قدر واعظِ مکّار ڈراتا ہے مجھے

چند اشعار کے ذریعے انھوں نے اپنے اس طنزیہ اسلوب کی وضاحت خود بھی کی ہے :

نہ خداؤں کا نہ خدا کا ڈر، اسے عیب جانیے یا ہنر
وہی بات آئی زبان پر جو نگار پہ پڑھ کے کھری رہی

دنیا بری بلا ہے خوش ہو کہ نہ ہو
ہیں اپنے سے خوش ہوں تو غم دنیا کیا

کہاں یہ دعویٰ کہ جو کبھی حد سے گزرا نہ ہو، یعنی حق پر ثابت قدم رہا ہو، وہ بچے کیا ہے:

امید صلح کیا ہو کسی حق پرست سے
یہ بچے وہ کیا ہٹے گا جو حد سے بڑھا نہ ہو

اور کہاں یہ اعتراف لغزش:

ادب کے واسطے کتنوں کے دل دکھائے ہیں
یگانہ حد سے گزرنا نہ تھا مگر گزرے

یگانہ میں ایذا طلبی تو تھی ہی، لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں کچھ ایذا رسانی بھی تھی۔ یہ بات کہ "دوسروں کے دل دکھائے ہیں" کیا اس رجحان کا ایک اشارہ نہیں ہے۔ ماہر نفسیات کا تو یہ کہنا ہے کہ جس کے یہاں ایذا طلبی ہوتی ہے اس کے یہاں کچھ نہ کچھ ایذا رسانی بھی ہوتی ہے۔

جب تک یاس، یگانہ نہ تھے اُن کا نشتر یاس اتنا چنگیزی نہ تھا جتنا کہ وہ یگانہ چنگیزی بننے کے بعد ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بھیک مانگنے سے یا دست سوال دراز کرنے سے یا زاویے میں بیٹھ کر درویشی کا سوانگ رچانے اور فتوحات پر گزارا کرنے سے خودی جاتی رہتی ہے۔ خودی کے استحکام کے لیے محنت اور اکل حلال ضروری ہے۔ لیکن اس کے ردعمل میں یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ بھیک سے بہتر چنگیزیت ہے،

خواہ پیالہ ہو یا نوالہ ہو
بن پڑے تو جھپٹ لے بھیک نہ مانگ

یہ جارحانہ انداز خواہ وہ کسی شے کے ردعمل ہی میں کیوں نہ ہو، اس بات کا غماز ہے کہ شاعر کے یہاں، اصول خودی کے برخلاف، اصول عشق کارفرما نہ تھا جو خودی کو متوازن رکھتا ہے۔ اقبال نے اس راز کو سمجھ لیا تھا اس لیے جہاں انھوں نے خودی کو بیدار کیا وہاں انھوں نے تعلیم عشق بھی دی جو نرمی، معصومیت، الفت اور سپردگی کے جذبات سے عبارت ہے اور یہی جذبات عرفان حقیقت میں بھی رہنمائی کرتے ہیں۔ یگانہ گفتگو تو ساری صوفیوں ہی کی اصطلاحوں اور محاوروں میں کرتے ہیں اور میر اور آتش کی پیروی میں ان سے اسی کی توقع بھی تھی۔ لیکن،

ان کے ہاں تصوف کی دل گرمی نہیں ملتی ہے۔ ان کا فلسفۂ وحدت الوجود، غیر شخصی، تعقل اور ناآشنائے عشق ہے، جیسا کہ میں شروع میں بھی کہہ چکا ہوں، صوفیہ کے یہاں عشق ہی کشف راز ہستی ہے، کہ عشق عین حقیقت ہے۔ اس کو مسیحیت میں یوں کہا گیا ہے کہ خدا محبت ہے، لیکن یگانہ عشق کو زندگی کا مقصد نہیں بلکہ ایک آلۂ کار تصور کرتے :

عشق ہی عین زندگی تو نہیں
ہاں مگر زندگی کا آلۂ کار

اگر عشق زندگی کا آلۂ کار ہے تو پھر مقصد حیات کیا ہے؟ طاقت؟

کیونکہ عرفان الٰہی اور عشق ایک شے ہے۔ عشق خود ایک قوت ہے جو کائنات میں جاری اور ساری ہے۔ کوئی شخص کائنات میں جاری اور ساری نہیں ہو سکتا ہے وہ اس سے باہر ہوگا۔ اسی لیے اقبال کو فلسفۂ وحدت الوجود کی تشریح میں دشواری حائل ہوئی۔ وہ اس کا فیصلہ نہ کر سکے کہ خدا عشق ہے یا شخص۔ بلکہ اس کے برعکس دونوں کو متحد کیا۔ بہرحال موضوع گفتگو کچھ اور ہے۔ یگانہ عشق سے بیگانہ نظر آتے ہیں :

ایسے دو دل بھی کم ملے ہوں گے
نہ کشاکش ہوئی نہ جیت نہ ہار

عشق کی مدح میں ایک آدھ شعر یار باعی سے اس کی تلافی نہیں ہوتی ہے :

کس دھن میں کوہکن نے تیشہ باندھا
سر پھوڑ کے خود، موت کا آکا باندھا
قدموں سے لپٹ گئی حیات ابدی
کیا عشق کے سر اجل نے سہرا باندھا

جب شاعری عشق سے بیگانہ ہوتی ہے تو وہ فلسفیانہ دانش یا عام انسانی تجربات سے حاصل کی ہوئی دانش اور بینش سے علاقہ رکھتی ہے۔ یگانہ نے اسی کو فلسفہ حیات کی تشریح و تنقید قرار دیا اور یہ لکھا کہ میں نے عشق کی چاشنی، زندگی کے تلخ حقائق کو گوارا بنانے کے لیے استعمال کی ہے۔ زندگی سے متعلق دانش و بینش کی شاعری کا بڑا مقام ہے۔ بشرطیکہ اس شاعری کا دائرہ وسیع ہو اور وہ شاعری گوئٹے اور اقبال کی شاعری جیسی ہو۔ یگانہ کی شاعری کا دائرہ محدود ہے۔ یہ گھومتی ہے، ان کے اپنے تجربات زندگی کے گرد۔ بہ حیثیت ایک فرد ان کی زندگی کا رشتہ کائنات اور خدا سے بھی تھا، اس لیے وجودی ناتے سے انھوں نے خدا اور کائنات کی حقیقت سے بھی گفتگو کی ہے مگر نہ ایسی کہ کسی نئے وجدان کا در کھلتا ہو۔

ان کی شاعری میں ایک ضربت، ایک کاٹ، ایک نکیلا پن اور تیز ابیت ایسی ہے کہ انھیں کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ لیکن اقلیم فکر میں ان کا استحقاق مرتبہ بہت ہی کمزور ہے شاید اس لیے کہ انھوں نے اپنی ساری توجہ کلاسیکی طرز کے کمال فن پر صرف کی اور وہ اسی کے لیے یاد رکھے جائیں گے۔ انھوں نے جو مشن اپنے سامنے رکھا تھا وہ حق گوئی اور شاعری میں تکمیل ہنر کا تھا۔ انھوں نے اپنے ان دونوں عمل سے بہت سے لوگوں کو اپنا دشمن بنایا مگر وہ اپنے مشن میں اتنے ثابت قدم رہے کہ آج میدان انھیں کے ہاتھ ہے۔ وہ کئی ایک جھڑپ میں ہارے ہیں لیکن جنگ جیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے پیچھے جو سرمایۂ کلام چھوڑا ہے وہ ایک روشن خط کی طرح لوگوں کو یہ بتاتا رہے گا کہ شعر اس محنت اور صناعی کے ساتھ بھی کہا جا سکتا ہے اور یہ کہ شعر میں جب تک کوئی دھار نہ ہو اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور دھار رکھنے کے لیے دو متضاد تصورات کو ٹکرانا ہوتا ہے۔

مگر یگانہ آرٹ کی یہی چند خوبیاں نہیں ہیں۔ یگانہ ٹھیٹھ اردو کے بھی شاعر تھے ٹھیٹھ اردو کی شاعری کو اپنے دور میں چمکانے میں وہ دوسروں سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔ ٹھیٹھ اردو، اردو میں دخیل ہندوی الفاظ کے استعمال سے آتی ہے۔ فارسی الفاظ، فارسی ترکیبوں کی مدد سے شعر کہنا نسبتاً آسان ہے کہ ان کا ڈھر اپنا ہوا ہے۔ لیکن ٹھیٹھ اردو میں فارسی کی اضافت کے بغیر جذبات سے مملو اور پہلو دار اشعار کہنا ذرا مشکل کام ہے۔ یہ ہنر میرؔ کو خوب آتا تھا۔ یگانہ نے بھی اس رنگ میں کچھ اچھے اشعار کہے ہیں:

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

بندہ وہ بندہ جو دم نہ مارے
پیاسا کھڑا ہو دریا کنارے
ٹکرا کے دیکھیں تم کیا ہو ہم کیا
جیتے تو جیتے ہارے تو ہارے

اس قسم کے اشعار خاصی تعداد میں ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ یگانہ کے ان اشعار سے دورِ حاضر کے کچھ نوجوان شعرا بھی متاثر ہوتے ہیں لیکن چونکہ یگانہ کا اسلوب ناقابلِ تقلید ہے، اس لیے یگانہ کے رنگ میں غزل کہنا بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے کسی قدر منفی شخصیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یگانہ آرٹ ڈٹنے سے، طنز کے دشنے سے، اور مدح کی تلخی سے پیدا ہوا ہے:

کیوں اجل ! ہے کوئی ایسا جو مرا منہ بھی دے
بات اپنی نہیں بنتی ہے تو اچھا نہ بنے !

اب میں آخر میں کچھ ان کے عارفانہ کلام کے بارے میں کہنا چاہوں گا۔ ان کے عارفانہ کلام میں کوئی ایسی بات تو نہیں ہے جو اسلاف کے عارفانہ کلام میں نہ ملتی ہو۔ انھیں کے افکار کی تکرار ہے، اور بسا اوقات وہ بلندی بھی نہیں جو میرؔ اور غالبؔ، خسروؔ اور رومیؔ کے کلام میں ہے لیکن لطف ان میں ضرور ہے کہ ان کا ایک تعلق ان کی شخصیت سے ہے۔ وہ اشعار رسمی نہیں ہیں بلکہ ان کے وجود کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے۔ ان اشعار میں ان کے اپنے تجربات کی تازگی بھی ملتی ہے :

تڑپ کے آبلہ پا اٹھ کھڑے ہوئے آخر
تلاش یار میں جب کوئی کارواں نکلا

جہاں یہ تلاش و جستجو ہے وہاں یہ جذب کامل بھی ہے :

اے زہے بخت کہ سر تیری امانت کے سوا
نشۂ دولت دنیا سے گراں بار نہیں

یگانہ جو چنگیزی نسل کے باقیات صالحات میں سے تھے اور جن کی ترکی اتر چکی تھی، اس مغلیہ تہذیب کے آخری ناقد تھے جو ان کے زمانے ہی میں دم توڑ چکی تھی۔ ان کا لکھنؤ اب بالکل ہی بدل چکا ہے۔ اب نہ وہ میر صاحب ہیں نہ میرزا ہیں لیکن انہوں نے ایک زبردست مدافعت اس سیل تغیر کے خلاف ... بیش کی جس کی زد میں اکبرؔ بھی بہے جا رہے تھے۔ چنانچہ یگانہ کو یہ بھی کہنا پڑا :

کون ٹھہرے سمے کے دھارے پر
کوہ کیا اور کیا خس و خاشاک

چنانچہ اس کا اثر جا بجا ان کے آخری دور کے کلام میں نظر آتا ہے۔ جہاں وہ "آزادی" "سیاسی آزادی" اور تقدیر کے بدلے تدبیر کی زور آزمائی اپنے اشعار میں پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں" اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابتدائی دور کے یاس جب کہ فلسفہ جبر کا ان پر غلبہ تھا" آخری دور میں بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تاہم کوئی واضح خیر مقدم ان کے یہاں تغیر دیرندان کے کھلنے اور نئی قوتوں کے ابھرنے کا نظر نہیں آتا ہے۔ جو نیا ادب ان کی زندگی ہی میں وجود میں آ گیا تھا" اس کی طرف ان کا بہت ہی ہتک آمیز رویہ تھا :

بہت تیرے نئے ادب کی ایسی تیسی

لیکن جب میں ان کی ساری کمزوریوں اور خوبیوں کو سمیٹتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ یگانہ کی جنگ ہماری جنگ ہے۔ ان کی جنگ اس ماحول کے خلاف تھی جو کردار کی تخلیق سے بانجھ ہو چکا تھا اور جس میں ہنر، فن، شعر و ادب کی کوئی قدر نہ تھی۔ یگانہ کی شاعری ہمت اور جرأت اور فکر کی شاعری ہے۔ ان کا اثاثہ، فکر زیادہ نہ سہی لیکن یہ کیا کم ہے کہ وہ اپنے وجود کی تہہ تک پہنچے اور چند ایک ایسے سوالات اٹھائے جو آج چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ تردید غالب میں غالب کے نقال سہی لیکن اتنی اچھی نقالی بھی کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔ کون سا ایسا سوال ہے، کون سا ایسا خیال ہے جو اُن سے بہتر طور سے غالب کے یہاں نہیں ملتا ہے۔ لیکن ان کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ وہ پہاڑ سے ٹکرائے۔ مجھے ان کی یہ ستیزہ کاری اور گرم رفتاری پسند آئی۔ شاعروں کے بارے میں صرف یہی نہیں سوچنا چاہیے کہ انھوں نے ہمیں کیا دیا بلکہ اس طرح بھی سوچنا چاہیے کہ وہ کیا تھے۔ ایک خاک کا پتلا یا آگ کا بگولا۔ کیا ہی سرکشی اور بانکپن تھا اس جوان میں۔ آتش سے یگانہ کی نسبت بلاوجہ نہ تھی۔ کیا خوب کہا ہے:

عجب کیا ہے ہم ایسے گرم رفتاروں کی ٹھوکر سے
زمانے کے بلند و پست کا ہموار ہو جانا

جو خاک کا پتلا وہی صحرا کا بگولا
مٹنے پہ بھی اک ہستیٔ برباد رہے گا

میرزا یگانہ کی شاعری

از سلیم احمد

یگانہ صاحب کے انتقال پر ایک تعزیتی نوٹ لکھتے ہوئے میں نے ان کی شاعرانہ اہمیت اور قدر و قیمت کے بارے میں بھی اپنے تاثرات قلم بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس موقع پر میں نے لکھا تھا کہ اردو شاعری کی محدود و مختصر دنیا میں بیسویں صدی کے بعض بنیادی مسائل کی تفہیم اور ان کا حسیاتی ادراک یگانہ کے مطالعے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اب کم و بیش چوتھائی صدی کے بعد اپنی اس رائے کو دوبارہ دیکھتے ہوئے میں نے کئی سوالوں پر غور کیا۔ کیا یہ رائے یگانہ کی شاعری کو ان کے دیگر معاصرین اور ان کے بعد آنے والے شعرا کی موجودگی کا احساس کیے بغیر دی گئی تھی یا ان کے تقابل میں بھی اس رائے کی کوئی اہمیت ہے۔ دوسرے لفظوں میں کیا ہم فانی، اصغر، جگر، جوش، فیض، میراجی اور راشد کے باوجود یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی کے جن مسائل کو یگانہ نے چھوا انھیں کسی اور شاعر نے ہاتھ نہیں لگایا۔

یہ سوال یگانہ سے پہلے اقبال اور یگانہ کے بعد فراق کی موجودگی میں اور زیادہ اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ میرے نزدیک چونکہ کسی شاعری کا حقیقی تجزیہ تقابلی مطالعے ہی کے ذریعے ممکن ہے اس لیے یہ سوالات میرے لیے اور زیادہ اہم بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے غور کرتے ہوئے میں نے یگانہ کی شاعری کو از سرِ نو دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یگانہ کے ہاں معاصر زندگی کی جو مخصوص روح کارفرما ہے وہ ہمیں نہ اقبال میں ملتی ہے نہ فراق میں۔ فیض، راشد اور میراجی بیسویں صدی سے زیادہ متاثر ہونے کے باوجود بھی اس کے مرکزی مسائل کو اس طرح نہیں دیکھتے جس طرح یگانہ نے انھیں دیکھا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس زاویے سے انھیں دیکھتے ہوئے مجھے بار بار ان کے معاصرین اور بعد میں آنے والوں کی بجائے غالب کی طرف لوٹنا پڑا۔ غالب اردو کا وہ واحد شاعر ہے جس میں ہمیں وہ روح کارفرما نظر آتی ہے جس کا اظہار بعد میں یگانہ کی شاعری میں ہوتا ہے۔

میں نے اپنے ایک مضمون میں جو یگانہ   کی زندگی میں لکھا گیا تھا اور ماہنامہ ساقی

کے سنڈے کے سالنامے میں شائع ہوا تھا، یگانہ اور غالب کی اس مماثلت پہ روشنی ڈالی تھی اور غالب سے یگانہ کے لاگ اور لگاؤ کو اسی کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اس مضمون کو دوبارہ پڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میں اگر یگانہ پہ دوبارہ بھی کچھ لکھوں تو اس میں چند ضمنی باتوں کے علاوہ بنیادی طور پر کوئی اضافہ نہیں کر سکوں گا۔

ایک بات جو میں بطور خاص کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اردو کی بیشتر شاعری کے مقابلے پر جب ہم یگانہ کو پڑھتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یگانہ کے ہاں وہ فرد جس کی ابتدا غالب کی شاعری میں ہوئی تھی اپنے ارتقا کی کتنی منزلیں طے کر لیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی انسانی زندگی کے مرکزی سوالات اپنی صورت گری کے ایک نئے مرحلے سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ یہ فرد جس کا ذکر میں نے غالب کے حوالے سے کیا ہے ہماری شاعری میں روایتی تہذیب کی شکست و ریخت سے پیدا ہوا اور ہم اپنے زمانے تک آتے آتے اسے اس کے پورے قد و قامت میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ روسو کا وہ انسان ہے جو آزاد پیدا ہوا تھا مگر ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ روسو کے بعد کی پوری تاریخ اس انسان کی آزادی کی تاریخ ہے۔ بیسویں صدی میں ہم اس انسان کو دو مختلف پس منظروں کے درمیان دیکھتے ہیں۔ ایک طرف یہ انسان سرمایہ دارانہ نظام میں قدیم روایات اور تہذیبوں کو توڑتا ہے اور ان کے مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی اوضاع کو مسترد کر کے بالآخر تنہائی، احساسِ مغائرت، مکمل منفیت اور زندگی کی مہملیت سے دوچار ہوتا نظر آتا ہے اور دوسری طرف اشتراکی نظام میں ایک نئی جبریت اور خارجی تنظیم کے ایک نئے دباؤ کا سامنا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

Rousseau

غالب کی شاعری میں ہمیں اس انسان کی چند ایسی جھلکیاں نظر آتی ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ غالب کے تخیل نے اس وقت کس طرح دیکھ لیا تھا جب ہمارے یہاں یہ انسان ابھی تاریخ کی گود ہی میں تھا۔ بعد میں یگانہ ہمیں کئی آگے کی منزلیں دکھاتے نظر آتے ہیں اور جن چیزوں کو ہم غالب کے ہاں چند اشاروں کی صورت میں دیکھتے ہیں وہ یگانہ کے ہاں تفصیلی رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ غالب اور یگانہ دونوں کے ہاں یہ انسان مروجہ مذہبی، اخلاقی، اور تہذیبی اقدار سے لڑنے اور ان کی صداقت کو از سر نو دریافت کرنے کے عمل میں مبتلا نظر آتا ہے۔ غالب اور یگانہ دونوں کے ہاں صداقت کا آخری معیار ان کا ذاتی تجربہ ہے اور دونوں اپنی انا کے ذریعے اپنے وجود کو حقیقت کے مقابل رکھ کر دیکھنے اور ان کے ذریعے ایک نئے انکار اور نئے اثبات کی بنیاد رکھتے نظر آتے ہیں۔

غالب کے یہاں اقدار کی تخریب اور نفی کا عمل اتنا زیادہ نمایاں نہیں ہے جتنا یگانہ کے

ہاں ہے۔ اس کے علاوہ آخر آخر غالب تعمیر کی نئی بنیادوں تک بھی پہنچ جاتا ہے جبکہ یگانہ تخریب کے مرحلے ہی میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ساری باتیں اختصار لیکن وضاحت کے ساتھ آپ کو اس مضمون میں مل جائیں گی جو میرے اس نوٹ کے ساتھ ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

آخر میں صرف ایک بات اور کہوں گا کہ میرے نزدیک جدید شاعری اگر بیسویں صدی کی حقیقی روح کو جذب کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتی ہے تو اسے یگانہ اور غالب کو اپنی روح میں اتارنا پڑے گا اور تخریب کے اس زہر کو پینا پڑے گا جس کو رومانی جذبات پرستی نے ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔

O

یگانہ صاحب کو ان کی خود پرستی نے مشہور کم کیا اور بدنام زیادہ۔ یہ خود پرستی آیات وجدانی کے دیباچہ نگار کے بیان کے مطابق اہل لکھنؤ کے بے جا غرور، کم نظری اور حسد شعاری کی پیدا کردہ ہے۔ لیکن ہمیں ان کی شاعرانہ شخصیت کے متعلق بیرونی شواہد کی تلاش میں زیادہ وقت صرف نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ضروری نہیں ہے کہ ایک فن کار اپنی تخلیقات میں بھی ہوبہو وہی موجود ہو جو اپنی عام زندگی میں نظر آتا ہے۔ فن کار کی عام شخصیت، اپنی عام زندگی میں جو تجربات کرتی ہے، فن کار کا تخیل اسے کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ یگانہ صاحب کی ذاتی خود پرستی اور ان کی شاعرانہ خود پرستی دو الگ الگ چیزیں ہیں، اور ان دونوں کی الگ الگ قدر و قیمت ہے۔ کوئلے اور ہیرے دونوں میں اصل جزو کاربن ڈائی آکسائڈ کا ہوتا ہے، کہیں کوئلے کو کوئلہ کہا جاتا ہے اور ہیرے کو ہیرا۔ ممکن ہے کہ یگانہ صاحب کی ذاتی خود پرستی کی مذمت کے لیے مختلف جواز تلاش کرنے کی ضرورت پڑے۔ لیکن ان کی شاعرانہ خود پرستی کسی جواز کی محتاج نہیں۔ اس لیے کہ اسی خود پرستی نے یگانہ صاحب کو ان شاعروں کی فہرست میں شامل کر دیا ہے جو حسن، حقیقت اور ضمیر کے مروجہ تصورات کو قبول نہ کر کے نئے جہانِ اقدار کی تلاش میں نکلتے ہیں یا کم از کم مروجہ اقدار کے ناقابل اطمینان ہونے کا اعلان کر کے ان کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے نئے جہانِ اقدار کو ڈھونڈ نکالنے کے کام میں آسانیاں فراہم کر جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے یگانہ صاحب مزاجاً "غالبی" ہیں، کیونکہ اردو شاعری میں یگانہ صاحب سے پہلے غالب واحد شخصیت ہے، جس نے مروجہ اقدار سے بغاوت کی، اور حسن، ضمیر اور صداقت کے متعلق نئے تصورات کی تخلیق کی کوشش کی اور میرے خیال میں غالب کے متعلق یگانہ صاحب کے حریفانہ رویے کی

وجہ بھی یہی ہے۔ وہ اپنے تجربات اور غالبؔ کے تجربات میں تو مطابقت دیکھتے ہیں لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ غالبؔ ان تجربات کے فنکارانہ اظہار میں ان کے برابر نہیں، یا کم از کم غالبؔ اور ان کی حیثیت مساوی ہے۔

صلح کر لو یگانہؔ غالبؔ سے وہ بھی استاد تم بھی اک استاد

"آیاتِ وجدانی کے دیباچے میں یگانہ صاحب کی غالب شکنی کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا گیا ہے کہ غالب کے مرتبے سے نا آشنا لوگ جھوٹ موٹ غالبؔ کی تعریفیں کیا کرتے ہیں اور خواہ مخواہ آتشؔ پر منہ آیا کرتے ہیں، اور حالانکہ یگانہ صاحب غالبؔ کے بھی معتقد تھے، مگر وہ آتشؔ کے فدائیوں میں ہیں۔ اس لیے مقامی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ "غالب کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے"۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس بیان سے یگانہ صاحب کہاں تک متفق ہیں اور غالب شکنی کا جواز فراہم کرنے میں ان کا استدلال کیا ہے۔ مگر مجھے اس بیان کے قبول کرنے سے بوجوہ انکار ہے۔ اولاً یہ کوئی انصاف نہیں ہے کہ نافہم غالبؔ پرستوں کی حرکات کی سزا غالبؔ کو ملے۔ دوسرے اس بیان سے غالبؔ کے متعلق یگانہ صاحب کے اس ذاتی حریفانہ رویے پر کچھ روشنی نہیں پڑتی جس کا اظہار انھوں نے یوں کیا ہے:

غالبؔ اور میرزا یگانہؔ کا آج کیا فیصلہ کرے کوئی

اور تیسری وجہ تو اتنی اہم ہے کہ اگر یگانہؔ صاحب خود اس بیان کی بااصرار تصدیق کریں تو بھی میں اسے تسلیم کرنے سے انکار ہی کرتا رہوں گا، یہ ہے کہ اس بیان سے یگانہؔ صاحب کے مزاج کے متعلق ہمیں بجز اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ زیادہ سے زیادہ "خدائی فوج دار" بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ یگانہؔ صاحب کی شاعرانہ ذہنیت پر اس مسئلے کا جس طرح اثر پڑا ہے اور وہ جس طرح اپنی شاعری میں بار بار غالبؔ اور اپنے موازنے کی طرف لوٹ آتے ہیں، وہ کم از کم اصل کا تو اظہار کرتا ہی ہے کہ غالبؔ سے ان کی لاگ سطحی اور صرف بیرونی واقعات کی پیداکردہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق خود ان کی اپنی شاعرانہ شخصیت سے بہت گہرا ہے۔ آگے چل کر میں دکھاؤں گا کہ اپنے مزاج اور تجربات کے لحاظ سے وہ غالبؔ کے کتنے مشابہ ہیں۔

غالبؔ کے علاوہ، اردو کے دوسرے شاعر اور وہ بھی وہ شاعر، جو چند محسوسات یا جذبات کی عکاسی یا ان کی مختلف صورتوں کے بیان میں الجھ کر نہیں رہ جاتے، بلکہ انسانی زندگی کو بحیثیت مجموعی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، انفرادیت و اجتماعیت کی کشمکش میں باوجود اپنی تمام محرومیوں، ناکامیوں اور مایوسیوں کے مروجہ اقدار سے بغاوت اور حسن، ضمیر اور صداقت کے ان وسیع تر تصورات کی تلاش نہیں کرتے جو فرد و جماعت کی کشمکش کو یقیناً کم کر سکیں، بلکہ بالعموم

مرکھپ کر، اپنی ذات ہی کو، مروجہ اقدار سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے یہاں وہ "تخریبی جذبہ" نہیں ملتا جو عمارت کی کہنگی اور خامی کو دیکھ کر، اس کی بنیاد کو ویران کر دینے کے خیال کی طرف لے جاتا ہے۔ غالب اس تخریبی جذبے کے پہلے شاعر ہیں، ان کے تجربات نے انھیں مروجہ اقدار کے ناقابل قبول ہونے کا یقین دلا دیا ہے اور وہ ہر وقت اس بنیادی مسئلے سے الجھتے رہتے ہیں کہ اس بکھری ہوئی منتشر اور بعض اوقات تکلیف دہ حد تک بے معنی زندگی میں ان کی اپنی ذات کی کیا حیثیت ہے، اور زندگی کی تنظیم کس طرح کی جاسکتی ہے، اور اس میں کس طرح "معنی" پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ وہ تنہا صرف و محض اپنی شخصیت اور اس کے تجربات کے بل بوتے پر ان مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان کے یہاں ہر چیز کی قدر و قیمت کو پرکھنے کی واحد کسوٹی ان کی اپنی ذات اور ان کے اپنے تاثرات ہی رہ جاتے ہیں۔

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

یگانہ صاحب کے یہاں بھی یہی تخریبی جذبہ عمل کرتا نظر آتا ہے۔ وہ بھی غالب کی طرح مروجہ اقدار سے بغاوت کرتے ہیں۔ اور اس بغاوت کے تمام پہلوؤں کی جھلکیاں ہمیں ان کی شاعری میں دکھائی دیتی ہیں۔ غالب کے مقابلے میں ان کے تجربات محدود ضرور ہیں، (جس کے متعلق میں آگے چل کر بحث کروں گا) مگر اپنے تجربات کے متعلق ان کا بیان، غالب سے زیادہ مکمل اور منظم ہے۔ وہ اپنے تجربات کی کسی کڑی کو چھوڑتے نہیں۔ ہم اگر غالب کے ذہنی سفر کی تمام منزلوں کو بیان کرنا چاہیں تو ہمیں ان کی شاعری کے باہر دوسرے شواہد بھی ڈھونڈنے پڑیں گے۔ لیکن یگانہ صاحب کے یہاں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی اور ہمیں ان کی شاعری میں ہر اس منزل کی جھلک مل جائے گی جو ان کی گزرگاہ بن چکی ہے۔ اس سلسلے میں غزلوں کے مختلف اشعار کے علاوہ، ان کی ایک مثلث کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس میں انھوں نے اپنے ذہنی تجربات کا تقریباً مکمل اظہار کر دیا ہے:

امید و بیم میں کٹتے تو کیا مزا شباب کا — ہوائے دہر دیتی ہے پیام انقلاب کا
الٹ نہ جائے ناگہاں ورق مری کتاب کا

کسی کی کیا مجال ہے جو چرخِ پیر سے لڑے — امنڈ رہا ہے ابرِ غم نہ جانے کب برس پڑے
دُھندھا ہوا ہے چار سمت بادل انقلاب کا

ہوائے تندِ دل جلوں کے دل کو ڈھونڈتی ہے کیا — قفس پہ میرے بے دھڑک یہ برق کوندتی ہے کیا
چلے گا بے دلوں سے کچھ نہ زور اضطراب کا

نہ مبتدا کی کچھ خبر، نہ کچھ خبر کا مبتدا   دلِ شکستہ گم ہوا تو پھر کہاں کا سلسلہ

یہی ورق نکل گیا تو مول کیا کتاب کا

نگاہِ تشنہ کام میں حرام بھی حلال ہے   نہ کوئی امر ممتنع نہ کوئی شے محال ہے

فریب مجھ سے پوچھیے کرشمۂ سراب کا

پکارنے سے کام ہے پکارتا ہوں بار بار   دیارِ حسن میں ہو یاس کیوں کسی کی امیدوار

جواب بے صواب یا جواب باصواب کا

اس مثلث میں چھ بند ہیں، اور ہر بند میں بظاہر الگ الگ مضمون ہے۔ لیکن ان مضامین کو حرکت کی ایک رَو ایک دوسرے سے منسلک کیے ہوئے ہے، اس حرکت کو یگانہ صاحب نے مثلث کی تکنیک استعمال کرکے ظاہر کیا ہے، جس میں ہر شعر اپنی جگہ مکمل نہیں ہوتا، بلکہ ایک تیسرے مصرعے کی مدد سے اپنا سلسلہ دوسرے شعر سے ملا دیتا ہے۔ مثلث کی تکنیک کے استعمال کے علاوہ یگانہ صاحب نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ اپنے تجربات کو ترتیب وار بیان کریں تاکہ ان کی بے ترتیبی، ان کے خیال کی حرکت کو منقطع نہ کر دے۔ پہلے بند میں انہوں نے جذبۂ تشکیک کا اظہار کیا ہے جو اپنی ابتدائی صورت میں اپنی زندگی سے بے اطمینانی کا شخصی تجربہ ہے۔ دوسرے بند میں یہ شخصی تجربہ عمومیت حاصل کر لیتا ہے یعنی وہ بحیثیت مجموعی زندگی میں فن کے معدوم ہو جانے کا اظہار کرتے ہیں اور یہ دکھاتے ہیں کہ کسی میں یہ ہمت باقی نہیں رہی ہے کہ زندگی کو اپنے لیے سازگار بنا سکے۔ تیسرے بند میں اس زندگی کے خارجی عمل کے مہلک اثرات سے اپنی ذات کو بچانے کی کوشش کا اظہار کرتے ہیں، جو ان کی خود اعتمادی اور اپنی قوت کے احساس کی پیدا کردہ ہے۔ چوتھا بند اس کوشش میں ناکام ہو جانے اور شکست کھا جانے کا آئینہ دار ہے۔ پانچویں بند میں اس شکست کے اثرات کی تفصیل ہے، یعنی مقابلہ کرنے والے کی زندگی کی ہر قدر حتیٰ کہ خیر و شر کے تصورات سے بھی بیزاری۔ چھٹے بند میں وہ مروجہ اقدار سے مایوس ہو کر نئے تصورات و اقدار کی تخلیق کی ایک ایسی کوشش کی ابتدا کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کامیابی یا ناکامی کے تصورات سے بلند ہے۔

میرے خیال میں یہ مثلث ان کے تجربات کے بیان میں اتنی مکمل ہے کہ اگر ہم یگانہ صاحب کی شاعری کو کیفیات کے اعتبار سے مختلف حصوں میں بانٹیں تو اس مثلث کا ایک ایک بند ایک ایک حصے کے عنوان کا کام دے گا۔ اس مختصر سے مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ میں ان کے کلام کے اقتباسات سے اس دعوے کا ثبوت دے سکوں، مگر جس شخص نے بھی یگانہ صاحب

کے کلام کو مجموعی حیثیت سے پڑھا ہوگا، اس کے لیے یہ بیان ناقابلِ قبول نہ ہوگا ——

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یگانہ صاحب غالب کی طرح تخریبی جذبے کے شاعر ہیں۔ وہ مروجہ اقدار سے بغاوت کرتے ہیں، اس بغاوت کی اصل حقیقت کو دیکھنا ہو تو ان اشعار کو نہ دیکھیے جن کا طمطراق ان کے قاری کی توجہ کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے کہ اسے دوسری طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ یہ اشعار اس لحاظ سے دلچسپ ہوں تو ہوں کہ ان میں اس یگانہ کی، جو اپنی عام زندگی میں لوگوں کے عام تصور کے مطابق اپنی "اکڑفوں" کی وجہ سے بدنام ہے، کوئی جھلک نظر آجاتی ہو، ورنہ ان اشعار نے ان کی شاعرانہ بغاوت کی اصل اہمیت کو چھپایا ہی ہے ظاہر نہیں کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

کون دیتا ہے ساتھ مردوں کا ... حوصلہ ہے تو باندھ ٹانگ سے ٹانگ

اندھیرے اجالے کہیں تو ملیں گے ... وطن سے ہمیں دربدر کرنے والے

علاجِ اہلِ حسد زہر خندۂ مردانہ ... ہنسی ہنسی میں تو ان احمقوں کو ڈستا جا

جو زہر کھائیں تو پہلے کھلائیں دشمن کو ... اکیلے کھائیں گے ایسے تو ہم گنوار نہیں

عدو کیا زہر دیتا ہے ہم ایسے تشنہ کاموں کو ... لہو کا گھونٹ اُتر جاتا ہے یاں تیر و تبر ہو کر

گریباں میں منہ ڈال کر خود تو دیکھیں ... بُرائی یہ میری نظر کرنے والے

کوئی شبہ نہیں کہ یہ اور اس قسم کے اور دوسرے اشعار، جو یگانہ صاحب کا ذکر آتے ہی لوگوں کی زبان پر آجاتے ہیں، یگانہ صاحب کی عام شخصیت کی ترجمانی کے باعث دلچسپ ہیں، لیکن اگر یگانہ صاحب کا کلام، اسی قسم کے اشعار کا مجموعہ ہوتا تو میں غالباً یہ مضمون نہ لکھتا کیونکہ ان اشعار کا تیور، ان کا کڑاپن اور کھراپن باوجود اپنے نئے پن کے، میرے لیے وہ اپیل نہیں رکھتا جو ان کے ان اشعار میں ہے، جن میں انہوں نے بعض ایسے تصورات و جذبات کو بیان کر دیا ہے۔ جن کو زبان سے سنانے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی۔

سلامت آپ کا یہ حسنِ لازوال مگر ... ہم آج ہی کے ہیں کل کے امیدوار نہیں

حسن کافر گناہ کا پیاسا ... بے گناہوں کو سالنے والا

مجال تھی کوئی دیکھے تمہیں نظر بھر کر ... یہ کیا ہے آج بڑے ہو چلے ہو کیونکر

سمجھ کا پھیر ہے یا وقت کا تقاضا ہے ... وہی برے نظر آنے لگے بھلے کیوں کر

اگر تھا کسی کی ملاقات کرکری کیوں ہو ... کھلے تو عشق کھلے دل لگی کھلے کیوں کر

گھل گئے جیسے موم کی مریم ... کیوں بڑھایا تھا دل جلوں سے تپاک

دیکھیے عشق میں نبھے کیوں کر ... آپ نازک مزاج ہم بے باک

بدل نہ جائے زمانے کے ساتھ نیت بھی ۔۔۔ سُنا تو ہوگا جوانی کا اعتبار نہیں
تو کیا ہمیں ہیں گنہگارِ حسنِ یار نہیں ۔۔۔ لگاوٹوں کا گنا ہوں میں کیا شمار نہیں

یہ اشعار یقیناً عشقیہ اشعار نہیں، مگر "حسن" اور "عشق" کے تصورات کے متعلق یہ بے باکانہ رویہ اپنے اندر ایک گہری معنویت رکھتا ہے۔ اردو غزل میں حسن، عشق اور وفا وغیرہ کے الفاظ، اپنے لغوی معنوں میں استعمال نہیں ہوتے، بلکہ ایک تہذیب کی چند مستقل اقدار کا علامتی اظہار کرتے ہیں اور جب کوئی شاعر حسن سے اپنے مستقل لگاؤ، اپنے عشق کی پائداری اور اپنی وفا شعاری کا تذکرہ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے ہیں کہ وہ کسی مرد یا عورت سے ہمیشہ تعلقات رکھنے کا بیان کرتا ہے، بلکہ ان تصورات و اقدار سے جو ایک تہذیب کی مرکزی روح کے ترجمان ہوتے ہیں، چنانچہ ان اشعار میں یگانہ صاحب ہرگز اپنے محبوب سے مخاطب نہیں ہیں، بلکہ یہ اشعار صرف اس امر کا اشارہ ہیں کہ شاعر بڑی سے بڑی تہذیبی قدر سے روگردانی کر رہا ہے۔ ان کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے جس میں وہ ضمیر کی آواز پر دھیان دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں، کیونکہ وہ خود انہیں اقدار کا تخلیق کردہ ہے جن سے وہ خود منکر ہو چکے ہیں۔

چارۂ پشیمانی، خوش دلی و خوش کامی ۔۔۔ توبہ اندر یا کاراں خندہ ہا زتن تنہا

آیاتِ وجدانی کے حاشیے میں اس شعر کے متعلق لکھنے والے نے لکھا ہے کہ اس شعر میں مصنف نے اہلِ مغرب کے دستور العمل کی تائید کی ہے کہ جذبۂ پشیمانی کا بہترین فیصلہ خوش دلی و خوش کامی ہے اور اس امر پر افسوس بھی کیا ہے کہ مصنف نے اس شعر میں اپنے اصولِ زندگی کے خلاف بات کہی ہے۔ مگر دراصل یہ شعر ہی ان کی بغاوت کی ایک منزل ہے، جہاں پہنچ کر ان کے یہاں زندگی کے خارجی عمل سے ان کی ذات پر ہونے والے اثرات اور خود ان کے عمل سے پیدا ہونے والے نتائج کے متعلق خیر یا شر ہونے کا فیصلہ کسی خارجی یا اجتماعی اصول کے ماتحت نہیں ہوتا بلکہ صرف ان کی اپنی حاصل کردہ لذت یا الم کے لحاظ سے، کیونکہ زندگی کی مروجہ اقدار سے بغاوت کر کے خیر و شر کو پرکھنے کے لیے ان کے پاس آخری کسوٹی، ان کی اپنی ہی ذات رہ جاتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

منم کہ آئینۂ حق نما برائے خودم ۔۔۔ منم کہ مشتریِ جنس بے بہائے خودم
منم کہ چارہ گر و درد آشنائے خودم ۔۔۔ منم کہ دردِ خدا دادم و دوائے خودم
منم کہ سر نمی آرم بہ سجدۂ ناحق ۔۔۔ منم کہ در رہِ حق محوِ نقشِ پائے خودم
منم کہ منتظرِ انقلاب می باشم ۔۔۔ منم کہ سلسلہ جنبانِ غم برائے خودم
منم کہ منزلِ مقصود زیرِ پا دارم ۔۔۔ شکستہ پایم و تاہم بہ مدعائے خودم

قدم زنگنہ خود چہ می نہم بیروں	گدائے خاک نشینم ولے گدائے خودم
ہزار فتنہ بپا گشت و من خبر نشدم	ہزار کوہ شد از جا و من بجائے خودم

میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ یگانہ صاحب اپنے تجربات کی مکمل ترجمانی کرتے ہیں، مگر یگانہ صاحب کی بغاوت کی تمام منزلوں کی ترجمانی مکمل نہ ہوتی، اگر ہمیں ان کے کلام میں اس شکست کی عکاسی نہ ملتی، جو اس باغیانہ دوڑ دھوپ کے نتیجے کے طور پر فرد کو حاصل ہوتی ہے۔ فرد اپنے ماحول سے بغاوت کر کے، اس کی تمام اقدار کو توڑ پھوڑ سکتا ہے، مگر خود بھی تھکن اور اضمحلال کے اثرات سے بچ نہیں سکتا۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے، جہاں فنکار زندگی کے ابتدائی تعلقات کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ زندگی کے لیے نئی معنوی اقدار کی تخلیق اگر ہو سکتی ہے تو عام انسانی زندگی کو قبول کر کے ہی ہو سکتی ہے۔ ایک فرد اپنی ذات کے بل بوتے پر اس کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ یگانہ صاحب اس منزل تک نہیں پہنچتے ہیں، وہ تھکن اور اضمحلال کو تو محسوس کرتے ہیں مگر اپنی خود پرستی کے اس مغالطے سے جو ان کے ذہنی سفر کے لیے ابتدا میں تو ضروری تھا، لیکن جب اس منزل پہ آکر حقیقت کے ایک نئے تصور سے ٹکرا کر، اس لیے ٹوٹ جانا چاہیے تھا کہ واقعی ان کا نیا "جہانِ انداز" پیدا ہو سکے، ان کی فطرت میں اتنا راسخ ہو چکا ہے کہ وہ اسے شکست ہوتے نہیں دیکھ سکتے اور اسی لیے آخر آخر ان کی شاعری، ایک ایسے فرد کی شاعری بن جاتی ہے، جس نے اپنی ذات پر پردے لٹکائے ہوں اور اس میں اتنی جرأت نہ ہو کہ ان پردوں کو ہٹا کر دنیا کو دیکھنے دے کہ ان تجربات کے بعد اس شخص پر کیا گزری ہے۔ وہ اپنی انا، اپنی خوئے خود پرستی اور خود دلری کے اظہار کے سلسلے میں انتہائی محتاط ہو جاتے ہیں اور نتیجۃً ہمارے لیے آخر میں چند ایسے اشعار ہی چھوڑتے ہیں جن سے خواہ ہم ان کی تھکن اور شکست کا اندازہ لگالیں، لیکن اس سے زیادہ اور کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔

مڑ کے دیکھا نہ گلستان کی طرف	خون ہو ہو کے دل میں رہ گئی ہے یاد
کون دیتا ہے دادِ ناکامی	خونِ فرہاد بر سرِ فرہاد
ہر صبح ہوئی شام کو اک خواب فراموش	دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں	یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

یہاں پہنچ کر یگانہ صاحب غالب سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ وہ غالب کی طرح اپنی شخصیت کو زندگی کے دوسرے عناصر کے تقابل میں رکھ کر دیکھنے کی تاب نہیں لاتے اور آنکھیں بند کر کے اپنے "بڑک پن" سے متعلق ہانکنے لگتے ہیں۔ اس بات کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اپنی زندگی میں واقعی طور پر اپنی خودی کو شکست ہونے نہیں دیا۔ کیونکہ ہمارے لیے یہ انکشاف

اہمیت نہیں رکھتا کہ وہ کتنے خوددار ہیں بلکہ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایک ایسے فرد پر جس کے مزاج کی تشکیل بہترین اخلاقی اقدار اور زندگی کی اعلیٰ ترین روایات سے ہو' اجتماعی زندگی میں کیا گزرتی ہے۔ بالفاظ دیگر ہم شاعر وادیب سے یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں دکھائے کہ حسن، ضمیر اور صداقت کے لیے اجتماعی زندگی میں کیا کیا امکانات ہیں اور اجتماعی زندگی کا تجربہ فرد کو کدھر لے جاتا ہے؟ اور اس کے اثرات فرد پر کیا کیا مرتب ہوتے ہیں اور فرد ان اثرات کو کس طرح اجتماعی زندگی کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ لیکن یہ کام اتنا بڑا ہے کہ بغیر ایک متوازی اور حقیقت آگیں تصور زندگی کے انجام نہیں دیا جا سکتا اور یگانہ صاحب کی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے باغیانہ تجربات کے دوران اپنی شخصیت کے حسن کی ایک آدھ جھلک دیکھ کر ہی اتنے ہی مسحور ہو گئے ہیں کہ اس طلسم سے نکلنا نہیں چاہتے۔ برخلاف اس کے غالبؔ باوصف اپنی تمام خود پرستی کے اس حقیقت کی عکاسی کر دیتے ہیں (خواہ اس سے انھیں کتنا ہی دکھ کیوں نہ پہنچتا ہو) کہ زندگی کے بعض عناصر کے مقابلے میں ان کی شخصیت بہت چھوٹی ہے۔ حتیٰ کہ آخر میں تو وہ یہ تک تسلیم کر لیتے ہیں کہ زندگی کا حسن معنوی (یہ ان کے یہ ان کے تصورات اور آدرشوں کا ایک نام ہے) اور جلوہ صورت (یعنی زندگی جس صورت میں موجود ہے اور عام لوگ اسے جس طرح دیکھتے ہیں) مساوی حیثیت رکھتے ہیں:

گر بہ معنی نہ رسی، جلوہ صورت چہ کم است

یگانہ صاحب نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا:

بُرا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا ۔۔۔ کبھی گم راہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا

اور:

ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر ۔۔۔ ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا

مگر اس منزل پر آکر، ان کا پائے سرکش تھک جاتا ہے اور ان کا سفینہ' ان کی ذاتی خود پرستی کے ساحل کی طرف لوٹ آتا ہے اور وہ اس گرداب تک نہیں پہنچ پاتے جہاں فنکار سے تنکے کا سہارا، یعنی اس کی ذاتی پسند بھی چھن جاتی ہے اور وہ اپنی شخصیت پر بھی عمل تخریب کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ویسے ان کے یہاں ایک آدھ شعر اس قسم کا تو مل جائے گا جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ کبھی کبھی خیر کا ایک خارجی اصول وضع کرنے کی کوشش میں اپنی ذاتی لذت سے آزاد ہو جانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ناکام رہ جاتے ہیں اور نتیجۃً اس لذت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے:

حلال بھی مرے حق میں حرام واویلا ۔۔۔ نگاہِ شوق سے کیا کیا گل و ثمر گزرے

مگر یہ ان کے مزاج کی کوئی مستقل کیفیت نہیں ہے اور ان کی شاعری کی آواز پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتی ہے ورنہ ان کے لب ولہجہ میں وہ تیقن نہ پیدا ہوتا جو اُن کے ان اشعار کو بھی، جن کا موضوع تشکیک ہے، کیفیت کے اعتبار سے بہت بڑی حد تک جامد بنا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ ہمیں بعض اوقات یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ صرف و محض خیال بندی کر رہے ہیں۔ پتا نہیں میں اپنے خیال کی وضاحت میں کامیاب بھی ہو سکا ہوں یا نہیں ؟ میرا مقصود یہ کہنا ہے کہ یگانہ صاحب کے جذبۂ تخریب کا عمل ان کی ذات پر کبھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی شخصیت کو کبھی شک کی نظر سے نہیں دیکھتے اور اپنے ذاتی معیاروں کے متعلق ابتدا ہی سے اتنے پر یقین ہیں کہ اس نے ان کی شاعری کے لہجے سے وہ لچک چھین لی ہے جو ہر فنکار کے یہاں ایک مخصوص جذبے کی عکاسی کے وقت وہی انداز اختیار کر لیتی ہے جو اس جذبے کے اظہار کے لیے ضروری ہو چنانچہ وہ جب کبھی اس قماش کے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرتے ہیں جو تشکیکی ہوں یا بالواسطہ تشکیک سے متعلق ہوں تو ان کا لب ولہجہ اس کے عین برعکس کیفیت کا حامل ہوتا ہے جو ان کے ایسے اشعار کی اصل کیفیت کو زائل کر دیتا ہے۔

مگر میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر ان کی خود پرستی کی کیفیت نہ ہوتی، اور وہ اپنی اور صرف اپنی شخصیت کے بل بوتے پر زندگی کے خارجی عمل سے پیدا ہونے والے ہر قسم کے تاثر کی مزاحمت کرنے کی کوشش نہ کرتے رہتے تو شاید لکھنؤ کی فضا اور اس کے انحطاطی اثرات ہم سے اس منفرد آواز کے شاعر کو چھین لیتے جس کی آواز دور سے پہچانی جاتی ہے، کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ یگانہ صاحب کی آواز کا کڑا پن، اس کے تیور، اس کی تیزی اور کھرا پن ان کی لامحدود خود پرستی کا ہی پیدا کردہ ہے۔

یگانہ کی زبان

دِلّی اُجڑ رہی تھی، فیض آباد اور اس کے بعد لکھنؤ بس رہا تھا۔ اہلِ کمال، اہلِ فن اور اہلِ علم و ادب کشاں کشاں وہاں پہنچ رہے تھے۔ جب لکھنؤ پائے مستقر بنا تو اسے بارونق اور پرکشش بنانے، آراستہ کرنے، مرکزِ علم و ادب کا درجہ دینے، فنونِ لطیفہ کو حسن و تازگی بخشنے میں اہلِ دہلی کا کتنا دخل ہے یہ تاریخ کا ایک کھلا باب ہے جسے ہر ذی شعور پڑھ کر پرکھ سکتا ہے۔ مشہور اساتذۂ فن پر نظر ڈال لیجے تو معلوم ہوگا کہ ابتدائی دور کا ہر صاحبِ فن دہلی یا مضافاتِ دہلی سے متعلق ہے۔ اہل دہلی کی اس کثیر تعداد نے پورب والوں کی آنکھوں کو خیرہ کیا اور وہ ہر چیز کو حیرت سے دیکھنے اور خوشہ چینی کرنے لگے۔

لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کا دور نواب آصف الدولہ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے، اس سے پہلے کی تہذیب و ثقافت کے آثار ناپید ہیں۔ اگر کچھ ہیں بھی تو وہ علاقائی رنگ کے ہیں اور جو اس علاقے میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ بلکہ لکھنؤ اس دور سے پہلے اپنے وجودی آثار کی بنا پر بہت ہی معمولی حیثیت کا حامل تھا اسے کسی طرح کی اہمیت حاصل نہ تھی۔ دارالسلطنت بن جانے کی وجہ سے اوّل تو دہلی سے وزیرِ سلطنت کے ہمراہ اس کا سارا کارخانہ منتقل ہوا۔ اس انتقال آبادی نے پہلے فیض آباد اور پھر لکھنؤ کو متاثر کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ پورب کے شہریوں نے بھی ادھر کا رُخ کیا۔ ذہنی صلاحیتوں اور علم و فن کی وجہ سے اہلِ دہلی کو برتری اور فوقیت حاصل تھی۔ علاقائی حضرات نفسیاتی طور پر احساسِ کمتری میں مبتلا ہوئے۔ ازالے کے لیے انھوں نے تحصیلِ علم و فن میں کوشش کی۔ ہر قسم کے ہنر حاصل کرنے لگے، لیکن بنیادی طور پر دہلی مکتب ہی سے منسلک رہے۔ اپنی برتری اور فوقیت جتانے کے لیے انھوں نے اختراعات کی طرف توجہ مبذول کی، کہیں وہ کامیاب رہے اور کہیں اختراعات کے شوق کا دھارا انھیں دُور بہالے گیا اور اس میں انھیں ناکامی کا مُنھ دیکھنا پڑا، بلکہ بعض جگہ نہایت بھونڈی مثالیں بھی نظر آتی ہیں۔

اہلِ لکھنؤ نے خطّاطی، نقّاشی، فنونِ سپہ گری، فنِ تعمیر و آرائش میں دلّی مکتب کی پیروی کی اور اس میں ترقی کے نمایاں آثار نظر آتے ہیں۔ ان فنون میں ان کی اضافی اختراعات قابلِ ستائش ہیں۔ یہ تفصیل کا موقع نہیں ورنہ بتایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کیا کیا اضافہ کیا اور کیسی کیسی اختراعات کیں۔

مذکورہ علوم وفنون ایسے ہیں کہ جن میں اہلِ دہلی و لکھنؤ میں کوئی خاص آویزش نمایاں نہیں ہوئی، البتہ زبان، شعروادب میں ایک خاص آویزش اور جذبۂ مسابقت نظر آتا ہے۔ ہُوا یہ کہ جب اہلِ دہلی فصیح زبان بولتے ہوئے سرزمینِ اودھ میں داخل ہوئے تو اودھی یا پوربی بولنے والے اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اہلِ دہلی اتنی کثیر تعداد میں پہنچے کہ ان کی زبان و بیان نے وہاں کے رہنے والوں کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کی پیروی کریں اور زبان ان سے سیکھیں۔

زبان وادب میں دو پہلو بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اول حسنِ بیان، محاورہ و روزمرہ اور تراکیب وغیرہ۔ دوسرے نفسِ مضمون، علوئے تخیل، اندازِ بیان، اظہارِ جذبات و خیالات و کیفیات۔ پہلے پہلو کا تعلق کسب و ریاضت سے ہے، اور دُوسرے پہلو کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"۔ اہلِ لکھنؤ نے تحصیلِ زبان میں سر توڑ کوشش کی۔ زبان آ گئی لیکن وہ کیفیت جو اہلِ دہلی کا طرۂ امتیاز تھا، وہ حاصل نہ ہو سکی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گھروں میں اودھی کا چلن تھا، قصبات و دیہات میں بھی اودھی راج کر رہی تھی۔ اس وجہ سے غیر شعوری طور پر لکھنؤ کی زبان پر اودھی کی چھاپ پڑ رہی تھی اور اس سے پیچھا چھڑانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ زبان جب اہلِ دہلی سُنتے تو ان پر اعتراض کرتے۔ اودھی یعنی وہاں کی علاقائی زبان کی اس غیر شعوری رو نے اہلِ دہلی کو بھی کسی حد تک متاثر کیا۔ میر انیس جو برسرِ مجلس یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ "صاحبو! یہ میرے گھر کی زبان ہے حضراتِ لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے"۔ وہ بھی اس علاقائی تاثر سے نہیں بچ سکے۔ بطور مثال ان کا بہت ہی مشہور شعر پیش کیا جاتا ہے:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

قریب قریب ہر نقاد نے اس کی تعریف کی ہے۔ فی الحقیقت شعر حسنِ تخیل، بندشِ الفاظ اور اثر آفرینی کا حامل ہے لیکن زبان کے لحاظ سے اردو محاورے کے خلاف ہے۔ "اوس کھانا" اردو محاورہ نہیں ہے۔ انیس نے یہاں غور نہیں کیا اور وہ غیر شعوری طور پر 'اودھی' سے متاثر ہو کر لکھ گئے۔ اودھ اور بہار میں 'پانی' اور 'دُودھ' کے ساتھ 'کھانا' بولتے ہیں اور یہ فارسی کا اثر ہے کہ 'شیر خوردن' 'آب خوردن' کا ترجمہ 'دودھ کھانا اور پانی کھانا' کر لیا۔ اور یہ اثر اہلِ دہلی کے پہنچنے سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ 'اوس' بھی 'پانی' سے متعلق ہے، اسی لیے انیس اس کے ساتھ 'کھانا' استعمال کر گئے۔ ورنہ اگر وہ غور کرتے تو مصرع میں بڑی آسانی سے تبدیلی کر سکتے تھے۔ انیس ایک اعتراض سے بچنے کے لیے اس غلطی کے مرتکب ہوئے۔ یعنی اگر وہ یہ لکھتے کہ "پڑنے سے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا" تو 'اوس پڑنا' ایک تو روزمرہ ہے اور دُوسری صورت میں یہ

محاورہ ہے جس کے معنی کے پیش نظر غالباً انیس نے احتراز کیا۔ حالانکہ محاوراتی استعمال سے اس میں میرے نزدیک اور بھی زیادہ معنویت تھی۔ بہر حال اگر وہ بدلنے کی شعوری کوشش کرتے تو "گرنے سے اوس" یا "شبنم پڑی تو" یا "شبنم نے دھویا" یا سب سے بہتر صورت یہ ہو سکتی تھی "شبنم سے دھل کے اور بھی سبزہ ہرا ہوا" یہ حقیقت سے زیادہ قریب ہے کیونکہ سبزہ و اشجار دھلنے سے نکھر جاتے ہیں۔ یہ امور اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ جب انیس جیسا محتاط شاعر علاقائی اثر سے نہ بچ سکا تو اس علاقے والے کیسے بچ سکتے تھے، جبکہ اُن کے گھروں میں آدھی اودھی اور آدھی اردو مروج تھی اور آج بھی ہے۔

جب دہلی سے آئے ہوئے اساتذہ اللہ کو پیارے ہو گئے تو لکھنؤ والوں نے اردو کو ایک نیا روپ دینا شروع کیا اور اپنی زبان دانی کو چھپا کر اہلِ زبان ہونے کا دعویٰ کر دیا اور زبان کو سادگی کے زیور سے محروم کر کے ترصیع کاری شروع کر دی۔ نثر میں اس کا سلسلہ آپ نو طرز مرصع سے شروع کر سکتے ہیں، لیکن اس کے بعد میر امن کی "باغ و بہار" سے خار کھا کر مرزا رجب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" لکھ کر دہلی اور لکھنؤ کے لسانی نزاع کو فروغ دیا۔ اب اہلِ لکھنؤ نے زبان میں فارسی و عربی الفاظ کے بے دریغ استعمال کو درجۂ فصاحت و ثقاہت دیا۔ اور ایسے محاورات و تراکیب بنانے لگے جو اہلِ دہلی اور دوسرے لوگوں کے لیے قابلِ قبول نہ تھیں لیکن دہلی اجڑ چکی تھی، لکھنؤ آباد تھا اور ایک طباعتی مرکز بھی بن گیا تھا، اس لیے ان کی زبان کا چلن عام ہونے لگا اور جو حضرات کتابوں سے تحصیلِ زبان کرتے تھے وہ اس سے خاصے متاثر ہوئے۔

شاعری میں میر و سودا، انشاء، مصحفی، آتش و ناسخ جیسے اساتذۂ فن کے بعد لکھنؤ کی شاعری میں وارداتِ قلبی، کیفیاتِ حسن و عشق اور درد و غم کی کسک کی جگہ، معاملہ بندی، لوازمات زیب و زینت اور ظاہری ٹیپ ٹاپ نے لے لی اور ایسی شاعری ہونے لگی جو لکھنؤ کی تکلف آمیز اور بناوٹی یا نام و نمود کی زندگی کی عکاس تھی۔ گو اس دور میں بھی بعض اچھے شاعروں نے اس روش سے احتراز کی کوشش کی لیکن وہ کلیۃً نہ بچ سکے۔

جب اس دور کی شاعری پر ہر طرف سے لے دے ہوئی اور یورپی علوم و فنون کی درآمد سے شعور کو بیداری اور ایک انگیخت حاصل ہوئی حالی نے اپنے مقدمۂ شعر و شاعری کے ذریعے ایسے کلام کو ہدفِ ملامت بنایا تو لکھنؤ میں بھی ایک گروہ نے ترقی کی طرف قدم اٹھایا اور خود کو غالب کا پیرو ظاہر کر کے کچھ تبدیلی پیدا کی، لیکن لسانی عصبیت نے شدت اختیار کر لی اور اب دہلی کی مخالفت ترک کر کے ان حضرات کو نشانہ بنانا شروع کر دیا جو لکھنؤ کے نہیں تھے بلکہ لکھنؤ میں آ بسے تھے یا لکھنؤ کے قریبی علاقوں میں اپنے اجتہاد یا سعی بلیغ سے اردو شاعری کو فروغ دے رہے تھے

اور خود نامور بن رہے تھے۔ ان میں شادؔ عظیم آبادی اور یاسؔ یگانہ چنگیزی سرِ فہرست ہیں۔

یگانہؔ عظیم آباد کے رہنے والے تھے مگر لکھنؤ آبسے تھے۔ اہلِ لکھنؤ نے ان کو بیرونی کہہ کر ان کی برتری یا ہمسری سے انکار کیا۔ اہلِ لکھنؤ کے جذباتِ حسد ان کے کلام کے انوکھے پن اور تخیل کی بلندی کی وجہ سے بھڑکے۔ وہ عظیم آباد کے رہنے والے کی برتری کو برداشت نہ کر سکے۔ ان کی اس جبلت کا پس منظر ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔

جب کوئی ذہین وطباع ہستی اپنے فن کو اہم خیال کرتے ہوئے پیش کرتی ہے تو اس کی یہ توقع بالکل بجا ہوتی ہے کہ اس کے فن کو سراہا جائے گا اور بجا طور پر داد دی جائے گی۔ لیکن اکثر ہوتا یہ ہے کہ فن کو سراہنے اور داد دینے کے بجائے اس سے رشک وحسد کیا جانے لگتا ہے اور اس جذبے کے تحت اس کے فن کو کمتر اور اسقام سے پُر کہا جانے لگتا ہے۔ اس پر طعنہ زنی کی جاتی ہے اور نت نئی باتیں اس سے منسوب کر کے اس کے گرد احساسِ کمتری کے جال بنے جاتے ہیں۔ ذہین آدمی جب اس ماحول میں جذبات سے بالاتر ہو کر عقلِ سلیم کی روشنی میں حالات کا جائزہ لیتا ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچ جاتا ہے تو اس میں شعورِ برتری بیدار ہو کر جذبۂ احساسِ کمتری کے حصار سے نکل کر خود کو ایک نئی منزل سے آشنا کرتا ہے۔ یہ منزل ایک کشمکش اور آویزش سے تعبیر ہے جس میں شعورِ برتری اردگرد پھیلے ہوئے شعورِ کمتری کے جال توڑنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ یہ کشمکش اور آویزش اگر راہِ مستقیم اختیار کر لیتی ہے تو پھر عروج و اوج حاصل ہو جاتا ہے اور فن کمال کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔ لیکن اگر یہ جادۂ اعتدال سے ہٹ کر رشک وحسد کے ردِ عمل اور اس کی تردید پر اُتر آئے تو پھر اس کی ذہانت وطباعی کا دھارا کسی اور طرف مڑ کر ضد اور ہٹ دھرمی اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ نرگسیت کے جذبے کا شکار ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کی ذہانت اور طباعی کا جوہر اپنا عکس ضرور ڈالتا ہے۔ گو وہ نقشِ ناتمام کی صورت ہی میں ہو۔

یاسؔ یگانہ بھی اسی نفسیاتی دور سے گزرے ہیں ان کو اہلِ لکھنؤ نے ان تمام کیفیات سے دوچار کیا اور انھوں نے ردِ عمل کے طور پر کچھ ایسی باتیں کیں کہ وہ شعورِ برتری سے دوچار ہونے کے باوجود شعورِ کمتری کے ازالے میں کامیاب نہ ہو سکے اور ان کی ذات "غالب شکن" کے نام سے شہرت پا گئی۔ حالانکہ وہ غالب کی عظمت کے معترف تھے لیکن اس اعتراف کے اظہار کا انداز منفی ہو گیا۔ یعنی ان کے دور میں جو حضرات غالب فہمی اور تقلیدِ غالب کے مدعی تھے وہ یگانہ کے نزدیک نہ غالب فہم تھے اور نہ مقلدِ غالب۔ یگانہ نے ان کے اس دعوے کے ردّ میں غالب ہی کو نشانہ بنا لیا۔

اصل بات وہی ہے کہ اہلِ لکھنؤ نے ان کو اپنا ہمسر نہ گردانا اور یگانہ نے ردِ عمل کے طور پر اساتذۂ لکھنؤ کے ساتھ ساتھ غالبؔ کو بھی نشانہ بنا لیا۔ ان کا پہلا معرکہ

عزیز لکھنوی سے ہوا جب انھوں نے اپنے اُوپر کیے گئے چند اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے عزیز لکھنوی کے ایک قصیدے پر اعتراضات کیے۔ یگانہ کے اعتراضات عزیز پر بالکل درست ہیں جو میرٹھ کے رسالے "نظارہ" میں شائع ہوئے تھے۔

یہ درست ہے کہ اہلِ لکھنؤ نے خود کو اہلِ زبان تسلیم کرا لیا تھا اور اس میں جتنا دخل لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنے والے لوگوں کا تھا خود اہلِ لکھنؤ کا نہیں تھا۔ اور جو چند مسلم الثبوت اساتذہ تھے وہ سب انھی آنے والوں سے فیض یافتہ تھے۔ یگانہ بھی یہی کہتے تھے کہ اگر تم مجھ کو بیرونی کہتے ہو تو ان کو بھی بیرونی کہو جن کے فیض سے تم اہلِ زبان بنے ہو۔ لکھنؤ کو مستند تو ان لوگوں نے بنایا تم نے نہیں۔ یگانہ کی یہی بات لکھنؤ والوں کو کھلتی تھی اور وہ یگانہ کی مخالفت اسی بنا پر کرتے تھے۔

یگانہ ذہین وطباع تھے۔ زبان کے معاملے میں وہ اُحتیاط برتتے تھے۔ محاورے اور روزمرہ کی پابندی بھی ان کے ہاں ملتی ہے۔ وہ ایک معتدل زبان لکھتے تھے۔ ایسے الفاظ بھی استعمال کرتے تھے جنھیں اہلِ لکھنؤ استعمال کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس طویل تمہیدی پس منظر کے بعد اب ہم یگانہ کی مذکورہ لسانی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کی کچھ کوشش کرتے ہیں:

۱۔ محاورہ

یگانہ نے اپنے کلام میں محاورے اچھے خاصے استعمال کیے ہیں۔ ان کا استعمال اچھا، برمحل اور لطف سے خالی نہیں ہے۔ ہم یہاں ہر طرح کے استعمال کی چند مثالوں پر اکتفا کریں گے اور حسبِ موقع وضاحت بھی کر دیں گے۔

"محاورہ" اسم اور فعل کا ایسا مرکب ہے کہ جس میں اسم یا فعل اپنے لغوی معنیٰ کے علاوہ کسی مجازی معنیٰ میں استعمال ہوا ہو۔ گویا محاورے کے دونوں جزوں میں سے کسی ایک جز کا مجازی معنیٰ میں استعمال ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی ایسے مرکب کے دونوں جز لغوی معنیٰ میں استعمال ہوں گے تو وہ محاورہ نہیں ہوگا۔ مثلاً "پانی پینا" محاورہ نہیں ہے، کیونکہ 'پانی' اور 'پینا' دونوں اپنے اصلی معنیٰ میں استعمال ہوئے ہیں، لیکن "لہو کے گھونٹ پینا" محاورہ ہے کہ اس میں 'لہو کے گھونٹ' مجازی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح "غم کھانا" محاورہ ہے، کیونکہ اس میں 'کھانا' اصلی نہیں بلکہ مجازی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

اگر بہ نظرِ تعمق یگانہ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یگانہ کا کلام محاورات سے بھرا پڑا ہے۔ سرسری جائزے کا ماحصل یہ ہے کہ تقریباً نوّے فیصد اشعار میں محاورے پائے جاتے ہیں اور بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ جن میں دو دو تین تین محاورے استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن استعمال کی یہ کثرت اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یگانہ نے عمداً ایسا کیا ہے، بلکہ کلام دیکھنے سے یہ بات ظاہر

ملوق ہے کہ یگانہ نے زبان کو اہمیت دی ہے اور محاورات کے صحیح اور برمحل استعمال کی اچھی مثالیں قائم کی ہیں یہ سب کچھ برجستگی اور اظہار مفہوم کے لیے ضرورت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔

یگانہ کے کلام سے جو امثلہ محاوروں کے سلسلے میں پیش کی جارہی ہیں، انھیں ہم نے چند بڑے عنوانات پر تقسیم کر دیا ہے۔ اگرچہ محاورات اپنی ساخت اور معنویت کے لحاظ سے متعدد اقسام پر مبنی ہیں لیکن اختصار کے مدنظر ہم یہ عنوانات قائم کر رہے ہیں: (الف) عام محاورات (ب) واقعاتی یا تجرباتی محاورے (ج) اختراعی محاورے (د) ترمیمی محاورے (ہ) ترجمہ۔

عام محاوروں کے ذیل میں ہم وہ تمام محاورے درج کر رہے ہیں جو کسی واقعے یا تجربے پر نہیں بلکہ معنوی حیثیت کی بنا پر محاورے ہیں۔

پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا
خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے آنہ گیا

اس میں "آڑے آنا" محاورہ ہے۔ معنوی حیثیت سے استعمال صحیح ہے مگر لطف زبان کے لحاظ سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ اس سے بہتر استعمال ان شعروں میں ملتا ہے:

شعلہ و پروانہ کی وہ جنگ باہم دیکھ کر — انتقام قدرت خاموش آڑے آگیا
فانوس آڑے آگیا، تقدیر دیکھنا — پروانے کر چکے تھے سر انجام خودکشی

کم سے کم ایک نیند سو لینا تھا — مخمور مے شراب ہو لینا تھا
بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لینا تھا — دامان ہوس کہیں بھگو لینا تھا

اس رباعی میں "بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا" اچھا نظم کیا ہے۔ اسی طرح ذیل کی رباعی میں "بیل منڈھے چڑھنا" نظم کیا ہے، اگرچہ انداز منفی ہے مگر خوب ہے۔

گھٹنے کے سوا عمر رواں کیا بڑھتی — پیری کی ہوس ہزار منتر پڑھتی
مرجھائی ہوئی بیل منڈھے کیا چڑھتی — جھونکے ہیں فنا کے کیا پنپتا کوئی

کانوں میں آرہی ہے کیا دور تک ڈھول کی صدا
خواب نظر فریب نے سر تو نہیں پھرا دیا
ایک سے بڑھ کے ایک ہے واہ رے لطفِ زندگی
تحفۂ نوش و نیش نے خوب مزہ چکھا دیا
حسن کی آنکھیں کھل گئیں اس میں برائی کیا ہوئی
رشتۂ سیاہ کار سے پردہ اگر اٹھا دیا

ان اشعار میں "سر پھرانا"، "مزہ چکھانا"، "آنکھیں کھلنا"، "پردہ اٹھانا" محاورے نظم ہوئے ہیں۔ ان کا

استعمال روشِ عام سے ہٹ کر بھی ہے اور مطابق بھی، بادی النظر میں دونوں باتیں متضاد محسوس ہوں گی لیکن بنظرِ تعمق دیکھنے سے حقیقت واضح ہو جائے گی۔

میں نے پہلے لکھا تھا کہ بعض شعر ایسے ہیں جن میں دو یا دو سے زیادہ محاورے پائے جاتے ہیں:

نہا لیتے گنگا بکھیڑا تھا پاک	گناہوں کو زمزم سے دھویا تو کیا
تمہیں بھی مزا اس کا چکھنا پڑا	یگانہ کو ہاتھوں سے کھویا تو کیا

پہلے شعر میں "گنگا نہا لینا، بکھیڑا پاک ہونا، گناہ دھونا" تین محاورے نظم ہوئے ہیں اور کوئی اوپری نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے شعر میں "مزا چکھنا، ہاتھوں سے کھونا" دو محاورے ہیں اور برمحل ہیں۔

شربت کا گھونٹ جان کے پیتا ہوں خونِ دل
غم کھاتے کھاتے مُنھ کا مزا تک بگڑ گیا
کس سادگی سے مَیں نے بڑھایا تھا دستِ شوق
ہتھے سے بد مزاج یکایک اُکھڑ گیا

ان اشعار میں بھی محاوروں کے استعمال کا یہی حال ہے۔ پہلے میں "خونِ دل پینا، غم کھانا، مُنھ کا مزہ بگڑنا" تین محاورے اور دوسرے میں "دستِ شوق بڑھانا، ہتھے سے اکھڑنا" دو محاورے نظم کیے گئے ہیں، استعمال بے ساختہ اور آورد سے خالی ہے۔

پھر جوشِ غضب کو تھام لیتے ہی بنی	پھر چشمِ کرم سے کام لیتے ہی بنی
مُنھ سے تو نہ پھوٹے آپ ماشاءاللہ	آنکھوں سے مگر سلام لیتے ہی بنی

اس رباعی کے دوسرے شعر میں "مُنھ سے پھوٹنا، سلام لینا" دو محاورے ہیں۔

اپنے ہی سائے سے بھڑکتے ہو	ایسی وحشت پہ کیوں نہ آئے پیار
آئینے کا سامنا کرے گا کیوں کر	اپنے سائے سے جو بھڑکتا جائے

ان دونوں شعروں میں "اپنے سائے سے بھڑکنا" اچھا نظم کیا ہے، خاص کر دوسرے شعر میں۔

لہو لگا کے شہیدوں میں ہو گئے داخل
ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا
زمانہ پھر گیا چلنے لگی ہوا اُلٹی
چمن کو آگ لگا کر جو باغباں نکلا
دکھایا گورِ سکندر نے بڑھ کے آئینہ
جو سر اٹھا کے کوئی زیرِ آسماں نکلا

پہلے شعر میں "لہو لگا کے شہیدوں میں داخل ہونا، ہوس نکلنا، حوصلہ نکلنا" تین محاورے، دوسرے شعر میں "زمانہ پھرنا، الٹی ہوا چلنا" دو محاورے، تیسرے شعر میں "آئینہ دکھانا، سر اٹھانا" دو محاورے نظم ہوئے ہیں۔ ان پر حرف گیری نہیں کی جا سکتی، لیکن "سر اٹھا کے نکلنا" ضرور غور طلب ہے، کیونکہ متداول روپ "سر اٹھا کے چلنا" ہے۔ یگانہ نے اس میں تصرف کیا ہے اور یہ ایسا تصرف ہے جو گوارا کیا جا سکتا ہے۔

خراب ہو چلی زندانِ آب و گِل کی ہوا　　اب ایک سانس بھی لینا محال ہوتا ہے
بہارِ عمرِ گزشتہ پہ بھیجیے صلواۃ　　خزاں میں ذکرِ خزاں حسبِ حال ہوتا ہے

ان شعروں میں "ہوا خراب ہونا، سانس لینا، صلواۃ بھیجنا" محاورے استعمال کیے گئے ہیں۔ درج ذیل شعروں میں "نشہ چڑھنا، بھنگ چڑھنا" کا استعمال قابلِ غور ہے:

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا　　خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا
ہائے یہ بہکی بہکی باتیں کیوں؟　　کیا کوئی بھنگ چڑھ گئی سرکار

پہلے شعر میں "آپ میں رہنا، خدا بننا" بھی استعمال ہوئے ہیں۔ یہ مختصر سا جائزہ سادہ محاوروں کا پیش کیا گیا۔ یگانہ نے اتنے محاورے استعمال کیے ہیں کہ ان کا احصا باعثِ طوالت ہوگا۔ ہم صرف ایک مختصر سی فہرست ایسے محاورات کی اور پیش کر رہے ہیں جنھیں یگانہ کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے:

وقت کٹنا، جادو کرنا، پالا پڑنا، باگ اٹھانا، انگڑائی لینا، پھیر میں پڑنا، کان بجنا، خون ہلکا ہونا، پچھاڑے کھانا، ہاتھ ملنا، ٹکٹکی بندھنا، دم فنا ہونا، آوازے کسنا، شرط باندھ کے سونا، پاؤں توڑ کے بیٹھنا، موج میں آنا، پہلو دبانا، راہ کھوٹی کرنا، آپ سے باہر ہونا، آگ برسانا، ہاتھ دھونا، حاشیے چڑھانا، میدان ہاتھ رہنا، بھوک پیاس جانا، کرکری ہونا، ٹانگ اڑانا، ٹانگ سے ٹانگ باندھنا، نام باجنا، بھرم کھلنا، اپنے پیراہن میں مست ہونا، بیگار میں پکڑا جانا، پھانسی لگانا، مار پڑنا، کان کھلنا، بیڑا پار ہونا، مت پلٹنا، ماتھا ٹھنکنا، پرچہ لگنا، گھر بیٹھنا، ہاتھ لانا، دنیا گول ہونا، خدا لگتی کہنا، رال ٹپکنا، آئی کو ٹالنا، ڈھیّی دینا، ڈانڈا ملنا، آگ بگولا ہونا، مردہ بھاری ہونا، الٹا سبق پڑھنا، پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دینا، گھر پھونکنا، ہوا کھانا، استخارہ کرنا، کنارہ کرنا، دل سے لگنا، خیرباد کہنا، باز آنا، لگن لگنا، ہاتھ آنا، ہوا پلٹنا، منھ تکنا، دم بھرنا، دل بہلانا، غم غلط کرنا، منھ موڑنا، ہمت ہارنا، مُردے کو کاندھا دینا، آگ میں کودنا، چال چلنا، جان پر کھیلنا، مشکل گانا، پروان چڑھنا، پھیر پڑنا، نیت بھرنا، پتے کی کہنا، سر چڑھانا، بھیس بدلنا، روپ دھارنا، سر اٹھانا،

کافور ہونا۔

یہ فہرست اور بھی طویل ہو سکتی ہے۔ اب ہم ایسے چند محاوروں کا استعمال پیش کرتے ہیں، جن میں کسی واقعے یا تجربے کا عنصر شامل نظر آتا ہے۔

نہا لیتے گنگا بکھیڑا تھا پاک　　گناہوں کو زمزم سے دھویا تو کیا

اس میں ہندوؤں کے اس عقیدے کا پرتو ہے کہ گنگا میں نہا لینے سے تمام گناہ دُھل جاتے ہیں اور آدمی پوتر ہو جاتا ہے۔

اسیرو! شوق آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

"چادر سے باہر پاؤں پھیلانا" نظم ہوا ہے اگرچہ "چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا" زیادہ مستعمل ہے۔

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے تدبیر دیکھنا
منزل قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا

اس میں "پاؤں توڑ کے بیٹھنا" کا استعمال برمحل اور اچھا ہے۔

لہو لگا کے شہیدوں میں ہو گئے داخل
ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا

"لہو لگا کے شہیدوں میں داخل ہونا" محاورے کی جگہ "انگلی کٹا کے شہیدوں میں شامل ہونا" بھی مستعمل ہے اور اس کا استعمال نسبتاً زیادہ ہے۔

اپنے ہی سائے سے بھڑکتے ہو　　ایسی وحشت پہ کیوں نہ آئے پیار

"اپنے سائے سے بھڑکنا" محاورہ ہے اور "بھڑکنا" کی جگہ "بدکنا" بھی مستعمل ہے۔ مگر اس جگہ "بھڑکنا" ہی زیادہ موزوں ہے۔

عمر گھٹنے کے لیے ہے وقت کٹنے کے لیے
مفت دن گننے کو ہم پکڑے گئے بیگار میں

"بیگار میں پکڑا جانا" یہاں یہ محاورہ ایک بلیغ استعارہ ہے دنیا میں زندگی بسر کرنے سے متعلق، ویسے دنیا میں کوئی شخص شاید ہی ایسا ملے جو کسی نہ کسی بیگار میں نہ پکڑا گیا ہو۔

مفلس کو مزہ زیست کا چکھنے نہ دیا　　اس نقد شباب کو پرکھنے نہ دیا
دنیا سے لپٹتے تو لپٹتے کیونکر　　پٹھے پہ کبھی ہاتھ تو رکھنے نہ دیا

"پٹھے پہ ہاتھ نہ رکھنے دینا" کا استعمال خوب ہے۔ ساتھ ہی مزہ چکھنا، دنیا سے لپٹنا، نقد کو پرکھنا کا استعمال بھی پُرلطف ہے۔

فلک نے بھول بھلیوں میں ڈال رکھا تھا
ہم ان کو ڈھونڈتے یا اپنی جستجو کرتے

اس شعر کا لطف وہی لے سکتا ہے جسے بھول بھلیوں کا تجربہ ہو اور وہ بھول بھلیوں میں نکلنے کا راستہ تلاش کرتا رہا ہو۔

کون دیتا ہے ساتھ مردوں کا   حوصلہ ہے تو باندھ ٹانگ سے ٹانگ

"ٹانگ سے ٹانگ باندھنا" ساتھ دینے کے لیے مستعمل ہے اور ایک کھیل پر مبنی ہے۔ یگانہ کے کلام میں ایسے محاورے خاصی تعداد میں ہیں ہم نے چند تحریر کر دیے ہیں۔ آخر میں ایک رباعی دیکھیے:

لڑتے ہی نظر پینگ بڑھا لیتا ہے   اُلٹا سیدھا سبق پڑھا لیتا ہے
دل کی گھاتوں کو سنگدل کیا سمجھیں   دو باتوں میں داؤں پر چڑھا لیتا ہے

اس میں نظر لڑنا، پینگ بڑھانا، الٹا سیدھا سبق پڑھانا، داؤ پر چڑھانا، چار محاورے نظم ہوئے ہیں۔ یہ مشاہدے، تجربے اور داخلی واردات پر مبنی ہیں۔

اب ہم ایسے محاورات پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جن میں یگانہ نے شاہراہ عام سے ہٹ کر اختراع و ترمیم کی کوشش کی ہے۔

آپ سے باہر چلے ہو ڈھونڈنے   آہ پہلا ہی قدم جھوٹا پڑا

اردو میں "ہاتھ جھوٹا پڑنا" محاورہ ہے "قدم جھوٹا پڑنا" نہیں ہے۔ یہ یگانہ کی اختراع ہے۔ آپ چاہیں تو اسے قبول کریں، مگر "جھوٹا" کا یہ استعمال محلِ نظر ہے۔ یہاں "غلط"، "اوچھا"، "بےجا"، "بےمحل" جیسے الفاظ استعمال ہوتے تو بہتر تھا۔

بندۂ خودشناس ہے اپنے ہی پیرہن میں مست
بوئے خودی کو دخل کیا پیشگہِ ایاز میں

اس شعر میں "اپنے پیرہن میں مست ہونا" نظم کیا گیا ہے۔ یہ یگانہ کا تصرف ہے۔ اردو میں "اپنی کملی میں مست ہونا" یا "اپنی ہی کھال میں مست ہونا" ہے۔ "مست" کی جگہ "مگن" بھی استعمال ہوتا ہے۔ یگانہ نے 'کھال' اور 'کملی' کو 'پیرہن' سے بدل کر کوئی معنوی یا زبانی خوبی پیدا نہیں کی۔

پالا امید وبیم سے ناگاہ پڑ گیا   دل کا بنا بنایا گھروندا بگڑ گیا

اردو میں "گھر بگڑنا" محاورہ ہے "گھروندا بگڑنا" نہیں۔ یہ بھی یگانہ کی جدت طرازی و اختراع ہی تصور کی جائے گی۔

منھ زوریوں کا حوصلہ سرکارِ حسن سے   آخر پڑی وہ مار کہ چرسا ادھڑ گیا

اردو میں "چرسا اُدھڑنا" محاورہ نہیں ہے، بلکہ چمڑی اُدھڑنا، تسمے اڑنا، کھال اُدھڑنا، محاورے ہیں

اور "چرسا" اس لیے بھی درست نہیں کہ اردو میں "چرس اور چرسا" چمڑے کے اس بڑے ڈول کو کہتے ہیں جو کنوئیں سے آب پاشی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

پہلے تو آپ اپنے کو پہچانتے نہ تھے حسن یگانہ کس کی نگاہوں میں تڑ گیا

"نگاہوں میں تڑنا" یعنی چہ؟ ملاحظہ فرمائیے، یہ "نگاہوں میں تاڑنا" کی لازم شکل ہے، اردو میں "نگاہوں نے تاڑا یا تاڑ لیا" استعمال ہوتا ہے۔ اول تو "تڑنا" مزاج زبان کے منافی ہے۔ دوسرے صوتی اعتبار سے نہایت کرخت اور ثقیل ہے۔ اس سے احتراز بہتر ہے۔ یگانہ نے اسے ایک اور جگہ بھی نظم کیا ہے:

پٹم کیوں نہ ہو جائے مانگے کی آنکھ کہ عینک سے دھاگا پرو دیا تو کیا

"عینک سے دھاگا پرونا" نگاہ کی کمزوری کے لیے اچھا محاورہ ہے۔

حرارہ لا چکا تھا حسن، بکھیے خیریت گزری
مجھے ٹھنڈا سمجھ کر جوش کا کافور ہو جانا

اس میں "حرارہ لانا" گرمی پیدا کرنے کے لیے نیا اور اچھا محاورہ لکھا ہے۔ یگانہ کے کلام میں اس قسم کے اختراعی، تحریفی، ترمیمی اور جدت پسندی کے حامل اور بھی محاورے ہیں۔

اردو میں ابتدائی دور سے فارسی محاورات کے ترجموں کا رواج چلا آرہا ہے۔ یگانہ کے کلام میں بھی اس قسم کے محاورات ملتے ہیں۔

سمجھ میں آئی نہ زندان شش جہت کی کشش
کہ پاؤں رکھنے کی جا ہے نہ بھاگ جانے کی

اس شعر میں "نہ پائے رفتن و نہ جائے ماندن" کا ترجمہ کیا گیا ہے، اگرچہ ذرا سا بدلا ہوا ہے۔

مجھ سے معنی شناس پر جادو حسن صورت حرام کیا کرتا

یہاں "سحر کردن" کا ترجمہ "جادو کرنا" ہے۔

تماشا ہے مری تصویر کا بیکار ہو جانا
قلم کے زخم کھا کر پیکر خونبار ہو جانا

"زخم کھانا" ترجمہ ہے "زخم خوردن" کا۔

تلاش کرنے پر اس قسم کے محاورے یگانہ کے کلام میں اور بھی مل سکتے ہیں۔

ہم نے یگانہ کے کلام میں محاوروں کے استعمال پر ایک نظر ڈالی۔ اب ہم ضرب الامثال یعنی کہاوتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ یگانہ کے کلام میں محاوروں کی طرح کہاوتیں زیادہ نہیں ہیں چند کہاوتیں پائی جاتی ہیں۔ ان کہاوتوں میں اردو کی کہاوتیں بھی اور بعض علاقائی بھی، بعض میں تصرف اور

تغیر و تبدل کا عمل بھی پایا جاتا ہے جسے آپ یگانہ کی طباعی و ذہانت بھی قرار دے سکتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے

دنیا میں رہ کے راست بازی کب تک — مشکل ہے، کچھ آساں نہیں بید ملا سک
سچ بول کے کیا حسینؔ بننا ہے تجھے — اتنا سچ بول، دال میں جیسے نمک

اس رباعی میں یگانہ نے "دال میں جیسے نمک" بطور کہاوت نظم کیا ہے۔ اردو میں "آٹے میں جیسے نمک، جیسے آٹے میں نمک، آٹے میں نمک برابر، جتنا آٹے میں نمک" مستعمل ہے۔ کیونکہ "آٹا اور نمک" لازم و ملزوم نہیں۔ اس کا مطلب "بہت تھوڑا، کم سے کم" ہے اور عموماً آٹے میں نمک ڈالنا ضروری نہیں ہوتا۔ اگر ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے تو بہت تھوڑا سا ملاتے ہیں۔ اس کے برخلاف دال میں نمک ڈالے بغیر نہیں پکاتے۔ اس لیے دال اور نمک لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ اس کا مفہوم "بہت تھوڑا یا کم سے کم" متعین نہیں ہو سکتا۔ یہ علاقائی اثر ہے کہ بہار میں "آٹے میں نمک" کی جگہ "دال میں نمک" استعمال کرتے ہیں۔ "دال میں نمک" اردو نہیں ہے، یگانہ نے اپنے علاقے کی کہاوت لکھی ہے۔ اگر وہ چاہتے تو "آٹے میں جیسے نمک" نظم کر سکتے تھے اور کوئی قباحت بھی پیش نہ آتی۔

کھٹکا لگا نہ ہو تو مزہ کیا گناہ کا
لذت ہی اور ہوتی ہے چوری کے مال میں

اصل کہاوت "چوری کا گڑ میٹھا" ہے "چوری کا مال" نہیں ہے۔ لیکن "چوری کا گڑ میٹھا" کے معنی و مطلب "مفت کا مال سب کو پیارا" ہوتا ہے، جو یہاں منطبق نہیں ہوتا۔ اس لیے اب سوچنا ہے کہ یہاں کیا ہونا چاہیے؟ جب غور کیا تو ہمارے سامنے ایک اور کہاوت آئی "چوری کے پھل مزیدار یا لذیذ ہوتے ہیں"۔ یگانہ نے اس میں تصرف کر کے "چوری کا مال" قافیے کی مجبوری کی وجہ سے لکھا ہے لذت کا تعلق پھل سے ہے مال سے نہیں۔

چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے — میں کہاں ہار ماننے والا ہوں

اس میں "چت بھی اپنی، پٹ بھی اپنی" صحیح نظم کیا گیا ہے۔ اس کہاوت کا تیسرا جزء "انٹا اپنے باپ دادا کا" بھی ہے۔ "اپنی" کی جگہ "میری، ہماری" بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ کہاوت چوپڑ کے کھیل سے بنی ہے۔

جاگتے کو جگائے کون ایسے کو گدگدائے کون
لیجیے آ گئی ہنسی دیکھیے وہ جگا دیا

شعر میں "جاگتے کو کون جگائے" نظم ہوا ہے، اس کا مفہوم "بن کر سونے والے کو جگانا مشکل ہے، سوتے کو جگانا مشکل نہیں" ہے۔ کیونکہ جو فی الحقیقت سویا ہوتا ہے وہ جگانے پر جاگ جاتا ہے۔ لیکن جو جاگتا ہو اور سوتا بن جائے اس کو لاکھ جگایئے نہیں جاگتا۔

انگور کھٹے ہوں خواہ میٹھے　　بے دسترس کی طعنہ زنی کیا

کہاوت "انگور کھٹے ہیں" جس کا مطلب عدمِ حصول پر کھسیانا ہوکر برائی کرنا ہے۔ مفہوم کے لحاظ سے کہاوت صحیح نظم ہوئی ہے لیکن اس کو بدل دیا گیا ہے۔

یک جان اور دو قالب ہوں گے تو دو ہی ہوں گے
دو ہیں جو تیسرا ہے آنکھوں کا ٹھیکرا ہے

کہاوت "دو ہیں تیسرا، آنکھوں کا ٹھیکرا" ہے۔ یعنی اجنبی مخلِ صحبت ہوتا ہے۔ صحیح نظم کیا گیا ہے۔ پیرایہ بھی اچھا ہے۔

اپنی ڈفلی اپنا راگ، اپنی دوڑ اپنی بھاگ
کہنے میں بات آتی ہے، سردار نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ کہاوت "اپنی ڈفلی اپنا راگ" عدمِ اتحاد، سب کی باتیں یا عمل ایک دوسرے سے الگ الگ ہونے کے متعلق ہے۔ یہ کہاوت "اپنی اور اپنا" کی تکرار کے ساتھ بھی مستعمل ہے۔ اس میں "اپنی اپنی بھاگ دوڑ" کہاوت بھی اسی مفہوم کو ادا کرتی ہے۔

شیخ کی کون سی ہے کل سیدھی　　ارے جو بات ہے سو اُوٹ پٹانگ

کہاوت "کون سی کل سیدھی ہے" یعنی کسی بات میں ڈھنگ نہیں، ہر بات بے ڈھنگی ہے، کو ٹھیک طور پر نظم کیا ہے۔

فلسفی کو خبر نہیں اپنی　　آنکھ کے آگے ناک سوجھے خاک

"آنکھ کے آگے ناک یا ناتھ، سُوجھے کیا خاک" کہاوت کا مفہوم "سامنے کی چیز بھی نظر نہیں آتی" کو اچھی طرح نظم کیا ہے۔

ہوتا ہے بند ایک در کھلتے ہیں صد ہزار در
اپنی طرف سے شک نہ کر نیتِ کارساز میں

اصل کہاوت "ایک در بند تو ستر (ہزار) در کھلے" ہے۔ یعنی "روزی کا ایک وسیلہ ختم ہوا تو کیا فکر ہے" یگانہ نے شعری تقاضے کی بنا پر تھوڑا سا تصرف کرلیا ہے اور یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ بلحاظ مفہوم کوئی قباحت نہیں۔

ایک اور ایک دو کسے سمجھائیں
اُن کے مُرغے کی ہے وہی اک ٹانگ

"وہی مرغے کی اک ٹانگ" یہ کہاوت کسی کے بے جا اصرار یا ضد کی ترجمانی کرتی ہے۔ اسی طرح "ایک اور ایک دو" سیدھی اور سچی بات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہاں دونوں کا استعمال

برمحل اور خوب ہے۔

محاوروں اور کہاوتوں کے بعد اب ہم یگانہ کے کلام سے روزمرہ ، تراکیب اور فقرات کے متعلق کچھ بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ روزمرہ ایسی لگی بندھی ترکیب ہے جسے اہل زبان استعمال کرتے ہیں اور اس میں تبدیلی کسی طرح جائز نہیں ، جیسے: "لو دیکھ لو ، ایک سے بڑھ کر ایک ، ایک ہے" وغیرہ وغیرہ۔ یگانہ کے کلام میں روزمرہ کا استعمال بھی بہت زیادہ ہے۔ ان سب پر سیر حاصل بحث ایک الگ مضمون چاہتی ہے۔ اس لیے ہم صرف دو چار مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور اوپر خط لگا کر ممیز کر دیتے ہیں۔

دل نامحرم فردا ، خدا کی مار ہو تجھ پر
ابھی سے نشۂ حسن عمل میں چُور ہو جانا

شامت آگئی آخر ، کہہ گیا خدا لگتی
راستی کا پھل پایا ، بندۂ مقرب کیا

آ رہی ہے یہ صدا کان میں ویرانوں سے
کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے

کرنی کسی کی بھرنی کسی کی
بے موت مرنا ، غیرت کے مارے

اندھیرے اُجالے کہیں تو ملیں گے
وطن سے ہمیں دربدر کرنے والے

مست انا بھلے کو پیمبر نہ بن گیا
سوجھی تو خوب نشۂ بے اعتدال میں

بھول بھی جا بھلا بھی دے ، یاد نہ کر خدا کو مان
تیری زباں پہ بار بار نام یگانہ آئے کیوں

اسی طرح ہم تراکیب کی بھی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ تراکیب سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس کے اجزا اپنے اپنے معنی دیتے ہوں:

کہو وہ بات دو معنی کہ یوں بھی ہو ووں بھی
زباں وہ کیا جو حقیقت کی پردہ دار نہیں

جسے چاہا بنا لیا دیوتا بندۂ بے امام کیا کرتا
نہ چلی کچھ تو بد دعا ہی سہی دہن بے لگام کیا کرتا

پیٹ کے ہلکے لاکھ بڑ ماریں کوئی کھلتا ہے جاننے والا

نیند کے ماتے ٹھہر جا آنکھ کھلنے کی ہے دیر
چشمِ حیراں میں سبک خواب گراں ہو جائے گا

زہے حسن گنہگاری، زہے فیض پشیمانی
جسے ٹھنڈا پسینا آگیا جنت میں داخل تھا

چراغِ زیست بجھا دل سے اک دھواں نکلا
لگا کے آگ مرے گھر سے میہماں نکلا

یگانہ کے کلام میں لگے بندھے فقرے یا مقولے بھی خاصی تعداد میں استعمال ہوئے۔ ان سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ فقرہ یا مقولہ ایک خاص انداز اور خاص مفہوم ادا کرتا ہے اور اس کا محلِ استعمال بھی مخصوص ہوتا ہے۔ جیسے "خدا یاد آگیا، یہاں کیا دھرا ہے" وغیرہ۔ ان فقروں یا مقولوں میں تھوڑا بہت تصرف جائز ہے، جیسے واحد کی جگہ جمع۔ اب ان کی بھی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

کہاں کا روزِ جزا، کل کے مرتے آج مریں
امید و بیم کو ٹھوکر پہ مارنے والے

اس شعر میں "کل کا مرتا آج مرے یا مر جائے" کو بصورتِ جمع استعمال کیا ہے۔ اگرچہ "ٹھوکر پر مارنا" محلِ نظر ضرور ہے کہ "ٹھوکر مارنا" استعمال ہوتا ہے۔ "پر" یا "پہ" کے ساتھ نہیں۔ وہ "جوتے کی

نوک پر مارنا" ہے، جو اسی مفہوم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

تیرے دم سے ہے اپنی دُنیا آباد اے درد ۔ خدا تجھے سلامت رکھے

مُنھ موڑ کے لکھنؤ سے پہنچے ہیں دکن
تقدیر کہاں کہاں لیے پھرتی ہے

منجدھار تو کیا ہے آگ میں کود پڑیں کچھ بھی نہیں، دل میں ٹھان لینے کی ہے دیر

کچھ بس نہ چلا تو جان پر کھیل گئے کیا چال چلے ہیں ڈوب مرنے والے

بچھڑے ہیں تو کیا آپ سے اک لاگ تو ہے
دم بھرتے رہیں گے دم میں دم ہے جب تک

ہر حُسن کو فلسفی کی آنکھوں سے نہ دیکھ دشمن کو مبارک ہو یہ بالغ نظری

ہم نے اس سلسلے میں بطور نمونہ مندرجہ بالا اشعار پیش کر دیے ہیں۔ اس نوعیت کے بیسیوں اشعار ہیں، جو یگانہ کے کلام میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

آخر میں ہم کچھ ایسے الفاظ پیش کر رہے ہیں، جنھیں عام طور پر استعمال کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا، بالخصوص لکھنؤ کے اساتذہ ان سے گریز کرتے ہیں، حالانکہ داستانوں وغیرہ میں ان کے استعمال کو اچھا خیال کیا جاتا ہے اور بغیر استعمال کیے بات بھی نہیں بنتی ۔ یگانہ کی پہلی رباعی کو ہم اس سلسلے میں بہت اہمیت دیتے ہیں، کیونکہ اس رباعی میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ سیدھی سادی ہے۔ اس میں اُردو پن بہت زیادہ نکھرا ہوا ہے، تصنع نہیں:

ساجن کو سکھی منا لو پھر سو لینا سوتی قسمت کو جگا لو پھر سو لینا
سوتا سنسار، سُننے والا بیدار اپنی بیتی سنا لو پھر سو لینا

اس رباعی میں "قسمت اور بیدار" کے علاوہ سارے الفاظ دیسی بولی کے ہیں جسے کبھی کھڑی بولی کہا جاتا تھا اور اب اس کے دو رُوپ ہو گئے ہیں، ایک اردو اور ایک ہندی ۔ دونوں میں صرف لفظوں کا ہیر پھیر ہے، ڈھانچا ایک ہی ہے ۔ دونوں کا رسم الخط الگ الگ ہے، زبان ایک

ہی ہے۔

دراصل ہم یہاں دیسی یعنی کھڑی بولی ہی کے الفاظ پیش کرنے کی کوشش کررہے ہیں کہ انھیں کے استعمال نے یگانہ کو اہلِ لکھنؤ سے ممیز کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کچھ تو مختلف عنوانات کے ذیل میں پیش کی جانے والی مثالوں میں نقل کر چکے ہیں یہاں ایک رباعی پیش ہے۔

سنسار میں پاروانگ اندھیاری ہے — کیا جانیے خواب ہے کہ بیداری ہے
آنکھیں ہیں مگر حسنِ نظر سے خالی — اندھیر ہے یا سمے کی بلہاری ہے

اس میں "بلہاری" کا استعمال محلِ غور ہے۔ ایک اور رباعی ہے:

گھر بولتا ہے آج دلدر بھاگا — دُکھ درد کے ماروں کا نصیبہ جاگا
دن کاٹے ہیں گن گن اسی دن کے لیے — ساجن آتے ہیں راستہ دے کاگا

اس رباعی میں بھی "راستہ دے کاگا" محلِ غور ہے، کیونکہ مشہور یہ ہے کہ "کاگا" (کوّا) بولتا ہے تو کوئی قریبی عزیز یا عزیز مہمان آتا ہے۔ لیکن اس کے متعلق "راستہ دینے" کی روایت نہیں ملتی ہے ظنِ غالب یہ ہے کہ یہ بات علاقائی روایت سے متعلق ہے۔ اُردو میں ایسی کوئی روایت نہیں۔ یہ یگانہ نے اُردو میں اضافہ کیا ہے۔ ایک اور سادہ رباعی دیکھیے:

بادل کو لگی کھلتے برستے کچھ دیر — دل کو نہ لگی اُجڑتے بستے کچھ دیر
بچوں کی طرح موم ہوا ہوں ایسا — روتے کچھ دیر ہے نہ ہنستے کچھ دیر

اب متفرق اشعار پیشِ خدمت ہیں:

زندگی نے یہ کیسی کروٹ لی — آئی کانوں میں کون سی جھنکار

بجھائے کون، تو جس کو جلائے — پتنگوں کی چڑھائی ہو چکی بس
ہوا میں اُڑ گیا ایک ایک پتّا — گلوں کی جگ ہنسائی ہو چکی بس

درج ذیل پوری غزل اس رنگ کی آئینہ دار ہے۔ دراصل یہی رنگ اُردو کو قبولیتِ عام کا درجہ دیتا ہے:

گوشہ گیری ہے اک انوکھا سانگ — مانگتا ہے کھلے خزانے مانگ
پوچھنا کیا زمانہ سازوں کا — نت نیا بھیس نت نرالا سانگ
شیخ کی کون سی ہے کل سیدھی — ارے جو بات ہے سو اُوٹ پٹانگ
کس طلب میں چلا ہے بے اٹکل — آنکھ والوں سے پہلے آنکھیں مانگ
صلح ٹھہری تو ہے برہمن سے — کہیں مذہب اڑا نہ دے کوئی ٹانگ
بانسری نے دلوں کو موہ لیا — کون سنتا ہے پنجگانہ بانگ

ایک اور ایک دو کسے سمجھائیں | اُن کے مُرشد کی ہے وہی اک ٹانگ
اُڑ چلے کیا فرشتہ انساں سے؟ | سو اُڑان اُس کی اس کی ایک پھلانگ
پھرتے ہیں بھیس میں حسینوں کے | کیسے کیسے ڈکیت ٹھاٹھ کی ٹھانگ
کون دبتا ہے ساتھ مردوں کا | حوصلہ ہے تو باندھ مرٹا نگ سے ٹانگ
خواہ پیالہ ہو یا نوالہ ہو | بن پڑے تو جھپٹ لے بھیک مانگ

بول بالا رہے یگانہ کا
نام باجے جگت کے چاروں دانگ

بات کو مختصر کرتے ہوئے ہم سادہ زبان کے کچھ مصادر و الفاظ پیش کرتے ہیں، جن سے یگانہ کا رنگ نکھر کر سامنے آجائے گا۔ ان کا استعمال جس انداز سے کیا گیا ہے وہ ان کے کلام میں دیکھیے تو یگانہ کی قادر الکلامی اور زباں دانی بخوبی ظاہر ہو جائے گی۔ اولاً مصادر کی مختصر سی فہرست درج کی جاتی ہے:

"دھڑکنا، پھڑکنا، بھڑکنا، دہکنا، چٹکنا، کھٹکنا، ٹٹولنا، رجھانا، اکڑنا، اُچٹنا، تڑنا، جھنجھوڑنا، دھرانا، نادھنا، ٹھاننا، جھکنا، بچھڑنا، گھبرانا، دھننا، مہکنا، تڑنا، پھنسنا، بکسنا، لہلہانا، بھانپنا، ٹاپنا، کڑھنا، کھپنا، سلگنا، تڑپنا، چھکنا، تھکنا، دُھلنا، پھوٹنا، بچکچانا، ٹھاننا، سانا، چھاننا، چھپکانا، ڈسنا، بھٹکنا، بگڑنا، جھڑنا، اُکھڑنا، چھکنا، اُدھڑنا، لڑکھڑانا، تونسنا، ڈھنا، کھُلانا، ٹھٹکنا، پسارنا، بکھاننا، سمونا، پھاندنا، راندنا، پٹخانا، باجنا، گھپنا، تاننا، نپٹنا، ریجھنا، لہکنا، گڑنا، گڑونا، پنپنا، ٹٹولنا، اڑانا، ڈگمگانا، ڈھونا، الاپنا، جھپٹنا، ٹھننا، کھنکنا، ٹیکنا، ٹالنا، بھیجنا، چڑھانا، گھبرانا، کھل کھلانا، رُوٹھنا، پھوٹنا، کھپانا، چومنا، بھگونا، بدنا۔"

ہم نے مرکب مصادر نہیں دیے ان کی تعداد بھی خاصی ہے۔ اب مفرد یا ایسے مرکب جو بمنزلہ مفرد ہیں ان کی بھی ایک مختصر فہرست پیش ہے۔ ان سے بھی یگانہ کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے یہ بھی منفصل بحث طلب پہلو ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

"پھبتی، دونا، گھروندا، چرسا، دسا، روپ، درشن، بٹم، دو بگھی، پٹیتی، جگت، وند، دڑیڑ، اٹوانسی، دھنی، بھرم، ڈھی، ڈانڈا، گہہ، مت، بھول بھلیاں، کرکری، ٹھیکرا، بل، بکھیڑا، پھیر، وانگ، پریم، پریم جگت، بھگت، ہلکان، ٹکے، سانگ، نت، بھیس، بے ٹھکانے، اڑان، پھلانگ، ڈکیت، ٹھانگ، باگ، گھن، پانجھی (کنڈا)، بونڈا، کاگا، اندھا آئینہ، اندھی نگری، اندھیاری، بہاری، بھبھر، چونپ چاؤ،

سبھاؤ، تاؤ بھاؤ، جاگتی جوت، ڈگن، جم جم، گھورا، تڑکا، بھلا چنگا، کھٹکا، دھن، ڈھکا پردہ، پیٹ کا ہلکا، نیند کا ماتا، جگ ہنسائی، دھن کا پکا، منھ بولتا (بولتی)، جاگتی جوت، جگ، تاؤ بھاؤ، خدا کی سنوار، سمجھ کا پھیر، ہنسائی، دہائی، پچھلا پہر، دیکھا دیکھی، چیت، پٹ، آگے، چوری، ڈفلی، راگ، اجالا، کرنی، خدا کی مار، بھلے کو، گھٹا، دُور کے ڈھول، بھلا چنگا، کالے کوس، انوکھا، پیچھے، ٹھکانا، منجدھار، گھاٹ، بھاری، تڑپ، بھجن، لگن، ڈگن، آسرا، کھنڈار (کذا)، دھوکا، ٹھیس، گھنا (گھنی)، چھاؤں، جان جوکھم، منتر، گھن، گھمن (کذا)، گھونٹ، کاندھا، جھونکا، پروان، پتلا، لاگ، لگاؤ، ڈھیر، چونپ، کروٹ، کھیتی، بہری، بیرا، چاؤ، کنگرہ، انمول، گونگا، بہرا، گھرا، بڑھ کر، دھڑکا، ناتا، ٹھوکر، پریم پالی، ٹھیس، دُہری، ان بن، ماتھا، سنسنی، پتنگ، گھات، بے دھڑک، سکھ، دکھ، اجیرن، آہٹ، الٹا (الٹی)، جھنجھٹ، آگا، پیچھا، ہیا، کسک، لہر، گاہک، سیانا، پجاری، پھل، الٹا سیدھا (الٹی سیدھی)، ڈھب، جھنگا، پالا، پلا، دھیان، چسکا، کس بل، پچھلا، گھمٹ، کھٹک، چنگاری، ہوکا، کھیل، آنی، اوجھل۔

یہ تھا یگانہ کی زبان کا ایک مختصر سا جائزہ، جس میں ان کے کلام سے زبان کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم نے اس مضمون میں اہلِ ادب کی زبان کا جائزہ لینے کے ایک انداز کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس میں عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب سے عمداً صرفِ نظر کیا ہے کیونکہ وہ خاصے عام اور مروج ہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم یگانہ کے اس انداز کی طرف توجہ دلائیں جو ان کو اہلِ لکھنؤ سے ممیز کرتا ہے۔ اور وہ پہلو یہی ہے کہ انھوں نے عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ کا سہارا نہیں لیا بلکہ سادہ اور عام فہم اُردو کے الفاظ و تراکیب کو استعمال کیا اور سادہ ہی زبان لکھی ہے۔

بھائی ابّا

میں نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ مشرقی تہذیب کا آخری دور کہا جا سکتا ہے۔
اس زمانے میں شرفا کے گھروں کا عام طور پر یہی دستور تھا کہ مرد گھریلو معاملات میں زیادہ دخیل نہ ہوتے تھے۔ بیوی بچوں کے ساتھ بھی تعلقات ایک خاص حد تک رہتے۔ چونکہ ایک خاندان کے جملہ افراد زیادہ تر ساتھ ہی رہنے میں سب کی بہتری سمجھتے تھے لہٰذا بچوں کی تربیت و نگہداشت گھر کے بزرگوں کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ مردوں کو اپنے کام سے کام۔ زیادہ تر وقت ان کا گھر سے باہر ہی گزرتا تھا۔ برخلاف اس کے بابا کے گھر والوں میں کوئی لکھنؤ میں نہ تھا اس لیے وہ ہمیشہ علیحدہ مکان کرائے پر لے کر رہتے تھے حالانکہ میرے نانا ابّا کا مکان خاصا بڑا تھا اگر رہنا چاہتے تو وہ رہ سکتے تھے مگر انھوں نے سسرال میں رہنا پسند نہ کیا سوائے ایک مختصر عرصے کے وہ بھی جب ایسے ہی مجبور ہو گئے تب۔ پھر اٹاوہ چلے گئے بعد میں ہم لوگوں کو بھی وہیں لے گئے۔ میری یادداشت کا سلسلہ ڈھائی تین سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے۔ وہ سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء تھا۔ اس دور کے کچھ واقعات ذہن میں محفوظ ہیں جن کا ذکر میں اختصار سے کہیں کہیں کروں گی۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اس دور کے مرد عموماً گھریلو معاملات اور بچوں کی ذہنی تربیت میں دلچسپی نہیں لیتے تھے لیکن میرے بابا کا طرزِ عمل اس سے بالکل مختلف تھا۔ انھیں کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ہم لوگ صبح کو آنکھ کھلتے ہی پہلے کلمہ پڑھتے، پھر گھر کے سب بڑوں کو سلام کرتے۔ اس کے بعد دانت صاف کر کے منہ ہاتھ دھونے کے بعد کسی دوسری طرف متوجہ ہوتے۔ میں نے شروع سے آخر تک ہمیشہ یہی دیکھا کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی نہایت سادگی سے بسر کی اور ہم سب کو بھی یہی تربیت دی۔ بابا کی ہدایت تھی کہ ان کے لیے کھانے کا کوئی خاص اہتمام نہ کیا جائے جو کچھ بنتا تھا سب بال بچوں کے ساتھ خوش ہو کر دسترخوان پر ہم سب کے ساتھ بیٹھ کے کھاتے اور کھانے کے ضمن میں آدابِ طعام کی تربیت بھی دیتے جاتے۔ اگر کھانا اچھا پکتا تو تعریف ضرور کرتے اور اگر کوئی چیز ناپسند ہوتی تو خاموشی سے جتنا کھا سکتے کھا لیتے تھے اور تنبیہ کرتے کہ دسترخوان پر بیٹھ کر ہرگز

کسی کھانے کی برائی نہ کرو بلکہ خاموشی اختیار کرو۔ اگر کہیں دوسری جگہ کھانے کا اتفاق ہو تو تمیز سے کھاؤ اور کبھی گر پڑ کے نہ کھاؤ۔ دور رکھی ہوئی چیزیں ہاتھ بڑھا بڑھا کر اپنی طرف نہ کھینچو۔ ہمیشہ بھوک سے کم کھاؤ۔ جب کھا چکو تو اللہ کا شکر ادا کرو اور رزق کو سلام کر کے دستر خوان سے اٹھو۔ رزق کی بے حرمتی کبھی نہ ہونے دیتے۔ اگر کبھی چھوٹا سا روٹی کا ٹکڑا دیکھتے اور یہ امکان ہوتا کہ اس پر کسی کا پیر پڑ جائے گا تو خود اسے اٹھا کر چوم کے کہیں کنارے رکھ دیتے۔ دوسروں کے ہاں دعوت میں جانے کو پسند نہ کرتے زیادہ تر خوش اسلوبی سے ٹال ہی دیا کرتے تھے۔ اپنے گھر آئے مہمان کی اپنی وسعت سے زیادہ خاطر تواضع کا اہتمام کرتے۔ کھانے کے لیے ہم لوگوں کو تاکید تھی کہ کبھی غصے یا رنج کی حالت میں کھانا نہیں کھانا چاہیے بلکہ جب مزاج بالکل نارمل ہو اس وقت خوش ہو کر کھاؤ اس طرح غذا جزو بدن ہوتی ہے۔ غذا ان کی ہمیشہ بہت کم رہی۔ کہتے تھے کہ زیادہ کھانے سے طبیعت بوجھل اور ذہن کند ہو جاتا ہے لہٰذا بھوک سے ہمیشہ کم کھانے کی عادت سے انسان زیادہ کام کر سکتا ہے۔

اسی طرح ہم سب کو بزرگوں سے برابر والوں سے اور چھوٹوں سے گفتگو کرنے کے طور طریقوں اور آداب سے باتوں باتوں میں آگاہ کرتے رہتے۔ خوب و زشت دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے دوسرے لوگوں کے تذکرے کے ضمن میں یا ہمیں لوگوں کی کسی غلطی پر برابر ٹوکتے اور اصلاح کرتے رہتے۔ حد ہے کہ جب ذرا سمجھ داری کا زمانہ آیا تو خط و کتابت کرنے کا سلیقہ رشتے یا مرتبے کے لحاظ سے القاب و آداب استعمال کرنے کا شعور پیدا کیا۔ اس زمانے میں ایک عام رواج تھا کہ لوگ اپنے نام کے ساتھ آخر میں حقیر فقیر، پر تقصیر، کمترین، کنیز، ناچیز، گناہ گار، خدمت گار جیسے الفاظ ضرور استعمال کرتے تھے مگر انھوں نے ایسے الفاظ ہم لوگوں کو استعمال کرنے سے تاکیدی طور پر منع کیا تھا کہ کیوں اپنے کو کسی کے سامنے اتنا کمتر اور حقیر کر کے پیش کیا جائے۔ باوقار انسان کے لیے یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی خودی کو ناحق مجروح کرے کسی اپنے ہی جیسے انسان کے سامنے۔ انسان اپنی عزت کا خود لحاظ اور پاس کرتا رہے تب ہی دوسرے بھی اس کی عزت کرتے ہیں۔ بزرگوں، خُردوں، برابر والوں سے گفتگو کے آداب اور طور طریقے، پانی کسی بڑے کو دو تو اس طرح کہ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر گلاس رکھ کر داہنے ہاتھ سے پکڑ کر ذرا جھک کر پیش کرنا چاہیے۔ سلام کرو تو گردن کو ہلکا سا خم دے کر ہاتھ سے کرو یہ نہیں کہ زبان سے ڈھیلا کھینچ مارا کہ فرض ادا ہو گیا۔ جب تک سلام کرنے کا انداز صحیح نہ ہو گیا، باقاعدہ اس کی ریہرسل کراتے تھے۔

وہ خود اپنے بزرگوں کا بہت ادب و احترام کرتے۔ جب کبھی نانا ابا کے ہاں جاتے یا وہ ہمارے گھر آتے تو بہت ادب سے ان کو سلام کرتے اور نگاہ نیچی رکھ کر ان سے گفتگو دھیمے لہجے میں کرتے۔ اونچی آواز میں بات کرنا یا سننا قطعی ناپسند تھا۔ روزمرہ کی گھریلو زندگی میں بھی ہر وقت ان

باتوں کا دھیان رکھتے کہ کوئی ناشائستہ بات بچّے کسی سے نہ سیکھیں۔ کبھی کسی کو کوئی چیز دینی ہے تو اچھال کے نہ دی جائے بلکہ پاس جاکر دو اور ہمیشہ داہنے ہاتھ سے دو اور اگر کسی سے لو تب بھی سیدھے ہاتھ سے لو۔ بڑا کوئی چیز دے تو سلام کرکے لو۔ بزرگوں کے ساتھ راستہ چلتے ہوئے آگے نکلنے کی کوشش نہ کرو۔ باتیں کرتے میں اگر تم بھی کچھ کہنا چاہو تو ذرا صبر سے کام لو۔ پہلے بڑے کی بات ختم ہونے دو پھر اپنی کہو۔ ہاتھ ہلا ہلا کر یا آنکھیں مٹکا کر بات کرنے پر بچپن ہی سے روک ٹوک رکھتے تھے۔ اکثر گھروں میں اظہارِ خیال کے لیے عامیانہ الفاظ رائج تھے، ہمیں ان کے استعمال کی ممانعت تھی۔ کسی لفظ کے غلط تلفظ پر وہ برہم ہوتے۔ بچھورپن، اتراہٹ یا شیخی بگھارنے سے سخت نفرت کرتے۔ جن اشخاص میں یہ صفات پائی جاتی تھیں ان سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

خوش حالی نہ ہونے کے باوجود ہمارے گھر میں کوئی ایسا محاورہ استعمال نہ ہوتا جس سے طبقاتی پستی کا اظہار ہوتا ہو — زبان کے معاملے میں خاص طور پر ہر وقت اس کا دھیان رکھتے۔ بچوں کی آپس کی بات چیت کو بھی نظر میں رکھتے کہ کس نے کس لفظ کی صحیح ادائی نہیں کی یا مذکر و مونث میں غلطی کی۔ اپنے پاس بلا کر اس کو ٹھیک کرواتے اور کہتے کہ بات چیت اس طرح کرو کہ زبان سے لفظ ٹھیک طرح ادا ہو، نہ بہت اونچی آواز میں بولو نہ بالکل منمنا کے کہ دوسرا تمھارا مطلب نہ سمجھ پائے۔

ایک دفعہ بہت چھوٹی عمر میں کسی سے سنا ہوا ایک مصرع کھیلتے ہیں میں نے گانے کے انداز میں ادا کیا۔ وہ کمرے میں تھے اور میں صحن میں۔ سن کر باہر نکل آئے بولے "لاحول ولا قوۃ گلی کے لونڈوں کے گائے ہوئے گھٹیا قسم کے گیت یا اشعار آیندہ میں تمھاری زبان سے نہ سنوں"۔ گھر میں بیوی بچوں سے اس قدر دلچسپی لیتے ہوئے میں نے انھیں کو دیکھا۔ فرصت کے اوقات میں اکثر و بیشتر باتیں کرتے ہوئے بچوں کی صحیح ذہنی تربیت کا نہ اس وقت ہی کوئی خاص خیال رکھا جاتا تھا نہ آج کل عام گھروں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے وہ ان باتوں کا اپنے بچوں میں خاص کر خیال رکھتے تھے۔ عزتِ نفس، غیرت و خودداری، ایمان داری اور سچ بولنے کی عادت کو اس طرح وقتاً فوقتاً اپنے مخصوص انداز میں جلا دیتے رہتے تھے کہ یہ عادات پختہ ہو جائیں۔ بچوں میں سے اگر کسی سے کوئی نقصان ہو جاتا اور ان کی نظر اس چیز پر پڑتی تو پوچھتے یہ کس نے کیا۔ غلطی کرنے والے نے اگر غلطی اپنی غلطی تسلیم نہ کی اور سزا سے بچنے کے لیے جھوٹ بولا تو شامت آجاتی۔ اور اگر سچ سچ بتا دیا کہ ہم سے یہ نقصان ہوا ہے اور چپ چاپ سامنے کھڑا بھی رہے تو پھر بجائے غصے کے اس بچے پر انھیں پیار آجاتا تھا۔ سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کے کہتے کہ "شاباش ہمیشہ سچ بولو۔ سزا کے خوف سے جھوٹ بول کر اپنے ضمیر کو مجرم نہ بناؤ"۔ ہم لوگوں نے سچائی کی عظمت کو انھیں کے توسط سے پہچانا۔ غیرت و شرافت کا مجسم نمونہ خود ان کی ذات تو تھی ہی مگر کم سنی میں اس کا احساس کسی نکتہ سے ذہن میں پیدا کرنا انھیں کا کام تھا۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں جب کہ ہم لوگ لکھنؤ میں قاضی کے باغ والے مکان میں رہتے تھے، دیوار بیچ سرحد کے ایک شاہ صاحب رہتے تھے ان کی چار بیویاں تھیں۔ سب سے چھوٹی ان کی بہت چہیتی بیوی تھیں، لہٰذا وہ باقی بیویوں سے الگ کوٹھے کی اوپری منزل پر رہتی تھیں، باقی سب نیچے کے مکان میں رہتی تھیں جو بہت کشادہ تھا اور صحن بھی بہت بڑا تھا۔ اوپر والے حصے میں ایک بڑی سی کھڑکی بھی تھی چنانچہ ان کی چھوٹی بیوی سے میری والدہ کے مراسم ہو گئے تھے۔ پڑوسن کی حیثیت سے کبھی کبھی خالی وقت میں یہ دونوں اپنا دل بہلانے کے لیے ایک دوسرے سے باتیں کرتی تھیں۔ میری عمر اس وقت تین سال کے لگ بھگ تھی۔ آغا جان اس وقت گود میں تھے، میں اکیلی گھر میں گھبراتی تھی دوپہر کو نیند بھی زیادہ نہ آتی تھی۔ شاہ صاحب کی چھوٹی بیوی کے ہاں اس وقت تک کوئی اولاد نہ تھی۔ اماں نے ان سے کہا کہ: "اس کو آپ دوپہر میں اپنے پاس بٹھا کر الف بے پڑھایا کیجیے، کچھ اس کا بھی دل بہلے گا اور اس طرح آپ کا بھی خالی وقت کٹ جائے گا۔" اس طرح میرا ان کے ہاں جانا شروع ہوا۔ پڑھائی تو کیا ہوتی تھی کسی وقت ایک آدھ حرف بیٹھ کر رٹ لیا جاتا تھا۔ سارا وقت کھیل یا ادھر ادھر کی باتوں میں صرف ہوتا تھا۔ اس اثنا میں اگر شاہ صاحب اوپر آجاتے تو بس میرے دم پر بن جاتی تھی کیونکہ وہ لمبے تڑنگے قد کاٹھ کے انسان تھے اور اس پر ستم یہ تھا کہ شانوں تک ان کی زلفیں اور سینے تک گھنی لمبی داڑھی بھی تھی اور لباس لمبا کرتا اس پر کالی واسکٹ، اونچی ٹوپی کندھے پر چوخانہ رومال، اُٹنگی شلوار پاؤں میں چمرﮌودا جوتا چوہے دم جیسی چونچ والا۔ بھلا اس ہیئت کذائی والے انسان کو میری طبیعت کہاں برداشت کرنے کو تیار تھی۔ ذرا دیر کے لیے بھی وہ جس کام سے آئے ہوتے کرکے واپس جانے لگتے تو اپنی بیوی کو کہتے کہ: "تم اس کو پڑھاتی کیسے ہو یہ تو منھ سے بولتی ہی نہیں ہے میں نے تو اتنی دیر میں اس کی آواز ہی نہیں سنی یہ تو بت ہے بت۔ بالکل ساکت بیٹھی ہے اس کو بولنا ہی نہیں آتا۔" انھوں نے میرا نام ہی بت رکھ دیا تھا۔ جب بھی مڈبھیڑ ہو جاتی تھی یہی کہتے تھے۔ ان کے ہاں جانے سے پہلے یہ اطمینان کر لیتی تھی کہ وہ اوپر تو نہیں ہیں۔ اگر شبہ بھی ہو جاتا تو واپس اپنے گھر آجاتی نیچے۔ اماں کہتیں کہ پڑھنے کو بھیجا تھا واپس کیوں آگئی۔ بڑی مشکل سے بتاتی کہ وہاں شاہ صاحب ہیں۔ ایک دن ان کے گھر میں خلافِ معمول بہت انتظام و اہتمام نظر آیا۔ نیچے کے صحن میں سفید چاندنی کا فرش لگا ہوا قالین بچھے ہوئے تخت کے اوپر خوبصورت ریشمی چادریں، اس پر گلدستے رکھے ہوئے۔ شام کا وقت تھا لوگ آ کر بیٹھتے جا رہے تھے۔ محفلِ میلاد کا اہتمام تھا۔ محلے پڑوس کے سب مرد حضرات ان کے ہاں مدعو تھے۔ چنانچہ میرے بابا کو بھی شاہ صاحب نے بہت اصرار کے ساتھ آنے کو کہا تھا، لہٰذا حقِ ہمسائیگی کا لحاظ کرتے ہوئے وہ بھی مغرب کے بعد جب میلاد شروع ہو گیا تو شیروانی پہن کے جانے لگے ہیں چونکہ کو مجھے پرے جا جا کر وہاں کی ساری کارروائی دیکھ رہی تھی اور بہت دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی وہاں جا کر

دن. مگر ایک انھیں کے گھر زینے سے اتر کر بیٹھنے کی ہمت اپنے میں نہیں تھی، لہٰذا میں ضد ہوگئی کہ مجھ کو بھی اپنے ساتھ وہاں لے کر چلیے۔ پہلے تو بہت سمجھایا جب میری سمجھ میں کسی طرح نہ آیا تو اماں سے مجھے روکنے کو کہہ کر خود دروازے سے نکل گئے باہر سے کنڈی لگا کر۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں کہ کب رو دھو کر پڑ کر سو گئی۔ صبح کو میرے سو کر اٹھنے سے پہلے وہ بازار سے شیرمال اور بالائی لا چکے تھے۔ میں جب اٹھی تو خود میرا ہاتھ پکڑ کے پلنگ سے اتارا، لوٹا بھر کے دہلیز پر بٹھا کے منھ دھلایا۔ تخت پر بٹھا کر نوالے بنا بنا کر کھلانے لگے اور ساتھ ہی باتیں کرنے کے انداز میں کہتے جاتے تھے کہ "میں تم کو وہاں کیسے لے جاتا، وہاں کھانے پر صرف میرا بلاوا تھا کوئی بچوں کا تھوڑا ہی تھا۔ بغیر بلائے کسی کے ہاں نہیں جاتے ہیں۔ پھر تم تو میری بیٹی ہو۔ بیٹیاں اپنی ماں کے ساتھ جاتی اچھی لگتی ہیں اور بیٹے باپ کے ساتھ۔ جب تمھاری بیوی اماں مہمان جائیں گی تو تم بھی ان کے ساتھ جانا۔" غرض کہ یوں وہ اپنا حق اولاد کی سیرت و کردار کے بنانے میں ادا کرتے۔

گھر سے باہر نکلتے تو پانچوں کپڑوں سے درست ہو کر ہمیشہ نکلتے چاہے ذرا دور ہی کیوں نہ جانا ہو، مگر گھر پر بھی چاہے کتنی شدید گرمی پڑ رہی ہو کرتا بنیائن کبھی نہیں اتارتے تھے جب کہ عموماً لوگ اس پر قادر نہ ہوتے تھے۔ بلا کی گرمی اور حبس کی وجہ سے ایسی حالت میں ان کے ہاتھ میں پنکھا مسلسل گردش میں رہتا تھا۔ لباس میں حیدرآباد جانے سے پہلے سفید اچکن، چوڑے پائنچے کا پاجامہ، ایرانی سیاہ ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی ہمیشہ رہتی تھی۔ گرمی اور برسات کے موسم میں چھتری استعمال کرتے۔ حیدرآباد جانے سے یہ تبدیلی ہوئی کہ اچکن کی جگہ شیروانی نے لے لی۔ وہاں کی تراش خراش اس کی بہت پسند آئی۔ پھر بقیہ عمر بھی شیروانی استعمال کرتے رہے۔ جاڑے میں گرم پتلون اور جیسٹر بھی پہنتے تھے۔ کپڑے کے زیادہ شوقین نہیں تھے بس صاف ستھرا سادہ لباس ہمیشہ استعمال کیا۔ لڑکوں کو ٹوپی پہننے کی تاکید رہتی، خاص کر گھر سے باہر نکلتے وقت ننگے سر ہونے کو بہت معیوب سمجھتے تھے۔

بازار میں کوئی چیز لے کر کھانا بہت گھٹیا پن کی علامت سمجھتے تھے۔ خود ان کا اگر کبھی کسی چیز کو دل چاہتا تو خرید کر گھر لاتے۔ اماں کے یا جب میں ذرا بڑی ہوئی تو میرے ہاتھ میں دے دیتے، پھر سب کے ساتھ کھاتے خوش ہو کر۔ پھلوں میں ان کو انگور، سیب، قندھاری انار، اور سب سے زیادہ آم بہت پسند تھا۔ خاص کر لنگڑا آم کھاتے وقت عظیم آباد کا لنگڑا ان کو ضرور یاد آجایا کرتا تھا۔ لکھنؤ کا دسہری اور سفیدہ پسند تھا۔ نولکشور پریس کی ملازمت چھوٹنے سے پہلے ان کا معمول تھا کہ ہر چوتھے روز منڈی جا کر وہاں سے دسہری اور لنگڑے کی نیم پختہ ڈھیری مزدور کر کے لاتے تاکہ دو دن بعد تیار ہوں۔ رات کو فکر سخن میں اکثر جاگتے رہتے تھے تو دو تین بجے رات تک بار بار اٹھ کر مچان پر رکھے آموں کو دبا دبا کر دیکھتے کہ ان میں سے کوئی کاٹنے کے قابل نرم پڑ گیا ہو تو کاٹا جائے۔

سوتے ہیں اگر میری کبھی آنکھ کھل جاتی تو یہ منظر دیکھنے میں آتا تھا۔ لکھنؤ میں اسی زمانے میں ایک بہت مشہور ملائی کی قلفی والا تھا جو روشن الدولہ کی کچہری میں دن کو بیٹھتا تھا اور کبھی کبھی گرمیوں کے زمانے میں رات کو دس گیارہ بجے کسی محلے میں بھی پھیری کو نکلتا تھا۔ جو اس کی قلفی کے قدردان تھے وہ لوگ اتنی رات کو بھی اس کی آواز سن کر ضرور لے کر کھایا کرتے تھے۔ چنانچہ جس وقت وہ آواز لگاتا تھا ہم لوگ بے خبر سوتے ہوتے تھے، مگر یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود کوئی اچھی چیز کھائیں اور ہم لوگ اس میں شریک نہ ہوں زبردستی نیند کے متوالے بچوں کو جگا جگا کے اپنے ہاتھ سے کھلاتے تھے۔

فکر شعر و سخن وہ نہایت اطمینان کے وقت کرتے۔ جب رات کے کھانے کے بعد بیوی بچوں سے باتیں کر کے سب کے سونے کا وقت ہو جاتا تو دس بجے کے قریب لالٹین، اپنا مخصوص تکیہ، پانوں کی ڈبیا، پنکھا اور تازہ حقہ بھر کے مردانے کمرے میں چلے جاتے۔ وہاں زمین کا فرش ہوتا جس پر ایک گاؤ تکیہ رکھا ہوتا۔ الماری میں ان کی کتابیں، ایک کاغذات رکھنے کا صندوقچہ، پیتل کا یا شیشے کا قلمدان، مکمک کا قلم تراش، بہت عمدہ قلم خود بناتے تھے۔ اس کے بعد ہولڈر استعمال کرنے لگے۔ ۱۹۳۲ء میں بڑے شوق سے انھوں نے اپنے لیے پارکر قلم منگایا تھا جس کو اتنی احتیاط سے انھوں نے برتا کہ وہ آخر زندگی تک ان کے پاس تھا۔ پھر نہ معلوم کس نے اس کو اڑا لیا۔ قلم پر ہی کیا موقوف ہے کیسی کیسی ان کی عزیز اور نایاب قیمتی چیزیں مسافرت کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے تلف ہو گئیں جن کا ان کو دکھ محسوس ہوتا تھا۔ خیال آنے پر خاص طور سے اپنی کتابوں کے ضائع ہونے پر تاسف کرتے۔

بیدل اور صائب کا دیوان تو ہمہ وقت سفر و حضر میں ساتھ ہی رہتا تھا جس کی وجہ سے صائب کا دیوان تو بچ گیا بیدل کا نہ جانے کس کے ہاتھ پڑا۔ شعر کی آمد جب ہوتی تھی تو گنگنانے رہتے تھے، مکمل ہو جاتا تو ترنم سے دھیمی آواز میں پڑھتے رہتے۔ دو تین بجے رات سے پیشتر تو وہ سوتے ہی نہ تھے۔ غزل نہ کبھی کہنا ہوتی تو اپنے پسندیدہ موضوع پر مختلف کتابیں مطالعے میں رہتی تھیں۔ اگر کسی مشاعرے کے لیے تازہ غزل کہنا ہوتی تو تقریباً رات کے چار بھی بج جایا کرتے تھے۔ اس اثنا میں کوئی ایسا شعر موزوں ہو جاتا جو ان کو خود پسند آجاتا تو اکثر ایسا بھی ہوا کہ اماں کو سوتے میں جگا کر سناتے، وہ نیند کی وجہ سے پوری توجہ سے کچھ نہ پاتیں تو کہتے "کیا آپ کا ذوق ہے، سبحان اللہ، اگر بیدل سے کہہ دیا کہ ہاں اچھا ہے۔ ذرا اٹھ کے بیٹھیں تو سہی کیا شعر موزوں ہوا ہے اس وقت یا الہام ہوا ہے۔ اجی مہاراج کچھ تو داد دیں۔" ان لوگوں کی گفتگو سے میری نیند ہوشیار ہو جاتی مگر خاموش پڑی سب سنتی رہتی تھی۔ اٹاوہ کے قیام کے زمانے میں یہ غزل اماں کو جگا کر سنائی تھی:

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

اور غالباً گزرا [illegible] بھی ایک رات جب یہ غزل کہہ رہے تھے:

زمیں کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہو کر
عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسماں ہو کر

اسی طرح وہ اپنی تازہ غزل کی داد پہلے اپنی بیگم سے ضرور لیتے تھے لہٰذا انھیں بھی اچھا خاصا ذوق شعری سنتے سنتے پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

عورت کی جس خوبی کو وہ جملہ خوبیوں پر مقدم جانتے تھے وہ اس کی وفاداری کی صفت ہے۔ اس کے بغیر وہ عورت نہیں ایسی عورت کو وہ ایک بدبودار پھول سے تشبیہ دیتے تھے کہ جس کو سونگھنے کی کبھی خواہش دل میں نہ پیدا ہو۔ اس سے ملتا جلتا ایک قول امام جعفر صادق علیہ السلام کا تاریخ میں دیکھنے میں آیا کہ اگر بیوی وفادار اور امین ہے تو پھر اس کی ساری غلطیاں اور کمزوریاں نظر انداز کرنے کے قابل سمجھو۔ اس کی وجہ سے مرد کو طمانیت قلب حاصل رہتی ہے اور وہ یکسوئی سے اپنے کاروبار زندگی میں بھرپور طریقے سے حصہ لے سکتا ہے۔ اتنے مختصر سے جملے میں نفس انسانی کی رہنمائی کے لیے کتنی گہری بات بتا دی گئی ہے۔ موجودہ مغربی تہذیب کے زیر اثر جس معاشرے کی تشکیل ہوئی، اس میں تو عام طور سے یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ بالکل معمولی اور غیر اہم باتوں کو اتنی اہمیت دی جانے لگی کہ گھریلو زندگی کا چین تباہ کر کے نہ صرف دو زندگیاں بلکہ ان کے ساتھ جملہ متعلقین کے لیے بھی نت نئے مسائل و مصائب کا دروازہ کھول دینا معمولی بات سمجھی جانے لگی۔ کردار کی اہمیت کو نظر انداز کر دینے کا اور کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ یہ شعر انھوں نے اسی پس منظر میں کہا ہے:

حسن چمک اٹھا تو کیا بوئے وفا تو اڑ گئی
اس نئی روشنی نے آہ دل کا کنول بجھا دیا

خواتین کا احترام جس طرح ان کو کرتے دیکھا اس کا عشر عشیر بھی مہذب و متمدن ترقی یافتہ زمانہ نہیں پیش کر سکتا۔ وہ خود اپنے گھر میں بھی آواز دیے بغیر کبھی داخل نہیں ہوتے تھے۔ ہمیشہ دروازے پر ٹھہر کے آواز دیتے تھے کہ میں آ رہا ہوں اور ہاتھ کی چھڑی سے کھٹ کھٹ کر دیتے تھے۔ جب اندر سے کوئی کہہ دیتا کہ آ جائیے تب آتے۔ اس کے پس پشت یہ خیال تھا کہ کوئی پردہ دار خاتون محلہ پڑوس کی نہ بیٹھی ہوں یا اپنے ہی گھر کی خواتین اگر ہوں تو نہ جانے کس طرح سے بیٹھی ہوں کیونکہ گرمی کے سبب اکثر مردوں کے باہر جانے پر خواتین دوپٹے سے بے نیاز ہو کر گھر کے اور بچوں کے کاموں میں مصروف ہو جایا کرتی تھیں بے فکری کے ساتھ۔ عورت کا احترام اپنے عمل سے جس طرح انھوں نے کر کے دکھایا، اس زمانے میں بھی اس کی مثال شاذ و نادر ہی کہیں ملتی تھی۔

عام طور سے اس طرح کی پابندی اپنے اوپر ہمہ وقت لگانے کا کوئی مرد روادار نہیں ہوتا تھے مگر کہتے تھے کہ جو شخص عورت کی عزت اور اس کا احترام نہیں کرسکتا اس کو شرافت چھو کر بھی نہیں گزرتی۔ گھر کی خواتین ہی ہم مردوں کی عزت و ناموس کی امین ہوتی ہیں۔ اگر ہم نے ان کو مقام نہ دیا جس کی وہ عام طور پر مستحق ہیں تو پھر ہم نے ان کو کیا دیا؟ ان میں وفا شعاری تمام عمر کے لیے ساتھ مرنے اور جینے کا عزم و حوصلہ کیسے پیدا ہو سکتا جو ہم تکریم و تعظیم سے کبھی ان کے ساتھ پیش نہ آئیں۔ اور حقیقت بھی یہی دیکھنے میں آئی کہ حسن معاشرت و نرم خوئی آپس کا پرخلوص برتاؤ ہی تھا جس کے سبب پورے سات سال ۲۳ء سے لے کر ۲۹ء تک کا وہ پرآشوب زمانہ جب کہ بابا کا ستارہ گردش میں تھا جس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کس طرح میری ماں نے صبر و سکون کے ساتھ چار چھوٹے چھوٹے بچوں کی بھوک کی نقاہت سے کمھلائی ہوئی صورتیں دیکھیں۔ ایسے عالم میں ماں کے دل پر جو کچھ گزرتی ہے وہ تو الگ بات رہی بچوں کو اس صورت حال کے جھیل جانے کا حوصلہ دلانا اور اپنی اضطراری کیفیت کو کسی پر ظاہر نہ کرنا، گھر میں آنے جانے والوں کو یہ پتا نہ چلتا تھا کہ اس گھر میں دو دو تین تین دن بعض اوقات چولہا جلنے کی نوبت نہیں آتی۔ کیا پیغمبرانہ شان سے وہ زمانہ گزارا ہے۔ اگر اس طرح کا تعاون ان کی طرف سے نہ ملتا تو بابا ہر قدم پر اتنی استقامت سے بغیر کسی دنیاوی سہارے کے اپنے مشن کی دشوار گزار راہوں سے گزر جانے کا حوصلہ کب تک قائم رکھ سکتے تھے۔ آبائی مکان پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ مال دنیا میں کچھ قیمتی نایاب کتابیں اور معمولی سی گرہستی تھی جو اس آڑے وقت میں کچھ دن کام آئی۔ اس وقت میرے منجھلے ماموں یوپی کے ایک چھوٹے سے مقام کے اسٹیشن ماسٹر تھے۔ اس نازک صورت حال کے پیش نظر انھوں نے بڑی مشکل سے بھائی ابا کو اس بات پر راضی کیا کہ میں بہن اور بچوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں تاکہ آپ ان کی طرف سے بے فکر ہو کر تلاش معاش کر سکیں۔ نہ چاہنے کے باوجود انھوں نے ماموں جان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہم سب کو ان کے ساتھ جانے دیا۔ غرضیکہ وہاں دیہات اور اکیلے کوارٹر میں اماں دس بارہ روز سے زیادہ نہ ٹھہر سکیں بھائی صاحب سے کہا مجھ کو واپس پہنچا دیجیے۔ حالانکہ وہاں ہر طرح کا آرام تھا۔ کھانے پینے کی تمام اشیا افراط سے گھر میں بھری تھیں۔ گائے پلی تھی۔ مرغیاں، انڈے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ کام کرنے کے لیے ایک دیہاتی عورت بھی آتی تھی مگر وہ اس سب کے باوجود لکھنؤ واپس آگئیں۔ بھائی ابا کو ان کی اس بات سے بہت خوشی ہوئی کہ بھائی کے پاس کی تمام آسائشوں سے منہ موڑ کر میرے ساتھ مصیبت بھگتنے کو انھوں نے ترجیح دی۔

اسی ہم آہنگی و تعاون کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ ان کو پینے پلانے پر کوئی راضی نہ کر سکا حالانکہ بقول خود ان کے یاروں نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لاہور میں جس مکان

یہیں ہم لوگ رہتے تھے اس کے نیچے کی منزل میں جگر صاحب بھی رہتے تھے۔ ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا اس زمانے میں ان کے ساتھ رہتا تھا۔ اپنے رنگ میں رنگنے کی بھرپور کوشش انھوں نے بھی کی۔ قیام حیدرآباد دکن کے زمانے میں کن کن لوگوں سے واسطہ پڑا، کیسی کیسی کوششیں کیں، وہ سب اماں کو بتا دیا کرتے تھے۔ شاعروں کی اکثریت نے اس نجاست کو گلے لگانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی مگر ان کا جواب ایسے موقعے کے لیے یہی ہوتا تھا کہ "میں اپنی معصوم صفت بیوی کو اپنی ذات سے ایسی ذہنی اذیت کبھی نہیں پہنچا سکتا۔ اگر محبت و دوستی نبھانے کے لیے یہی شرط ٹھہری تو ایسی دوستی کو میرا دور ہی سے سلام ہے۔"

۱۹۲۴ء میں اٹاوہ چلے گئے، اسلامیہ ہائی اسکول میں ملازمت مل گئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی بدولت وہاں بھی حالات کچھ بہتر نہ تھے کیونکہ اسکول کی ماسٹری میں اس زمانے میں تنخواہ کل تیس ۳۰ روپے تھی جو وقتی طور پر کچھ نہ ہونے سے بہتر سمجھ کر کر لی گئی کہ بچوں کے لیے کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔ وہاں سے ایک رسالہ بھی "صحیفہ" نام سے نکالا تھا جو چل نہ سکا۔ پھر علی گڑھ میں بھی تقریباً چھ مہینے رہے تھے۔

۱۹۲۶ء میں لاہور آنا شروع ہوا وہ اس طرح کہ تاجور نجیب آبادی نے جو نشر و اشاعت کا ادارہ قائم کیا تھا اس میں زیر طباعت کتابوں کی اصلاح کے لیے بلاوا آ گیا۔ ہم لوگوں کو علی گڑھ سے لکھنؤ پہنچا کر خود لاہور چلے گئے۔ جب مکان وغیرہ کا بندوبست کر لیا تو سب کو اپنے پاس بلا لیا۔ لاہور میں بھی دو سال کے لگ بھگ رہے ہوں گے۔ انھیں دنوں پنڈی اور شملے کے مشاعروں میں بھی گئے تھے۔ اسی زمانے میں یہ نئے دوست بھی بنے۔ دوارکا داس شعلہ، عبد اللطیف تپش، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، خواجہ دل محمد دل، مرزا نعیم بیگ چغتائی۔ اور بھی ہوں گے جن کا علم مجھ کو نہیں کیونکہ ان حضرات کا تذکرہ گھر میں بھی کیا کرتے تھے اس لیے ان کے نام مجھ کو یاد ہیں۔

لاہور کی ملازمت چھوٹنے کا کیا سبب ہوا اس کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔ مئی ۱۹۲۸ء میں میرے نانا ابا کے انتقال پر وہ لاہور سے ایک دن پیشتر پہنچ گئے تھے، اس کے بعد واپس نہیں گئے۔ لکھنؤ ہی میں پریشان حالی سے وہ زمانہ کٹتا رہا۔ پھر دکن جانے کی دل میں ٹھانی۔ نہ جانے کس طرح زادِ سفر مہیا کیا اور گھر میں مختصر سامانِ خور و نوش رکھ کر اللہ پر توکل سوار ہو گئے۔ کس طرح گئے تھے، یہ ان ہی کا دل جانتا تھا۔ دس پندرہ دن بعد ایک پوسٹ کارڈ آیا۔ میرے نام زندگی میں یہ پہلا خط تھا ان کا، جس کی اثر انگیزی میرے قلب پر آج بھی اسی طرح سے نقش ہے۔ لکھا تھا: سرخی بھی: "تیرا بابا کیسی مجبوری میں تم لوگوں کو اس حال میں چھوڑ کر نکلا ہے۔ اور حال یہ ہے کہ دل [illegible] کے لیے بھی یہاں کی گہما گہمی، آؤ بھگت، خاطر تواضع کچھ اچھا نہیں لگتا ہے۔

ایک نواب صاحب نے آج میری بڑی پرتکلف دعوت کی تھی جس میں اور بھی بہت سے معززین مدعو کئے گئے تھے۔ انواع اقسام کی نعمتیں دسترخوان پر سجائی جارہی تھیں۔ کچھ دیر میں وہاں کے انتظامات دیکھتا رہا اس کے بعد لوگوں کی نظریں بچا کر چپکے سے نکل آیا۔ اس احساس نے مجھ کو وہاں ٹکنے نہ دیا کہ میرے بچوں پر نہ معلوم کیا عالم گزر رہا ہوگا اور میں یہاں ایسی دعوتوں سے لطف اندوز ہوں، یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ وہاں مجھے ہر طرف تلاش کیا جارہا ہوگا۔ میں جن صاحب کے ہاں مہمان ہوں ان کے کمرے میں بند تم کو یہ خط لکھ کر اپنے دل کا بوجھ کچھ ہلکا کر رہا ہوں۔ دعا کرو کہ یہ آزمایش کے دن جلد ختم ہوں ہم لوگوں کے "آمین"

اپنے فرائض اپنی ذمہ داریاں ناگفتہ بہ حالات میں بھی ہمیشہ خود ہی پوری کرتے۔

کسی رشتہ دار کا بھی مرہون منت و احسان ہونا وقتی طور پر بھی گوارا نہ تھا بلکہ خود رشتہ داروں سے حسن سلوک سے پیش آنے کو کہتے۔ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ دل غنی رکھو دوسروں سے کچھ ملنے کی توقع کبھی نہ کرو بلکہ تم خود بڑھ کر کسی کے کام اگر آسکتے ہو تو آؤ، یہی بزرگی اور شرافت کی دلیل ہے۔ عزم و حوصلہ جس انسان میں ہوتا ہے وہ دوسروں کا منھ نہیں تکتا بلکہ وہ خود عمل کرتا ہے۔

اسی لیل و نہار میں زندگی کے دن کٹنے کے سبب میری پڑھائی خاطر خواہ نہ ہوسکی جس کا انھیں بھی افسوس تھا۔ اسماعیل میرٹھی کی تیسری کتاب تک انھوں نے خود مجھ کو پڑھایا، اس دوران گیپ بھی پڑتے رہتے تھے۔ پہلی کتاب اٹاوہ میں مجھ کو پڑھاتے تھے۔ پڑھانا اور وہ بھی چھوٹے بچوں کو ان کے بس کا کام نہیں تھا۔ ڈانٹ تو پڑتی ہی رہتی تھی ایک دن جب کئی مرتبہ بتانے پر بھی کسی لفظ کے ہجے مجھے یاد نہ رہ سکے تو پاس رکھی ہوئی ایک موٹی سی کتاب میرے سر پر دے ماری اور اپنے سامنے سے ہٹ جانے کو کہا۔ میں روتی ہوئی ہٹ گئی۔ پھر سارا دن میں نے اُن سے نہ بات کی، نہ ان کی طرف دیکھا۔ میرا منھ پھولا رہا جس کو وہ محسوس کرتے رہے۔ اس دن رات کو گیارہ بجے جب اپنے دوست احباب کی صحبت سے اٹھ کر گھر آئے تو مٹھائی لیتے ہوئے۔ نیند سے ہوشیار کرکے کھلانے کی کوشش کرتے جاتے تھے اور ساتھ ہی کہتے جاتے کہ "یہ آج مجھ سے بہت ناراض ہوگئی ہے۔ بس اب اپنا غصہ تھوک دو تمھارا بابا تم کو خاموش نہیں دیکھ سکتا، بس ذرا سی کھا لو کہ میرا دل ٹھنڈا ہو جائے، پھر زبردستی نہیں کروں گا۔" بچپن کی نیند بھلا کچھ سمجھنے اور کھانے کی مہلت دیتی ہے۔ اس طرح ناز برداریاں بھی کرتے تھے اور غلط باتوں یا کاموں پر ڈانٹ بھی پڑتی تھی کبھی گوشمالی بھی ہو جاتی تھی۔ انتہائی غصے میں بھی کبھی کوئی ناشائستہ لفظ زبان سے ہم لوگوں سے نہیں کہا تھا۔ نالائق، بیہودہ، بدتمیز، بیوقوف جیسے الفاظ استعمال کرتے تھے بس۔

اور سب بہن بھائیوں کی نسبت میرے حصے میں ان کا پیار زیادہ اور غصہ کم آیا کیوں کہ میں ہی ایک طرح ان کی مکمل زندگی کا سہارا تھی مجھ سے بیشتر دو بھائی ہو چکے تھے حقیقت تو یہ ہے

کہ ماں سے زیادہ پیار مجھ کو انہیں سے ملا۔ بچپن میں جیسی ناز برداریاں میری کیں اتنی کسی دوسری اولاد کی نہ کر سکے۔ زمانہ بھی ناموافق ہوتا چلا گیا۔

عثمان آباد میں زندگی نے ذرا قرار پایا تو میرے لیے علامہ راشد الخیری کی "شام زندگی" کا سیٹ، خواجہ حسن نظامی صاحب کی کتابیں، جرجی زیدان کی تاریخی کتابوں کے ترجمے منگا کر دیئے جب سے اسلامی تاریخ کے حقائق سے واقفیت حاصل کرنے کا ان کو شوق ہوا تو جو کتابیں وہ پڑھتے تھے وہ سبھی کتابیں عربی میں تھیں جیسے صحیح مسلم، صحیح بخاری، تاریخ طبری، مشکوٰۃ، تاریخ ابن کثیر، حیات القلوب اور میں عربی سے نابلد تھی۔ میرے لیے جسٹس امیر علی کی تاریخ اسلام، عبداللہ امرتسری کی علی ابن ابی طالبؑ، نواب احمد حسین خاں کی تاریخ احمدی، نواب امداد امام اثر کی مصباح الظلم اور میر انیس علیہ الرحمۃ کے تمام مراثی وقتاً فوقتاً مہیا کرتے رہتے تھے۔

میر انیس کے مرثیے تحت اللفظ میں روانی کے ساتھ پڑھنا آسان نہیں۔ مختلف اوقات میں فرصت سے سامنے بٹھا کر مجھ کو پڑھوا کر سنتے اور پھر ہر طرح اس کی صحت درست کر کے بتاتے جاتے کہ الفاظ کی ادائی بھی صحیح ہو، وزن بھی نہ گرے، زیر زبر پیش بھی درست لگے۔ معانی و مطالب الفاظ کے بتاتے رہتے اس طرح میری اردو کی استعداد کو بڑھایا کرتے۔

مذہب کے متعلق آپ کا نظریہ یہ تھا کہ یہ خدا اور بندے کے مابین روح اور ضمیر کی تسکین کا معاملہ ہے۔ دل کی گہرائیوں سے جن عقائد کو قبول کرے وہی اس کا مذہب ہے۔ موروثی یا اوپر سے تھوپنے والی چیز نہیں۔ میرے لیے مذہبی تاریخی کتابیں مہیا کرنے میں یہی جذبہ کار فرما تھا کہ میں اپنے ضمیر کی روشنی میں اپنے عقائد کا تعین کر سکوں۔ عبادت کے ایک حد تک موافق تھے۔

میں نے بچپن میں روزے رکھتے بھی دیکھا اور نماز پڑھتے بھی مگر پابندی سے نہیں۔ جب دل چاہتا تھا تو رمضان میں چار یا پانچ روزے رکھ لیتے تھے اور نماز بھی پڑھتے تھے، خاص کر صبح کی نماز تو وہ یوں بھی اکثر پڑھنے کے بعد قرآن شریف کی تلاوت لحن سے کرتے جو کانوں کو بھلی لگتی۔ جب ان کو کسی قسم کی خوشی یا کامیابی ہوتی تو بطور شکر نماز ضرور پڑھتے تھے۔ لکھنؤ کے مشہور و معروف خطیب مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ کی مجالس عشرہ محرم میں بہت شوق سے نانا ابا کے ساتھ روزانہ صبح کو جاتے میں نے بچپن میں دیکھا تھا، جو ان کے ذوق سماعت پر پورے اترتے تھے۔ حیدرآباد کی بڑی مجالس میں بھی جانے کا ذکر کرتے تھے۔ روز عاشورہ سر و پا برہنہ جلوس علم میں شرکت کے بعد تمام دن فاقے سے رہتے اور مرثیہ انیس پڑھ کر مغموم و محزون دن گزارتے۔ شام پانچ بجے سب کے ساتھ فاقہ شکنی کرتے۔

زندگی کے آخری دور میں بھی روز عاشورہ ہمیشہ مغموم رہ کر گزارنے میں فرق نہیں آنے پایا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تعالےٰ اور امام علیہ السلام نے حق کی خاطر جو ایثار و قربانی کی

لازوال مثال اہل دنیا کے لیے غیر متزلزل کیریکٹر سے پیش کی اور جو کچھ دنیا والوں نے ان کے ساتھ سلوک برتا اس محسن کشی پر وہ اتنے دل برداشتہ ہوتے کہ اس ذکر پہ اکثر ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ چونکہ وہ خود صاحب کردار تھے لہٰذا ان کے دل میں مقام بھی ایسی ہی ہستی حاصل کر سکتی تھی جو لازوال کیریکٹر اور بے پناہ عزم کی مالک ہو۔

۱۹۵۵ء میں بیماری کے دوران میں ان کے پاس چار مہینے جا کر رہی تھی، اور باتوں کے علاوہ ایک دن تفصیل سے ان کی ساری روداد بھی سنی، دوران گفتگو میرے منھ سے بے ساختہ نکلا کہ بابا میں آپ کے اندر وہ چیز محسوس کرتی ہوں جو اصحاب حسینی کے غیر متزلزل ایمان و یقین میں تھی۔ اگر سانحۂ کربلا آپ کے دور حیات میں رونما ہوتا تو یقیناً آپ بھی ان جلیل القدر اصحاب کی صف میں ہوتے جس کا تصور بھی درد دل رکھنے والے انسان کو لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ یہ جملے سن کر ایک دم جیسے بجلی کا جھٹکا ان کو لگا۔ سر فخر سے بلند ہو گیا۔ ایک لمحے کے سکتے کے بعد بولے کہ میں ایسا محسوس کر رہا ہوں گویا تم نے میرے عمر بھر کے زخموں پر جیسے آج پھایا رکھ دیا ہے۔ اس ایک جملے سے سچائی اور ایمان داری کو اپنے ہر شعبۂ حیات میں برتنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ کسی مجبوری یا وقتی مصلحت کے تحت بھی ان کی فطرت بلند اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکی۔

اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آیا۔ اگست ۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا۔ راشننگ کے نفاذ پر سختی سے عمل ہو رہا تھا۔ وہ اب مستقل قیام کے خیال سے لکھنؤ آئے تھے اور دن میں کئی بار چائے پینے کے عادی ہو گئے تھے۔ شکر کی قلت کے پیش نظر اماں نے ان سے کہا کہ آپ اپنا کارڈ بھی بنوا لیجیے اور اس میں ایک نوکر کا بھی اضافہ کر لیجیے تاکہ کچھ شکر زیادہ مل سکے۔ چنانچہ وہ درخواست لے کر آفس گئے جو قریب ہی تھا۔ وہاں ان کو بتایا گیا کہ آپ نوکر کو لے آئیں تو کارڈ بھی بن جائے گا۔ وہاں سے واپس آگئے، اس نئی صورت حال کے پیش نظر راستے ہی میں کھڑے ہو کر تھوڑی دیر سوچا کیے، اس کے بعد واپس راشن آفس جا کر کہہ دیا کہ جناب وہ نوکر تو نہیں آتا لہٰذا آپ صرف میرا ہی کارڈ بنا دیں۔ چنانچہ اپنا کارڈ بنوا کر لائے اور اماں کو واقعہ سنایا یہ کہہ کر کہ لاحول ولا قوۃ آپ نے مجھ کو خواہ مخواہ نوکر کا کہنے کو کہہ کر اتنی سی چیز کے لیے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ یہ سن کے ہم سب بہنوں کا مارے ہنسی کے برا حال ہو گیا، ان کی سچائی کی بے چارگی پر۔

دوسرا واقعہ ان کی ایمان داری کی صفت جانچنے کا بھی اگر پیش کر دوں تو بے جا نہ ہوگا۔ ۱۹۲۲ء میں "چراغ سخن" چھپوانے کے لیے بہت بے چین تھے، جو کچھ ان کے پاس تھا اس میں کام نہیں بنتا نظر آتا تھا۔ ۱۰۰ سو سوا سو کی پھر بھی کمی تھی۔ جسے پورا کرنا ضروری تھا۔ جس مکان میں رہتے تھے اس کے دوسرے حصے میں پنجاب کے ایک قاضی صاحب کے نام کے شریف انسان رہتے تھے۔ چونکہ مراسم ہر وقت کے ان سے تھے، ان کو اس بات کا علم ہوا تو خود انھوں نے بطور قرض ۱۰۰ سو روپے اصرار کر کے دے دیے کہ آپ اپنا کام اتنی معمولی رقم کی وجہ سے نہ اٹکا رکھیں بلکہ جلد مکمل کریں۔ ان کی رقم کی ادائی کرتے رہے مگر یکمشت

نہیں دے سکے تھے تا آنکہ ۱۹۲۳ء میں نولکشور پریس کی ملازمت ہی ختم ہوگئی۔ اب ادائی کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ برسوں پریشانی میں گزر گئے اور وہ قاضی صاحب بھی لکھنؤ چھوڑ کر پنجاب چلے گئے۔ اب عثمان آباد میں جب ذرا حالات پرسکون ہوئے تو قاضی صاحب کی تلاش میں نہ معلوم کتنے لوگوں سے خط و کتابت کرتے رہے مگر ان کا پتا نہ ملتا تھا۔ بہت افسوس کے ساتھ اکثر کہتے تھے کہ "قاضی صاحب بیچارے کے بیس روپے میرے ذمے باقی رہ گئے ہیں اور ان کا پتا نہیں۔ دل کہتا ہے کسی طرح یہ رقم ان کو پہنچاؤں" اپنے ضمیر پر ایک بوجھ محسوس کرتے رہے جب تک اس مسئلے کو حل نہ کر لیا، وہ اس طرح کہ کسی شریف اور ضرورت مند انسان کی اس سے زیادہ رقم دے کر مدد کر دی، اس نیت سے کہ اس کا اجر اس آدمی کے لیے ہو جس کی یہ رقم میں دے رہا ہوں۔ غرضیکہ زندگی میں اکثر و بیشتر ایسے واقعات ہوتے جو دور ابتلا میں ہم لوگوں کے لیے مشعل راہ بنتے۔ ورنہ یہ دنیا وہ امتحان گاہ ہے جہاں اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ وہ کسی کی وجاہت دنیوی سے قطعی متاثر نہ ہوتے تھے بلکہ جس سے ان کا واسطہ پڑتا تھا اس کے باطن میں حسن ذاتی کی ان کی نگاہیں متلاشی رہتی تھیں اور اگر کہیں ایسی خوبیاں مل گئیں تو اس کی تعریف کرنے میں انھوں نے پھر بخل سے کام نہیں لیا۔ یہ حقیقت ہے کہ زندگی میں انھوں نے کسی کی شان میں مدح کے طور پر ایک مصرع بھی نہیں کہا۔ مگر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے ہیڈ ماسٹر الطاف حسین قبلہ کی ذات گرامی کچھ اس طرح حسن ذاتی سے مزین تھی جس کے وہ دل کی گہرائیوں سے معترف تھے۔ ان کا ذکر خیر ہمیشہ بڑے خلوص سے کرتے ان کی بزرگی برتری کا ذکر سرعام کیا کرتے۔ زندگی میں اگر کسی کی مدح کی تو وہ ان ہی کی ذات والا صفات تھی۔ دو رباعیاں ان کے لیے کہی گئی تھیں۔

حسن ذاتی کی جھلک کے وہ تمام عمر متلاشی رہے اور اس کے قحط کا شکوہ اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

یہ بلائے حسن کہاں نہیں مگر اپنے واسطے قحط حسن
تمھیں کیا بتائیں نظر کے ساتھ جو وقت نظری رہی

وہ خود بھی نہایت اعلیٰ صفات انسانی کے حامل تھے جن کو دیکھنے سے دوسروں کی نگاہیں ہمیشہ قاصر رہیں۔ اپنی خودداری واستغنا کا بھرم ایسے نازک وقت میں بھی انھوں نے قائم رکھا اور پھر کس شان سے۔ تلاش معاش کے لیے جب حیدر آباد میں مختلف لوگوں سے ملنا جلنا رہتا تھا۔ تو ایک نواب صاحب جو خطاب یافتہ اور بھائی آبا کی شاعری کے قدر دان بھی تھے ایک دن کہنے لگے کہ "میں آپ کو حضور نظام سے ملوانے کا بندوبست کر رہا ہوں، سرکار ضرور آپ کو پسند فرمائیں گے کیونکہ آپ کا کلام ہی اتنا جاندار ہے۔ بس وہاں حضوری میں جاتے وقت آپ کو شاہی آداب کے مطابق شیروانی پہننی پڑے گی اور دستار بھی پہننی پڑے گی اور دربار میں پہنچ کر کمر سے جھک کر تسلیمات عرض کرنا پڑے گی، نیز ہاتھ ملا کر۔ آپ کے لیے دستار وغیرہ کا میں انتظام کیے دیتا ہوں۔" اس سے زیادہ ان کی بات

آگے چلنے ہی نہ دی۔ بولے "بس بس نواب صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں اپنے میں اتنی طاقت نہیں پاتا کہ نظام کی صحبت میں جگہ پانے کے لیے ان کے اہل کاروں کی طرح بگلوس دستار لگا کر تسلیمات بجا لاؤں میں ایسے منصب وعہدے پر لعنت بھیجتا ہوں جس سے میرا جذبہ خودداری مجروح ہوتا ہے۔ مجھ کو تو حیدر آباد شہر سے بھی دور کسی جگہ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت مل جائے تو اسی کو اپنے لیے غنیمت سمجھوں۔" غرض کہ یہ نواب صاحب اپنا سا منھ لے کر رہ گئے کہ یہ کس مزاج اور دل ودماغ کا شخص ہے۔ نظام تک پہنچنے کے لیے تو لوگ نہ معلوم کیسے کیسے جتن کرتے ہیں اور یہ پائے حقارت سے اس طرح ٹھکرا کر چلے گئے۔

اگر دوستی ان کی کسی کے ساتھ نبھی آخر تک تو وہ حضرت نجم آفندی صاحب کی ذات تھی ورنہ نہ معلوم کتنے اس راہ میں ساتھ چھوڑ گئے۔ ہم لوگوں کا آگرے میں قیام انھیں کے اصرار پر ہوا تھا کیونکہ بھائی ابا تو ملازمت کی مجبوری کے سبب دکن ہی میں رہے۔ آغا جان کی بیماری نے اتنا طول کھینچا دکن کی آب وہوا ان کو راس نہ آئی جس کی وجہ سے علاج کے لیے بجائے دہلی کے آگرے میں ہی ہم سب کو چچا نجم کی ذمہ داری پر چھوڑ دیا تھا۔ بھائی کہتے تھے تو بھائی کے بچوں کی طرح ہم سب کا خیال بھی رکھتے تھے۔ خدا مرحوم کو ہمیشہ اپنی رحمتوں سے نوازے۔

جب کبھی عظیم آباد کا ذکر ہوتا تو کہتے کہ ایک مرتبہ میرا دل چاہتا ہے کہ تم سب کو لے کر اماں کی قبر پر جاؤں۔ مگر یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی۔ عظیم آباد میں اب تھا کون جس کی محبت کھینچ لیتی۔ ماں باپ گئے۔ بہن بھائیوں میں بھی کوئی نہ تھا۔ دادی اماں کی ساری اولادوں میں یہی تو اکیلے زندہ بچے تھے۔ اپنا آبائی وطن ہونے کے باوجود پردیس لگتا۔ بچپن جس مکان میں گزرا ہو اس کو اجاڑ دیکھنے سے چند سکنڈ میں کیا کچھ انسان کے دل پر بیت جاتی ہے۔

لپٹتی ہے بہت یاد وطن جب دامن دل سے
پلٹ کر اک سلام شوق کر لیتا ہوں منزل سے

ان کا شعر ان کے جذبات کی ترجمانی کے لیے کافی ہے۔

اپنے ذاتی استعمال کی چیزیں ہمیشہ بہت احتیاط سے مخصوص جگہ پر رکھتے تھے۔ کسی چیز کو ادھر ادھر کر دینا نہایت ناگوار گزرتا تھا۔ اگر رات کو اندھیرے میں بھی ہاتھ سے اٹھانے کی ضرورت پڑے تو وہ چیز اسی مقام پر ملنی چاہیے۔ کسی کی دخل اندازی قطعاً ناپسند تھی۔ جو بچہ اس کا خیال نہ کرتا اس پر ڈانٹ پڑتی تھی۔ صبح بیدار ہونے پر منھ دھونے کی سختی سے پابندی تا عمر قائم رہی سردی چاہے کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو طبیعت چاہے کتنی خراب ہو مگر یہ کام ہر حالت میں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ سردی بہت تھی اور طبیعت خراب تھی، اماں نے کہا کہ کلی کر کے چائے پی لیجیے، پھر بعد میں منھ دھو لیجیے گا، جب دن ذرا چڑھ آئے پانی گرم کرا کے۔ اس پر بہت غصہ آیا بولے "کلی کر لوں! کلی کر لوں! کلی کر کے میں نے کبھی

پہانسہ پی ہے جو اب پیوں"۔

اپنے مخصوص اصول اور ضابطے کی خود بھی پابندی کرتے تھے اور دوسروں سے بھی اس کی توقع رکھتے تھے۔ کسی کے پاس ملنے جاتے تو اتنی ہی دیر بیٹھتے جتنا مناسب خیال کرتے ضرورت سے زیادہ نہ خود کسی کے پاس وقت گزاری کے لیے بیٹھتے نہ دوسروں کا اپنے پاس بیٹھنا گوارا کرتے تھوڑی دیر تو مروت برتتے۔ لاابالی پن سے باتیں کرنے پر بھی جب اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تو معذرت کے انداز میں کہتے کہ اچھا بھائی صاحب اب میں تو تھکا ہوا ہوں ذرا لیٹنے جاتا ہوں آپ ان لوگوں سے باتیں کریں۔

لکھنؤ میں سسرالی رشتہ داروں کے علاوہ کون تھا مگر کبھی کسی سے ان کے تعلقات کشیدہ ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ ہر ایک کا اس کے رشتے کے لحاظ سے خیال کرتے تھے۔ چند کے علاوہ سب ہی ان سے رشتے میں چھوٹے تھے۔ سالیوں کا اپنی ہی بیٹی اور بہن کی طرح خیال کرتے اور احترام ملحوظ رکھتے اور ان سب نے بھی ہمیشہ ان کا ادب و لحاظ اپنے بڑے بھائی کی طرح ملحوظ رکھا۔

بہن بھائیوں میں سب سے بڑی بھی میں ہی تھی اور ان سے زیادہ مانوس ہونے کے باعث مزاج شناس بھی تھوڑی بہت تھی، لہٰذا وہ مجھ سے کھل کر اکثر اپنے وسیع تجربے اور مطالعے کی روشنی میں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے تھے جس سے آیندہ کام آنے والی بہت سی باتیں مجھ کو مل جاتی تھیں اور ذہن کو جلا۔ زندگی میں اپنی راہیں متعین کرنے کا شعور پیدا ہوا۔ اکثر یہ بھی کہتے تھے کہ میں نے اپنے بچوں کے لیے کچھ نہ کیا بلکہ جو کچھ مجھ کو ورثے میں ملا تھا وہ بھی نہ رکھا۔ پھر خود ہی ہنس کر کہتے کہ چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ میں نے فساد کی کوئی چیز تم لوگوں کے درمیان نہیں چھوڑی، اب تم لوگ خود ہی اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر جو کچھ کرنا چاہو وہ کرو۔ میرا کام دولتِ دنیا کے پیچھے بھاگنا نہیں تھا۔ فطرت نے مجھے جو صلاحیتیں دے کر بھیجا تھا، ان کے مطابق میں اپنا کام کر چکا۔

سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے ہم لوگوں کو کچھ نہ دے کر بھی اتنا کچھ دے دیا کہ مزید مال دنیا سے کچھ دینے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ دنیا میں کم ہی باپ اپنی اولاد کو ایسا سرمایۂ زندگی دے پائے ہوں گے جو زندگی کے ہر کٹھن مرحلے میں ان کے کام آیا ہو۔

تو یہ تھے ان کی اس شخصیت کے چند پہلو جو دنیا کی نگاہوں سے ہمیشہ اوجھل ہی رہتے۔ لکھنے کو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ میرے پیش نظر ہے بحیثیت اولاد مجھے ان سے جتنا قرب حاصل رہا وہ ظاہر ہے۔ اچھائیاں اور برائیاں کس شخص میں نہیں ہوتیں باہر کا حال باہر والے جانیں میں تو ان کے متعلق یہ بات دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ میزان عدل میں اگر ان کی دونوں طرح کی صفات کو پرکھا جائے گا تو ان کی خوبیوں کا پلڑا زیادہ وزنی رہے گا۔

ایک جھوٹ کی عادت، دوسرے ایمان داری کا فقدان، تیسرے گناہ کی ان تین مضبوط جڑوں کو اگر کوئی انسان اپنے اندر پنپنے کا موقع نہ دے تو گناہوں کے بڑے سے بڑے ریلے سے نہ صرف اس کا دامن بچا رہے گا بلکہ اس میں سچائی کی طاقت، بلا کی خود اعتمادی اور کردار میں بلندی پیدا ہو گی اور یہ چیز اس کی فطری صلاحیتوں کے ابھارنے میں ہمیشہ ممد و معاون ثابت ہو گی۔

ایک ہی شے کو مختلف زاویوں سے دیکھا جائے تو متضاد شکلیں بنتی ہیں۔ اسی طرح بھائی ابا کی شخصیت کو مختلف انداز نظر رکھنے والوں نے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور اپنے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ آیندہ زمانے کے لکھنے والے زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں گے، اس وقت تک مخالفت کا گرد و غبار بھی چھٹ چکا ہو گا۔ تحقیقی کام کرنے والوں کو آج بھی تلاش ہوتی ہے، کل اس سے زیادہ ہو گی اور ان کی شخصیت کے صحیح خد و خال پیش کرنے والا کوئی نہ ہو گا۔ ان کے اشعار ہی سے جتنا سمجھا جا سکے گا بس اتنا ہی رُخ دنیا کے سامنے آئے گا باقی سے لاعلمی رہے گی۔ یہی سوچ کر میں نے یہ مضمون لکھا ہے۔ میں نے آنکھ کھول کے جیسا ان کو پایا، باپ کے روپ میں، شوہر کے روپ میں اور بحیثیت انسان کے وہ بلا کم و کاست بغیر کسی تصنع اور بناوٹ کے حقیقی روپ میں ان سطروں میں پیش کر دیا ہے۔

میرزا یگانہ

حیدرآباد دکن کی یادیں

تیس چالیس سال پہلے تک شہر تو شہر قصبات تک میں بھی ایسی ہستیاں موجود تھیں جن سے تہذیبی و ثقافتی رہنمائی ملتی تھی۔ بڑے شہروں میں اہلِ علم و ادب نہ صرف اپنی ذات میں ایک انجمن ہوتے بلکہ ہر انجمن ان کی ذات کی آئینہ دار ہوتی۔ تاریخ ادب میں ایسی انجمنوں کے تذکرے ملتے ہیں اور ایسی ہستیوں کا ذکر آتا ہے جن کے دم قدم سے ہر انجمن رونق پذیر ہوتی۔

ہمارے ہوش میں لالہ سری رام کا دیوان خانہ۔ مسیح الملک حکیم اجمل خان کی صحبتیں، ناصر نذیر فراق اور حسن نظامی کی مجلسیں، پنڈت امرناتھ ساحر کی محفلیں اور آخر آخر میں یارانِ کتب خانہ علم و ادب کے جمگھٹے دلی کی ادبی اور تہذیبی روایات کا سرمایہ تھے۔

حیدرآباد دکن میں بھی ایسے ٹھکانے تھے جہاں ادیب اور شعرا جمع ہوتے ان میں سب سے بڑا مرکز مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی حویلی تھی۔ اس کے علاوہ ضامن کنتوری، باغ بدایونی کے دولت کدے اور جامعہ عثمانیہ کے بعض طلبہ کی محفلیں تھیں۔

فانی بدایونی تیسری بار ۱۹۳۲ء میں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی دعوت پر حیدرآباد آئے: نامپلی ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل ڈیوڈز میں مقیم ہوگئے۔ پھر صلح سرائے میں قیام پذیر ہوئے اور سرکاری ملازمت کے ساتھ جب ملّے پلّی میں سرکاری مکان ملا تو اس میں منتقل ہوگئے۔ مکان کے سامنے میدان تھا۔ شام کو چھڑکاؤ کرکے کرسیاں ڈال دی جاتیں اور اس طرح یہاں فانی کے دوستوں اور قدردانوں کا مجمع لگتا۔ یہ محفلیں شام کے جھٹپٹے میں شروع ہوتیں اور رات بھیگنے تک جاری رہتیں۔ تقریباً روز کے آنے والوں میں حکیم آزاد انصاری، علامہ حیرت بدایونی، نواب یار جنگ سعید، نواب نثار یار جنگ، مرزا آرج، ہوش بلگرامی، جوش ملیح آبادی، علی اختر، یاس یگانہ (جب وہ شہر میں ہوتے)، ماہر القادری، شاہد صدیقی، نجم آفندی، قاضی عبدالغفار اور حرماں خیرآبادی وغیرہ تھے۔ انھی محفلوں میں ادب اور ثقافت کے بہت سے موڑ پڑے لگے۔ انھی محفلوں میں ہمدم مہاراجہ پھبتیوں کی گونج سے بعض تاریخی واقعات نے جنم لیا۔ انھی محفلوں میں غالب کے بام شہرت پر کمندیں ڈالی گئیں۔ انھی محفلوں میں نظیر اکبرآبادی کی عوامی شاعری سے ریچھ کا بچہ برآمد کیا گیا۔

انھی بیٹھکوں میں جوش اور علی اختر کی شاعری کے ناپے گئے اور انھی بیٹھکوں میں ادب پاروں کی جباتی میں نہ جانے کتنے نشتر توڑے گئے۔

فانی اپنے ہم عصروں میں آرزو لکھنوی، حسرت موہانی اور یاس یگانہ کی شاعری کے مداح تھے۔ آرزو لکھنوی سے لکھنؤ کے دورانِ قیام میں پرتپاک ملاقات تھی۔ حسرت اور فانی علیگڑھ کی تعلیمی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور یگانہ سے ان کی دوستی تھی۔ فانی کا یہ شعر:

وہ نامراد اجل بزم یاس میں بھی نہیں

یہاں بھی فانیؔ آوارہ کا پتا نہ ملا۔

یاس یگانہ ہی کی محفلوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فانی اپنے مخصوص ترنم میں یاس کا یہ شعر:

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا

چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے

زانو پر ہاتھ مار مار کر پڑھا کرتے تھے۔

مرزا صاحب اس زمانے میں غالباً عثمان آباد میں سب رجسٹرار تھے۔ جب وہ بلدے میں ہوتے تو باقاعدہ ان محفلوں میں شریک ہوتے اور اپنی ذات سے جانِ محفل ثابت ہوتے۔

مرزا صاحب بڑے طنطنے کے آدمی تھے۔ علمی تمکنت کے ساتھ ساتھ نازک مزاجی بھی مرزا صاحب کا خاصہ تھی۔ مرزا صاحب جوش اور فانی کے دوست تھے، یہ الگ بات کہ انھوں نے ان دونوں کے متعلق (مخالفانہ) رباعیاں بھی کہی ہیں۔ مگر شاعری میں مرزا صاحب کی دوستی کسی سے نہیں تھی اور ویسے بھی اس دوستی میں سب سے بڑی رکاوٹ فانی کی غالب دوستی تھی، فانی غالب کے پرستار اور مرزا صاحب غالب کے دشمن۔

غالب سے مرزا صاحب کی نفرت کا سبب یہ تھا کہ وہ غالب کو ہرگز اس شہرت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے جو اسے حاصل تھی۔ فارسی شاعری جس پر غالب کو ناز تھا اور جس کے متعلق اس کا اپنا دعویٰ تھا:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ

بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

مرزا صاحب کے نزدیک پوچ تھی اور وہ غالب کو متقدم فارسی شعرا کے کلام کا سارق سمجھتے تھے۔ غالب نے خود بھی تقریباً انتیس شعرا کا اپنے کو متبع بتایا ہے اور وہ عرفی، صائب، نظیری، بیدل، شوکت اور علی حزیں وغیرہ کے پورے کے پورے مضامین لے کر ذرا سے ردوبدل کے بعد اپنا کر کے پیش کرتے ہیں اور اس طرح غالب نے چوری اور سینہ زوری کا فارسی گوئی میں مظاہرہ کیا ہے۔

غالب کی اردو شاعری کے متعلق مرزا صاحب کا یہ یقین تھا کہ غالب جس رنگ سخن کے موجد سمجھ

جاتے ہیں۔ ان سے پہلے بھی وہ رنگِ سخن ناسخ نے اور ان کے بعد مومن نے ایجاد کیا اور غالب ایک طرح سے ان دونوں کے تتبع ہیں۔ ویسے بھی محمد حسین آزاد کی طرح مرزا صاحب کا یہ دعویٰ تھا کہ غالب کو اردو نہیں آتی۔

نانی کی ان صحبتوں میں اکثر غالب کی شاعری زیرِ بحث آتی اور غالب کے طرفدار اور سخن فہم ان بحثوں میں شریک ہوتے۔ غالب کے طرفداروں میں فانیؔ، حکیم آزاد انصاری، علامہ حیرتؔ، جوش بلگرامی، اور نواب نثار یار جنگ وغیرہ ہوتے جبکہ سخن فہموں میں یاس یگانہ، جوش ملیح آبادی، نجم آفندی وغیرہ ہوتے۔ خوب خوب بحثیں ہوتیں اور ایک ایک شعر کی وہ جراحی ہوتی کہ بس!! مرزا یاس یگانہ نے غالب کے تمام اردو کلام پر اصلاح کا سلسلہ شروع کیا تھا، ممکن ہے یہ مسودات کہیں محفوظ ہوں۔ غالب کے مطلع دیوان پر مرزا صاحب کو اعتراض یہ تھا کہ "ہر پیکرِ تصویر" غلط ہے کیونکہ تصویر کا ایک ہی پیکر ہوتا ہے اور "پیکرِ ہر تصویر" کہنا چاہیئے تھا۔ مرزا صاحب نے اس پر جو اصلاح دی وہ غالباً کچھ یوں تھی:۔

کاغذی ملبوس میں پیکر ہے ہر تصویر کا

اسی طرح غالب کا یہ شعر:

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

مرزا صاحب کے نزدیک اصلاح طلب تھا اور انہیں "سیلابِ بلا" پر اعتراض تھا۔ یہ درست ہے کہ اب "سیلاب" بہ معنی طوفان استعمال ہوتا ہے لیکن "سیلاب" کے معنی ہیں "سیلِ آب" پھر ویسے بھی "سیلاب بلا" میں لفظی تنافر ہے۔ مرزا صاحب کی اصلاح یہ تھی:۔

کس کے گھر جائے گا یہ سیلِ بلا میرے بعد

ان کا کہنا تھا کہ حرفِ اشارہ "یہ" سے شعر زیادہ پُر معنی ہو گیا ہے اور تنافرِ لفظی کا عیب بھی جاتا رہا۔

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

اس شعر میں مرزا صاحب کو لفظ "ہنگامہ" پر اعتراض تھا اور ان کا کہنا تھا کہ یہ لفظ اس شعر میں کوئی معنی نہیں دیتا۔ مرزا صاحب نے اصلاح اس طرح دی:۔

پیرایۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

مرزا صاحب نے غالب کے بعض شعروں میں ذم بھی تلاش کر لیا تھا مثلاً:

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے

۱۱۴ رشید مومن

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

اگر کوئی کم علم دونوں مصرعوں کے ابتدائی الفاظ کو اعراب کی تبدیلی کے ساتھ پڑھے تو!! یہ مرزا صاحب کی سراسر زیادتی تھی لیکن غالب کے باب میں وہ ایسی زیادتیوں کو روا رکھتے تھے۔

مرزا صاحب غالب کی شاعری سے قطع نظر غالب کے ذاتی "کردار" پر بھی بھرپور وار کرتے اور اس کو کاسہ لیس، خوشامدی، بے غیرت اور نہ جانے کیا کیا تاریخی شواہد سے ثابت کرتے اور اس طرح اس کی مذمت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔

ان صحبتوں میں بعض اوقات ادبی بحثیں ذاتیات کا رنگ اختیار کر جاتیں اور جن کے نتیجے میں بعض ادب پارے بھی تخلیق ہوئے۔ جوش کی نظم "غزل گو شاعر سے خطاب" خالصتاً فانی کے متعلق ہے۔ فانی اور یگانہ نے بھی ایک دوسرے کے متعلق رباعیاں کہی ہیں۔ مثلاً فانی کی یہ رباعی:

کیا خضر طریق کو کے رہزن کہتے
بنتی نہیں موم کو کے آہن کہتے
ورنہ وہ دوستوں نے ایذا دی ہے
شرم آتی ہے دشمن کو بھی دشمن کہتے

غرض یہ صحبتیں اب نقش و نگار طاق نسیاں ہیں لیکن دل کے ساتھ ساتھ ذہن بھی آج تک انھی صحبتوں میں دھڑکتا ہے۔ ان بزرگوں کی دشمنی بھی آج کل کی دوستی سے زیادہ وقیع تھی۔ وہ لوگ صاحب علم تھے آج کل کے ادیب کم سواد ہیں۔ وہ لوگ اختلافِ رائے کے باوجود احترام دوستی میں خلل نہ آنے دیتے تھے۔ ہائے کیا لوگ تھے:

وے صورتیں الہٰی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

میرزا یگانہ

یادیں اور ملاقاتیں

اپنے ابتدائی تعلیمی دور میں جب میں سنٹینل ہائی اسکول لکھنؤ میں زیر تعلیم تھا، میرے اُردو کے ایک شفیق استاد مولوی زین العابدین صاحب مرحوم نے اُردو کچھ اس والہانہ انداز میں پڑھائی کہ باوجود سائنس کا طالب علم ہونے کے مجھے اردو اور خصوصاً اردو غزل سے رفتہ رفتہ عشق سا ہوگیا۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر اس جنگ کی فتح پر جشن ہوئے اور اس سلسلے میں اسکولوں اور کالجوں میں دیگر تقریبات کے ساتھ ساتھ مشاعرے بھی ہوئے۔ مولوی زین العابدین نے مجھ سے کہا کہ تم بھی طرحی غزل کہو اور مصرع طرح دینے کے بعد یہ حکم دیا کہ ایک ہفتے کے اندر چند اشعار کہہ کر مجھے دکھا دو تاکہ مولانا عبدالباری آسی کی زیر صدارت جو مشاعرہ اسکول میں منعقد ہونے والا ہے، اس میں طلبہ کی جانب سے تمہاری شمولیت ہو سکے۔ مصرع طرح یہ تھا:

ہم تو ہیں آشنائے غم عیش نہیں، نہیں سہی

استاد محترم کے حکم پر سر تسلیم خم کرنا لازمی تھا اور میں نے کاوش شروع کر دی، اور آخر کار اردو سے میرا عشق کام آ ہی گیا۔ چند اشعار ہو گئے اور مولانا نے اصلاح فرما دی اور میں نے پہلی بار بحیثیت ایک "طفل شاعر" کے اپنی غزل پڑھی اور مجھے یاد ہے کہ داد بھی توقع سے زیادہ ملی یا یوں کہیے کہ اساتذہ نے میری ہمت افزائی اور دلجوئی فرما کر میرے اور اردو شاعری کے رشتے کو مستحکم تر کر دیا۔

ان دنوں میں میرؔ، غالبؔ، حالیؔ، آتشؔ، شادؔ، حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ، جگرؔ اور جوشؔ کے کلام کو اکثر پڑھ کر محظوظ ہوا کرتا تھا اور پھر انگریزی میں رابندر ناتھ ٹیگور کی لکھی ہوئی مختصر کہانیاں بھی پڑھتا تھا۔ میری میز پر رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک تصویر رکھی رہتی تھی اور بعد میں اس کے ساتھ علامہ اقبالؔ کی تصویر بھی میں نے رکھ دی تھی کیونکہ مسلم لیگ کے توسط سے اقبال کی

شاعری اور خیالات [illegible] اخبارات اور رسائل میں پڑھنے کو ملتے تھے اور میں ان سے [illegible] متاثر بھی تھا۔

اپنے خالو جان میرزا یگانہ کے متعلق اس وقت تک مجھے کچھ بھی نہیں معلوم تھا کیونکہ وہ زیادہ تر اپنی ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد دکن میں رہتے تھے اور جب کبھی چھٹی پر لکھنؤ آتے تو مختصر قیام کرتے تھے۔ اپنی خالہ امی کے ہاں جانا آنا بھی کم ہی تھا کیونکہ میرے والد صاحب جناب نثار حسین نثار لکھنوی مرحوم نے ہم لوگوں کی تعلیم کی سہولت کی خاطر اپنا مکان (پہلا مکان۔ شاہ گنج) چھوڑ کر چند برسوں کے لیے وزیر گنج میں کرائے کے مکان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ محلہ دراصل سنٹینیل اسکول اور لکھنؤ کرسچین کالج سے بہت نزدیک واقع تھا اور میرے والد مجھے انھیں تعلیمی اداروں میں تعلیم دلوانے کے خواہش مند تھے۔ بہر حال جب میں آٹھویں جماعت پاس کر چکا تو والد صاحب نے پھر اپنے مکان شاہ گنج میں منتقل ہونے کا فیصلہ کیا اور میرے لیے ایک سائیکل کا انتظام کر دیا جس پر بیٹھ کر اسکول جانے میں مجھے بھی بڑی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ شاہ گنج منتقل ہونے کے بعد میں اور میرا چھوٹا بھائی وقار (جو آج کل کراچی ہی میں ہے اور عائشہ باوانی کالج کا پرنسپل ہے) اکثر و بیشتر اپنی خالہ امی (بیگم یگانہ) کے پاس ان کی ٹاپے والی گلی، سلطان بہادر روڈ کی رہائش گاہ پر جایا کرتے تھے۔

ایک شام ہم دونوں بھائی، خالہ امی کے گھر حسب معمول پہنچے تو ان کے گھر کے بہت وسیع و عریض آنگن میں امرود کے درخت کے نیچے ایک چارپائی پر جس پر سفید و شفاف چادر اور ایک گاؤ تکیہ رکھا تھا، میرے خالو جان (میرزا یگانہ) گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے حقے سے شغل فرما رہے تھے۔ ہم دونوں نے ادب سے ان کو سلام کیا۔ نزدیک ہی فاصلے پر دوسری چارپائی تھی اس پر خالہ امی پاندان کے پاس بیٹھی سروتے سے ڈلی کاٹ رہی تھیں۔ بولیں "آپ نے ان دونوں بچوں کو پہچانا یہ بچے ذاکرہ بیگم (میری والدہ کا نام) کے ہیں بڑے ذہین، پڑھنے والے اور باادب بچے ہیں۔" خالو جان یہ سن کر اپنی مخصوص پر شفقت مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "آؤ بچو قریب بیٹھ جاؤ۔" پاس ہی دو مونڈھے رکھے تھے ہم دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ والد صاحب، والدہ اور دیگر افراد خانہ کی خیریت دریافت فرما کر بولے "تم لوگوں کو پڑھائی میں کیا کیا شوق ہے؟" ہم دونوں نے اپنے سائنس پڑھنے کے ارادے بتائے، بہت خوش ہوئے اور کہا "خدا تم لوگوں کو کامیاب زندگی عطا فرمائے اور تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔" پھر کچھ دیر حقے سے شغل کرتے رہے جس کا خوشبودار دھواں نزدیک کی فضا کو معطر کر رہا تھا اور اودھ کی مثالی شام کو بھی مہکا رہا تھا۔ یہ تھی ہماری پہلی ملاقات اپنے خالو جان سے . . . . !

اس ملاقات کے بعد ہم لوگ جب اپنے گھر آئے اور کھانے وغیرہ سے فراغت پا کر سب لوگ، آنگن میں بیٹھے تو اتنے ہی میں میرے ماموں سید محمد تقی (ببا صاحب) آگئے اور ابا نے ان سے کہا کہ آج انور اور وقار اپنے خالو جان سے مل کر آئے ہیں، بہت خوش ہیں اور پوچھتے ہیں کہ خالو جان کیا

ہیں اور کیا کرتے ہیں ؟ اس کے بعد ابا اور بڑے ماموں دونوں نے کہا کہ "تمھارے خالو غزل کے کتنے بڑے شاعر ہیں تم کو نہیں معلوم۔ ارے یہ تو ایسے عظیم غزل گو ہیں کہ ان کے صحیح مقام کا تعین آج ممکن نہیں۔ آنے والا دور ہی ان کے مرتبے کو متعین کرے گا۔"

ابا اور بڑے ماموں کے ان جملوں سے مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا کہ میں اُردو سے اس قدر تعلق تو رکھتا ہوں مگر یگانہ کو نہیں جانتا۔ چنانچہ ایک روز پھر ہم لوگ خالہ امی کے گھر گئے اور ان سے کہا کہ مجھے خالو جان کی کوئی چھپی ہوئی کتاب دکھلایئے۔ اس وقت ان کے پاس "آیات وجدانی" اور "نشتر یاس" کے نسخے موجود تھے جو انھوں نے دکھلائے۔ میں نے ان کو اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش کی تو انھوں نے منع کیا کہ تم لوگ چھوٹے ہو کیا سمجھو گے اور پھر یہ کتابیں بغیر خالو جان کی اجازت کے نہیں دی جا سکتیں۔ خالو جان حیدر آباد دکن سے آئے ہوئے تھے۔ ڈرتے ڈرتے ہم لوگوں نے اپنی خواہش ان سے بیان کی کہنے لگے "تم لوگ تو سائنس کے طالب علم ہو کیا کرو گے اس کتاب کو۔ اچھا بتاؤ تمھیں شعر سے بھی کچھ دلچسپی ہے؟" میں نے کہا میں بہت سے شعرا کا کلام پڑھتا رہتا ہوں اور میں نے خود بھی بہت پہلے چند اشعار کہے تھے جو اپنے اسکول کے مشاعرے میں عبدالباری آسی کی صدارت میں پڑھے تھے۔ فوراً متعجب ہو کر کہا "تو پھر وہ شعر مجھے بھی سناؤ۔" میں نے اپنی غزل کا مطلع پڑھا:

سجدوں سے مجھ کو کام ہے کوئی بھی سرزمیں سہی
کعبہ ہو یا کہ دیر ہو یادِ خدا کہیں سہی

مطلع سن کر بہت خوش ہوئے اور خالہ امی سے کہنے لگے "بھئی یگانہ بیگم یہ ذاکیہ بیگم کے لڑکے تو بڑے کمال کے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا۔" اپنے ٹوٹے پھوٹے چند اشعار ختم ہوتے ہی میں نے خالو جان سے کہا "کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ہم لوگوں کو اپنا کلام اسی وقت سنا دیں؟" کہنے لگے "پھر کبھی سہی" لیکن خالہ امی نے ہم لوگوں کی طرف سے غزل سنانے کی سفارش کر دی اور خالو جان کا موڈ بن گیا اور کہنے لگے "ایک غزل سناؤں گا" اور یہ کہہ کر سوچ میں پڑ گئے اور حقے کے کش لگانے لگے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ گرمی کے دن تھے اور شام اودھ کا سہانا سماں تھا، وہی امرود کے درخت کا سایہ اور سفید شفاف بستر والی چارپائی۔ گاؤ تکیے پر ٹیک لگائے ہوئے۔ سامنے حقہ تازہ کیا ہوا رکھا ہوا۔ خالو جان نے حقے کو ایک طرف کیا اور اپنی غزل :

بندہ وہ بندہ جو دم نہ مارے
پیاسا کھڑا ہو دریا کنارے

سنانا شروع کی، ابھی ایک ہی شعر ہوا تھا کہ خالہ امی بولیں "ان بچوں کو تو ترنم سے سنایئے یہ اور خوش ہوں گے۔" مسکرا کر کہنے لگے "اچھا آپ کہتی ہیں تو ترنم ہی سے سناتا ہوں" اور پھر یہی غزل شروع کی۔

خالو جان کو غزل پڑھتے ہوئے سننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ سارا گھر ان کے ترنم سے مسحور ہوگیا۔ گویا "ترنم تھا، اس حسین ترنم اور ایک ایک لفظ کی کیفیت کے ساتھ، خالو جان کا اس میں گم ہو جانا آج تک نہیں بھولا اور شاید ساری عمر اس کی گونج اور خالو جان کا رچ بس کر غزل پڑھنا میرے جسم و روح کے رونگٹے رونگٹے میں بسا رہے گا۔ مجھے یاد ہے کہ بعض اشعار پر تو وہ کیفیت غزل میں اس قدر سمو گئے کہ میں نے ان کی آنکھوں کو بھرا ہوا دیکھا اور غزل ختم ہوتے ہی خالو جان نے سامنے رکھے ہوئے رومال سے اپنی نم آنکھوں کو خشک کیا۔ مجھ پر اور خالہ امی پر بھی یہی کیفیت طاری ہوگئی۔

میں نے ایک اور غزل سنانے کی فرمائش کی مگر خالو جان کہنے لگے "تم نے دیکھا نہیں کہ غزل پڑھتے ہوئے میرا کیا عالم ہوا، اب مجھ میں مزید بیٹھنے کی تاب نہیں ہے" میں اس کیفیت کو خود محسوس کر چکا تھا لہٰذا خاموش ہوگیا۔ پھر خالو جان گویا ہوئے "میری غزل کے مطلع میں جو اشارہ ہے اُسے تم دونوں نے محسوس کیا یا نہیں؟ اگر تمہیں فرزند علی حسین اور ان کے پیکر وفا بھائی عباس کے واقعات معلوم ہیں تو تم کو میری غزل کے مطلع سے تاریخ انسانیت میں ایسے عظیم کیریکٹرز کی شناخت ہو جائے گی جن کی دوسری مثال ممکن نہیں" میں لکھنؤ کی مجالس میں بیٹھ کر غور و فکر سے سننے والوں میں تھا، ان کا اشارہ سمجھ گیا اور فوراً بول پڑا۔ خوش ہو کر خالو جان نے تھپکی دی اور کہا شاباش۔ اس واقعے کے بعد تو یگانہ میری فکر کا محور بن گئے اور میں نے ان کو باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا اور ایک زمانہ تو ایسا تھا کہ میرے جاننے والے مجھے حافظِ کلامِ یگانہ کہنے لگے تھے۔

میرزا صاحب کو ترنم سے پڑھتے ہوئے سننے کا دوسرا موقع ایک بار پھر میسر آیا۔ ماہ رجب میں ولادتِ حضرت علیؑ کے جشن قصیدہ خوانی کے موقعے پر قصر حسینی ٹوریہ گنج کے ہال میں میرزا صاحب بھی آئے ہوئے تھے، میں اور دیگر سامعین میں شریک تھے۔ سب سے آخر میں یگانہ صاحب نے پڑھا۔ ایک رباعی سے ابتدا کی:

کچھ کام کرو کہ چارۂ غم ہے یہی	زخمِ دلِ ناکام کا مرہم ہے یہی
اللہ سے کو لگائے بیٹھے کیا ہو	شیطان سے نپٹ لو کہ مقدم ہے یہی

ترنم اسی والہانہ انداز کا تھا اور میرزا صاحب پڑھنے میں اشعار کی کیفیت و معنویت میں گم ہو چکے تھے۔ رباعی ختم ہوتے ہی میرزا صاحب نے کہا چند اشعار اور سن لیجیے اور پھر یہ کہہ کر "کہیں جسے" کی ردیف والی غزل سنا دی۔

لکھنؤ کی محفل مقاصدہ کے سامعین اس نوعیت کے کلام سے بھڑکے تو ضرور مگر ان کا کلام ختم ہوتے ہی محفل برخاست ہوگئی۔ عام ڈگر سے ہٹ کر قصیدہ خوانی کی محفل میں اصلاح عمل کے اعلان کا یہ طریقۂ کار مجھے تو بے حد بھایا اور میری نظروں میں یگانہ کی عظمت اور بھی اُجاگر ہوگئی۔

اس کے بعد پھر کبھی مجھے خالو جان کو پڑھتے ہوئے سننے کا موقع نصیب نہ ہوا لیکن وہ آواز آج بھی اسی طرح کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ اور جب بھی یاد آتی ہے تو آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں۔

ایک واقعہ اور یاد آرہا ہے جسے قلم بند کرنا ضروری ہے کیونکہ اس واقعے سے یگانہ شناسی میں ضرور مدد ملے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک روز میں تنہا خالہ امی کے گھر گیا تو وہاں دیکھا کہ میرے بڑے ماموں میرزا محمد وصی صاحب (مرحوم) تشریف فرما تھے اور بیٹھے ہوئے خالہ امی سے کچھ باتیں کر رہے تھے مجھے دیکھ کر خوش ہوئے اور مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ باتیں شعر و شاعری ہی پر شروع ہوگئیں۔ کچھ اشعار میں نے بھی سنائے اور وہ اپنی پسند کے مختلف شعرا کے اشعار مزے لے لے کر سنانے لگے۔ میرے اشعار پر انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں داد دی۔ دراصل وصی ماموں کا داد دینے کا طریقہ بڑا انوکھا تھا جس کو بیان کرنا میرے قلم کے بس کی بات نہیں البتہ آغا جان اس طریقۂ داد کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وصی ماموں جب شعر سے متاثر ہو کر معانی کی تہ تک پہنچ جاتے تھے تو واہ وا سبحان اللہ کے ساتھ ساتھ اپنے دل کی عمیق گہرائیوں سے ٹھٹھا مار کر کھلکھلاتے بھی تھے اور میں نے تو نہیں دیکھا مگر آغا جان بتاتے ہیں کہ ان کے لڑکپن کے دور میں اشعار سنانے اور داد دینے کی چند ایسی محفلیں شاہ گنج میں میرے نانا حکیم محمد شفیع صاحب (مرحوم) کے آبائی مکان میں منعقد ہوئی تھیں جن میں وصی ماموں نے داد دینے کا ایک نرالا طریقہ بھی اختیار کیا تھا یعنی وہ داد دینے کی کیفیت میں اپنے سامنے رکھے ہوئے گاؤ تکیوں کو دانتوں سے نوچ کر پھاڑتے ہوئے واہ وا کے نعروں میں گم ہو جایا کرتے تھے۔ بہر حال یہی وصی ماموں اس روز شعر سناتے سناتے کہنے لگے کہ اپنے خالو جان یگانہ صاحب کے بھی کچھ شعر سن لو۔ بے مثل اشعار ہیں کیا کہنا۔ اور پھر چند شعر پڑھ کر سنا دیے۔ دور کہیں خالو جان (یگانہ صاحب) بھی سن رہے تھے۔ دراصل میرے ماموں وصی صاحب کی تعلیمی استعداد بس اتنی تھی کہ اردو میں مشکل سے لکھ پڑھ لیتے تھے مگر شعر فہمی بلا کی تھی۔ ریلوے میں ملازمت کرتے تھے اور نہایت ہی سادہ شریف النفس اور مخلص انسان تھے۔ میرزا یگانہ صاحب بھی رشتے میں ان کی بزرگی کی وجہ سے ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ اس روز انھوں نے خالہ امی کو الگ بلا کر یہ بات کہی کہ آپ بھائی صاحب سے اگر اس بات کو اپنی طرف سے کہہ دیں کہ وہ میرے سامنے میرے اشعار نہ پڑھا کریں تو میری عزت افزائی ہوگی۔ یہ بات بہر حال یہیں پر ختم ہوگئی لیکن میں نے بات کو کریدنے کی کوشش کی اور خالو جان سے پوچھا کہ ایسی خواہش ان کو کیوں ہے؟ کہنے لگے "تم کو نہیں معلوم کہ میں اپنے اشعار کو یگانہ آرٹ کہتا ہوں اور شعر اسی وقت آرٹ کی منزل کو پہنچتا ہے جب اس میں ایک ایک لفظ اپنی جگہ پر اٹل ہو اور اس کی ادائی بھی الفاظ کے صحیح اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہو سکے۔ بھائی صاحب جب میرے اشعار پڑھتے ہیں تو ان کی ادائی نامناسب ہونے کے باعث شعر اپنی اصل کیفیت دینے سے

محروم معلوم ہونے لگتا ہے اور مجھے شعر کی اس محرومی پر دلی صدمہ پہنچتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ یہ کان اس مرثیہ ادائی اشعار سے ناآشنا ہی رہیں تو اچھا ہے۔ ورنہ اور کوئی بات نہیں جس کا جیسے جی چاہے پڑھے مگر مجھے تو نہ معلوم ہوتا کہ میں اس کرب میں نہ مبتلا ہوں"۔ یہ واقعہ ویسے تو بہت غیر اہم اور چھوٹا سا معلوم ہوتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یگانہ کو سمجھنے کے لیے، ان کے گوشۂ دل میں شعر کی منزلت کا اندازہ لگانے کے لیے، اس واقعے میں نہ معلوم کتنا مواد پنہاں ہے؟

خالو جان کے ساتھ اہل خاندان کا ایک دسترخوان پر کھانا اور آداب دسترخوان سے ان کی دلچسپی کا بھی ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ میرزا صاحب کو پائے بہت پسند تھے، بھنی ہوئی پالک کی سبزی بھی بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے خود خواہش کی کہ وہ شاہ گنج کے گھر پر سب اہل خانہ کی پائے کی دعوت کریں گے جس میں نانی جان (میرزا یگانہ کی خوشدامن صاحبہ) بھی شریک ہوں گی۔ چنانچہ پائے پکانے والے کو ببا ماموں کے توسط سے آرڈر دے دیا گیا اور خمیری روٹی (نان) کا انتظام کیا گیا۔ مکان کے بڑے کمرے میں زمین کا فرش بچھا دیا گیا اور ایک بڑا دسترخوان لگا دیا گیا۔ سب چھوٹے بڑے خصوصی طور پر خالو جان صاحب کی نگرانی میں بٹھا دیئے گئے۔ وسط میں نانی جان صاحبہ کو لاکر بصد احترام و خلوص خالو جان نے بٹھایا۔ دوسری جانب وسط میں خالو جان، ان کے دائیں بائیں جانب میرے والد اور ببا ماموں بیٹھے۔ ہم لوگ نانی جان اور والدہ صاحبہ کے اردگرد خالو جان کے سامنے بیٹھ گئے۔ کسی کو پہل کرنے کی مجال نہ تھی۔ خالو جان نے بسم اللہ کہا اور پھر نانی جان سے درخواست کی کہ آپ شروع کریں۔ نانی جان کے بعد دوسروں نے پائے اپنی اپنی پلیٹوں میں نکالے اور جب تک نانی جان نے پہلا نوالہ نوش نہیں کیا کسی نے بھی ایک لقمہ منہ میں نہ رکھا۔ ان کے شروع کرنے کے بعد خالو جان نے پھر بسم اللہ کہا اور اس طرح بڑے ادب و احترام سے سب نے کھانا شروع کیا اور خالو جان محبت اور خلوص سے سب کو دعوتِ طعام دیتے رہے۔ لیموں، پیاز اور مصالحہ وغیرہ خود پیش کرتے رہے۔ خود بہت ہی مختصر سا کھانا تناول کیا اور کھانے کے درمیان سب کو کھلا کر شاد ہوتے رہے۔ کھانے اور دسترخوان کا وہ اہتمام اور آداب پھر کبھی نہ میسر ہو سکے۔ اب نہ وہ طریقہ رہا نہ وہ بزرگ رہے اور نہ وہ تہذیب ہے۔

اسی ضمن میں مجھے اپنا ایک اور واقعہ بھی یاد آگیا۔ یگانہ خالو ایک روز گرمی کے دنوں میں شام کو شاہ گنج تشریف لائے کچھ دیر قیام کیا، باتیں ہوتی رہیں اور پھر کہنے لگے اب چلتا ہوں اور جاتے ہوئے کہنے لگے "انصار میاں میرے ساتھ چلتے ہو پانی پینے چلیں"۔ میں نے کہا "ٹھنڈا پانی لاکر پیش کردوں؟" کہنے لگے "نہیں آؤ میرے ساتھ چلو"۔ شاہ گنج کی گلی سے نکل کر نخاس کے چوراہے تک آگئے، پھر ایک تکیے والے کو بلا کر کہا گول دروازہ جاکر بیٹھو گے۔ اس نے کہا ہاں حضور چلیے بس خالو ...

کے ساتھ رکشہ میں بیٹھ گیا۔ شعر و ادب کی باتیں اور اپنے ساتھ اہل لکھنؤ کے رویے کا تذکرہ کرتے ہوئے وقت گزر گیا، اور گول دروازے کے سامنے ہی کولڈ ڈرنک کی دوکان والے سے کہا "دو بوتل لادو، مگر خوب ٹھنڈا ہو یا پھر گلاس میں برف ڈال کر لاؤ"۔ دوکاندار میرزا صاحب اور ان کے رتبے سے واقف تھا، خود کاؤنٹر سے اتر آیا اور ایک چھوٹی سی گول کشتی میں بڑے ادب و احترام سے دو گلاس رکشے کے پاس ہی لاکر پیش کیے اور پوچھا حضور! ٹھنڈا ہے یا اور برف حاضر کروں۔ خالو جان اتنی ٹھنڈک سے مطمئن تھے کہنے لگے "تمہارا بہت بہت شکریہ! پانی بڑا ٹھنڈا ہے، جی خوش ہو گیا"۔ گلاس ختم ہوتے ہی مجھ سے کہنے لگے "انصار! اور پیو گے؟" میں نے کہا، جی نہیں۔ اپنی جیب سے بٹوا نکال کر پیسے دیے اور رکشہ والے سے کہا "نخاس واپس چلو"۔ نخاس میں مجھے چھوڑ دیا اور کہا "اب تم تو واپس گھر جا سکتے ہو، میں خود ٹاپلے والی گلی چلا جاؤں گا"۔

یادوں کے اس سلسلے میں ایک یاد وہ بھی ہے جب میرزا یگانہ پاکستان تشریف لائے تھے اور لاہور میں ایک یا دو یوم کے زائد المیعاد قیام کے سلسلے میں زیر حراست لے لیے گئے تھے۔ جب وہ پاکستان سے ہندوستان واپس پہنچے تو دو ایک روز کے بعد ہی شاہ گنج رات کے وقت تشریف لائے۔ میرے گھر کے صحن میں بیٹھک لگی ہوئی تھی۔ بتا ماموں، ابا اور گھر کے سب لوگ موجود تھے۔ مختلف انواع کی باتیں شروع ہو گئیں۔ میں نے اسی دوران میرزا صاحب سے سوال کیا، آپ اپنے حالیہ سفر کے کچھ تاثرات بتلایئے۔ کچھ دیر ان پر سکوت طاری ہو گیا اور پھر ایک دم کہنے لگے، پہلے ایک رباعی سنو:

دنیا سے الگ بیٹھے ہو دامن جھاڑے
بکھرائے ہوئے بال گریباں پھاڑے
روٹھے تو سہی پھر بھی نہ پیچھا چھوڑا
گھر چھوڑ کے جا بیٹھے کہاں پچھواڑے

رباعی ختم کرتے ہی کہنے لگے "تمھیں اپنے سوال کا جواب تو مل گیا ہو گا؟" میں نے کہا "جی ہاں آپ کی بڑی مہربانی، رباعی بڑی جامع ہے اور اس میں بہت کچھ ہے"۔ اس کے بعد میں خالو جان سے پھر کبھی نہ مل سکا۔ میں پاکستان آگیا اور وہ ہندوستان میں رہ گئے۔ خط و کتابت کا بھی کوئی سلسلہ جاری نہ رکھ سکا، یہ میری کوتاہی اور بدقسمتی ہے۔ خط کا سلسلہ شروع ہوا بھی تو ایک ایسے جانکاہ واقعے کے بعد جس کے ذکر سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک روز شام کو مارٹن روڈ کی امام بارگاہ (کراچی) کے ریڈنگ روم میں میں شام کا اخبار ایوننگ اسٹار پڑھ رہا تھا کہ یکایک ایک سرخی پر نگاہ جم کر رہ گئی جو لکھنؤ میں ایک شاعر سے بدسلوکی کے واقعے سے متعلق تھی۔ خبر مکمل پڑھی تو میں سکتے

میں آگیا۔ اسی خبر میں میرے خالو میرزا یگانہ ہی کا تذکرہ تھا جس میں لکھنؤ جیسے گہوارۂ تہذیب و ادب میں ایسا ناخوشگوار واقعہ رونما ہوا تھا یعنی ایک مہم کے ذریعے میرزا یگانہ کی بے حرمتی سرِعام کی گئی تھی۔ واقعے کی نوعیت سے افسردہ و غمگین تھا۔ سوچا کہ خالو جان کی تشفی کے لیے کچھ کلمات تحریر کردوں۔ چنانچہ ان کو خط لکھا جس میں اس خبر پر اپنے گہرے صدمے کا اظہار اور زمانے کے پُرآشوب ماحول کے بارے میں چند کلمے تحریر تھے۔ خالو جان نے اس خط کا جواب دیا تھا۔ شاید وہ خط میرے کاغذات کے کسی بلندے میں اب بھی ہو مگر مجھے یاد ہے کہ خالو جان نے اس میں تحریر کیا تھا کہ "تم وہاں پُرسکون طور پر اپنے مشن اور تعلیم سے وابستہ رہو۔ میں بخیریت اور مطمئن ہوں کہ اہلِ زمانہ نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے ان سے مجھے یہی توقع تھی۔ اسی شہر میں مصحفی کی کیا گت بنی تھی، آج پھر وہی تاریخ دہرائی گئی ہے۔ میری بے حرمتی کرنے والوں نے اپنے طور پر مجھے جسمانی اذیتیں ضرور دی ہیں مگر وہ میرے ضمیر کو ایک انچ بھی ٹھیس نہ پہنچا سکے۔ بہرحال تم کبیدہ خاطر نہ ہو۔ میں اپنی زندگی کے ان مراحل میں ہوں جن میں فطرت اپنا عمل مکمل کردیتی ہے۔"

میرے اس شخصی مضمون کو پڑھنے والے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یگانہ کتنے عالی ظرف انسان تھے۔ انھوں نے لوگوں کی سطحِ ذہنی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان کے ردِعمل کو فطری جانا اور اس کے برخلاف کسی دوسرے عمل کی ان سے توقع بھی نہیں کی۔ یہ ہے ایک فطرت شناس شاعر کا دل۔ جبھی تو میرزا یگانہ کے ہر شعر پر ان کی اتنی گہری چھاپ ہے۔ جوں جوں ان پر تحقیق ہوتی جائے گی، ان کی شخصیت اور شاعری اپنے مقام کو منواتی جائے گی اور وہ تاریخِ ادب میں مقامِ منفرد منوا ہی لیں گے۔

اب آخر میں ایک اور ذکر کرتے ہوئے اپنے مضمون کی تکمیل کروں گا۔ یہ ذکر اس وقت کا ہے جب میرزا یگانہ اس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئے۔ میرزا صاحب کے انتقال کے بعد جب میں ہندوستان گیا تو اپنی والدہ اور بیتا ماموں سے ان کے آخری ایام کا تذکرہ ہوا۔ میں مختلف سوال کرتا گیا اور وہ لوگ حالات بتاتے رہے۔ میری والدہ نے بتایا کہ انتقال سے ایک شب قبل انھوں نے میری اماں، میری خالہ (رافیہ بیگم) اور میری بھاوج خورشید بشارت (مرحوم) کو بلایا اور کہنے لگے: "ذاکیہ بیگم (میری والدہ کا نام ہے) اس وقت طبیعت کچھ بہتر ہے مگر پیروں پر ورم آچکا ہے، میں اپنے سفر کی آخری منزل پر ہوں۔" اماں نے بتایا کہ پھر کہنے لگے: "دیکھو ذاکیہ بیگم میں کچھ پڑھ رہا ہوں تم لوگ غور سے سنو۔" یہ کہہ کر وہ کلمے کی تلاوت کرنے لگے اور ختم کرتے ہی سوال کیا: "ذاکیہ بیگم میں نے کلمہ درست پڑھا ہے؟" اماں نے جواب دیا "جی بھائی صاحب بالکل درست پڑھا ہے۔" (یہ کلمہ فقہِ جعفریہ کے مطابق تھا) - یہ سن کر کہنے لگے: "خدا کا شکر ہے۔ یہ دنیا والے تو مجھے کافر، ملحد اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ تم لوگ گواہ ہو کہ میں کس کلمے اور مسلک پر ساری عمر کاربند رہا۔" یہ کہہ کر کچھ

دیر کے لیے اندر ہی آرام فرمانے گئے اور اسے روز انتقال کر گئے۔ اب کفن دفن کی منزل سامنے آئی۔ سب نے بتایا کہ ببا ماموں نے نواب شمس فاضل حسین کی کربلا واقع تال کٹورہ روڈ لکھنؤ میں روضے کے چبوترے پر قبر کے لیے زمین حاصل کی اور قبر تیار کرنے کا انتظام کر کے گھر آگئے۔ ادھر ابا اور ببا ماموں کا لڑکا فیروز عالم کفن وغیرہ کے انتظام میں لگ گئے۔ لکھنؤ کے شیعوں کے رواج کے مطابق میت غسل خانہ پاٹا نالہ لے جائی گئی اور وہاں غسال نے غسل دینا شروع کر دیا۔ اسی دوران وہاں کچھ لوگ پہنچے جو یہ خبر لے کر گئے تھے کہ اس میت کو غسل نہ دیا جائے، جناب سعید الملت کا فتویٰ ہے۔ بہرحال غسال انسانیت کے کچھ اعلیٰ مرتبہ پر ہی تھا کہ اس نے غسل شروع ہو جانے کے بعد غسل روکنا خلاف انسانیت تصور کیا اور اس طرح غسل دے دیا گیا۔ میت جب چلی تو میت لے جانے والوں اور نقیب کے علاوہ میرے والد، ببا ماموں، فیروز عالم (ببا صاحب کا بیٹا)، رضی صاحب (ابا کے ایک دوست) یگانہ خالو کا ایک خدمت گار، اسلم (ببا ماموں کا چھوٹا بیٹا) کل چھ یا پھر ایک کوئی اور (مجھے نام نہیں یاد آرہا ہے) ساتھ تھے وکٹوریہ گنج کے چوراہے کے قریب پروفیسر مسعود حسن ادیب نے بھی شرکت کی وہ چند قدم جنازے کے ساتھ چلے اور اپنی کوٹھی واپس چلے گئے۔ یہ تھے ایک عظیم شاعر کے جنازے میں شریک ہونے والے لوگ، بہرحال میت دفن کر دی گئی اور میرزا ابدی نیند میں محو ہو گئے۔ بعد میں میرزا یگانہ کی بیٹی مریم جہاں نے ایک کتبہ نصب کرا دیا جس پر میرزا کا سن پیدائش و وفات اور یہ شعر بھی لکھا ہوا ہے:

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
آہ! کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

میرزا کا یہ شعر ان کے مزار پر نصب ہو کر ہمیشہ اس بات کی گواہی دیتا رہے گا کہ میرزا ناحق پرستی کے قائل نہ تھے۔ یا حق پرستی یا خود پرستی، ان کو بھاتی تھی اور میں تو یہ کہوں گا کہ ان کی خود پرستی بھی درحقیقت حق پرستی ہی تھی اور انھوں نے خود بھی تو یہی کہا ہے کہ:

میری خود پرستی بھی عین حق پرستی ہے

یہ تیس برس کا قصہ ہے

شہرہ ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا
واللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

میرزا یگانہ سے میری ملاقات لاہور میں انجمن[1] اربابِ علم کے مشاعرے میں ۱۹۲۶ء میں ہوئی وہ جگر مرادآبادی اور اصغر گونڈوی کے ہمراہ خاص طور پر اس مشاعرے میں شرکت کے لیے لکھنؤ سے تشریف لائے تھے۔ اُن دنوں یاسؔ تخلص فرماتے تھے۔ یادگار آتشؔ کہلاتے تھے، مگر ابھی چنگیزی نہ ہوئے تھے۔ مشاعرہ الیس پی الیس کے ہال میں تھا۔ ایسی محفلوں میں جو رونق ان دنوں ہوتی تھی۔ اب دیکھنے میں نہیں آتی حفیظ[2] کے ہمراہ میں بھی جلسے میں حاضر تھا۔ میرزا اپنا کلام سنانے کے لیے سب سے آخر میں تشریف لائے اور محفل پر کچھ اس طرح چھائے کہ باید و شاید۔ ان کے ترنم، پڑھنے کا طریقہ، ادائی کا سلیقہ اور پھر اشعار کہ روحِ شاعری اور معراجِ کمالِ فن تھے ان سب نے مل کر وہ سماں پیدا کیا کہ لاہور کی محفلوں میں یہ چیز پہلے پیدا نہ ہوئی تھی۔

میں نے بھی غزل پڑھی۔ ان دنوں میں بھی مشاعرے پڑھتا تھا۔ میرزا نے میرے ایک شعر پر بے ساختہ داد دی "واہ میاں شعلہ! خوب شعر کہا ہے"۔ یوں تو مجھے جاننے والے اور بھی بہت لوگ مشاعرے میں موجود تھے مگر انہوں نے داد نہیں دی تھی۔ حفیظ خاموش رہے کہ ادنیٰ شاگرد کو داد کیا دیتے۔ ہری چند اختر چپ رہے کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ شعر خود کہہ کر دیا ہو گا۔ جبھی بڑھ بڑھ کر داد دے رہے ہیں۔ مولانا تاجور کو از روئے مصلحت خاموش رہنا تھا کہ میرے گرامی قدر استاد کے حریف تھے۔ جگر اور اصغر بول ہی نہ سکتے تھے کہ گلے پانوں سے بھرے پڑے تھے، منہ کھولتے

---

[1] انجمن اربابِ علم: مولانا تاجور نجیب آبادی مغفور کے زیرِ اہتمام ماہانہ مشاعرے اسی بزم ادب کے نام سے منعقد ہوتے تھے اور یہ تصنیف و تالیف کا مرکز بھی تھی۔ اس مرکز سے وہ ادبی رسالے شائع کرتے تھے

[2] ابوالاثر حفیظ: میرے استاد گرامی۔

تو پیک ٹپک پڑتی ۔ پنجاب میں پان کا استعمال عام نہ تھا کہ گھنٹوں جگالی کرنا پڑتی تھی اور رال ٹپکنا یا ٹپکانا تو شرفا کے یہاں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ میرزا نے مجھے داد دی یا پھر کالج کے ہنسوڑ اور بے تکلف طالب علموں نے ۔۔۔۔ بھئی واہ ۔ یہ صورت اور یہ شعر، واہ بھئی واہ! یوں تو لاہور رنگینیوں سے بھرا پڑا تھا مگر طلبہ کے کم خرچ بالانشین قسم کے مشغلے سینما کے علاوہ مناظر کا تماشا کرنا یا رونق بازار کی سیر تھا۔ رونق بازار میری ذاتی اختراع ہے اور اس بازار سے متعلق ہے۔ جہاں گہری شام ہونے پر قمقمے جگمگانے اور جام سے جام ٹکرانے لگتے ہیں، کالج کے بے فکرے جنت کا تماشا کرنے ہر شام یہاں آپہنچتے تھے۔ جن کی جیب گرم ہوتی وہ خون گرم کرتے، مزے لیتے، داد عیش دیتے، ورنہ حسن لب بام کے نظاروں سے تشنگیٔ قلب و نظر کو سیراب کرتے اور دل کو آسودۂ جلوہ عام بہ ہر گام۔

مَیں نے سنا کہ میرزا کو جلد واپس چلے جانا ہے۔ میں اُن کے کلام سے اس قدر متاثر ہوا کہ قریب سے دیکھنے اور ملاقات کی آرزو بہ شدت ہوئی۔ محفل برخاست ہونے پر صدر دروازے پر منتظر رہا کہ وہ آئیں تو اظہار تمنا کروں۔ کچھ دیر میں وہ سربرآوردہ شعراء کے ہمراہ مولانا تاجور کی معیت میں باہر آئے تو مَیں نے عرض کی کہ "حضور اگر آپ کل تک یہیں رہیں تو مجھے شرف نیاز کا موقع عطا فرمایئے احسان ہوگا۔" میرزا نے فرمایا: "کیوں بھئی، ایسی کیا بات ہے جب جی میں آئے چلے آؤ، میں دو چار دن تو ابھی رکوں گا ہی۔" مَیں نے جائے قیام کا پتا پوچھا تو مولانا تاجور نے کہا: "دیکھو میاں کل میرے دفتر میں آجانا۔ ملاقات ہو جائے گی۔ کافی رات جا چکی ہے اور یہاں اب ٹھہرنے کی گنجائش نہیں۔" کیونکہ وقت کا تعین نہ ہو سکا تھا مَیں صبح ہی دوسرے دن دس بجے مولانا کے دفتر واقع چنگڑ محلہ پہنچا۔ معلوم ہوا نہ مولانا اب تک آئے ہیں نہ میرزا؛ اور یہ کہ اگر مجھے میرزا سے جلد ملنا ہو تو ان کی رہائش گاہ پر مل لوں۔ یہ جگہ دفتر کے قریب ہی ایک عمارت میں تھی۔ میرزا بالاخانے کے ایک کمرے میں فرد کش تھے۔ مَیں پہنچا تو میرزا پلنگ پر رونق افروز تھے۔ حاضری کی درخواست پر آنکھیں اُٹھائیں، دیکھا تو پہچان لیا۔ فرمایا "آؤ بھئی اندر چلے آؤ۔" دو کرسیاں پاس بچھی ہوئی تھیں، ایک پر ایک صاحب (حفظ الرحمٰن منہاس) پہلے سے تشریف فرما تھے۔ خالی کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ بیٹھ جاؤ۔ مَیں نے عرض کی کہ مولانا کے یہاں سے ہو کر آرہا ہوں۔ فرمایا کہ "مَیں نے وہاں آنے کو کب کہا تھا۔ اگر کہا ہوتا تو ضرور پہنچتا۔ ہم رواداری میں تھے، رات کو تو کچھ طے ہی نہ ہوا تھا۔" یہ بات صحیح تھی۔ اتنے میں کچھ اور لوگ آگئے۔ باتیں ہوتی رہیں۔ میرزا سگریٹ پیتے رہے، باتیں سنتے رہے۔ اگر لوگ آپس میں باتیں کرنے لگتے تو بے تعلق سے ہو جاتے، دوسروں کی بحث میں نہ اُلجھتے خواہ زیر بحث مسئلہ

کتنا ہی اہم ہو، روئے سخن ان کی طرف ہوتا تو جواب نہ دیتے۔ براہ راست رائے طلب کی جاتی تو رائے دیتے۔ اپنی برتری کا سکہ بٹھانے کے لیے عام ادیبوں کی طرح خواہ مخواہ لیکچر نہ جھاڑتے۔ دوپہر تک اکثر لوگ رخصت ہو چکے تھے۔ میں نے بھی اجازت چاہی اور ساتھ ہی شام کے کھانے کے لیے انہیں مدعو کیا۔ مسکرا کر فرمایا: "اس کی کیا احتیاج ہے، کھانا تو جہاں بیٹھے ہیں وہاں بھی مل جائے گا۔" میں نے عرض کی: "حضور کا قرب بھی میسر ہو گا۔" فرمایا: "بیٹھے رہو ابھی کھانا آتا ہو گا سب مل کر کھا لیں گے۔ شام کا کھانا بھی یہاں کھاؤ، اس سے زیادہ قرب کیا ممکن ہے۔" میں لاجواب ہو گیا اُس وقت تو خیر اُٹھ گیا، شام کا کھانا وہیں کیا اور دیر تک فیضان صحبت حاصل کرتا رہا۔ میرزا انتہا درجے کے صاف گو تھے۔ مذاق اس قدر سلجھا ہوا تھا کہ اس سے بہتر میرے مشاہدے میں نہیں آیا۔ میرزا پہلی مرتبہ جب لاہور آئے تو وہاں کئی دن ٹھہرے۔ میں قریب قریب ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ کبھی وہ میرے یہاں تشریف لاتے۔ چند ہی دنوں میں ان کی توجہ اور نوازش عام ہونے لگی۔ ملنے کو انہی دنوں حضرت اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی سے بھی ملا تھا۔ ان میں ایک پیر پرست دوسرا مے پرست، اور اپنی اپنی جگہ واجب الاحترام، مگر میری نگاہیں تو فن پرست کی تلاش میں تھیں، ان کی تسکین میرزا کے قدموں کے سوا اور کہاں ممکن تھی۔ پہلے قیام کے دو ایک واقعے مجھے اب تک یاد ہیں جن سے ان کے باطن کا کچھ سراغ ملتا تھا۔

ایک دن ایک دوست نے ایک سے زیادہ شادیوں سے متعلق آپ کی رائے دریافت کی تو فرمایا: "ایک ہی سے وفا مشکل ہے ایک سے زیادہ سے وفا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ انسانی فطرت سے بعید ہے۔"

میرزا سے میری وابستگی کی مدت ۳۰ برس ہے۔ لاہور میں وہ جس قدر رہے میں قریب قریب ہمراہ رہا۔ دکن گئے تو ہر دو برس میں ایک مرتبہ رخصت پہ آتے تو پندرہ بیس روز کے لیے لاہور بھی آتے۔ میرزا مجھے اپنے خاص نیاز مندوں میں شمار فرماتے تھے۔ مجھے کوئی ایسی ملاقات یا گفتگو یاد نہیں کہ انھوں نے خدا، حالات یا دنیا کی شکایت کی ہو، یہ ان کی افتاد طبع کے خلاف تھا۔ دنیا اور دنیا والوں کی دل تنگی کو خوب جانتے تھے۔ اور اس کم ظرفی کو مجبوری پر محمول فرماتے تھے۔ وہ مجبوری، ناساعدت حالات سے متعلق ہو، خامئ تربیت سے یا انعام قدرت سے وہ ہرگز کسی کو اپنی مصیبت کے لیے ذمہ دار نہ سمجھتے تھے۔ کڑی سے کڑی مصیبت کو مردانہ وار جھیلتے اور خوش رہتے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

ناخدا از من بگذر سوئے دیگراں بنگر

کار من بر دریا در دست و پا زدن تنہا

اور پھر یہ بھی کہ :

اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور
بے ربطیٔ نوشتۂ تقدیر دیکھنا

میرزا نے شراب عمر بھر نہ چکھی۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھا: "شاعر عموماً سخن گوئی میں آسانی پیدا کرنے کے لیے شراب پیتے ہیں، آپ استعمال کیوں نہیں فرماتے۔" میرزا نے جواب دیا، "میاں، اگر تم شعر سمجھتے ہو تو میرے کلام کا شعرائے مے نوش کے کلام سے مقابلہ کر لو۔ خود سمجھ لو گے کہ شعر کی راہ میں مجھے کسی اضافی سہارے کی ضرورت نہیں۔ شدت، جذبات و احساس زندہ کی میرے یہاں کیا کمی ہے کہ شراب پی کر جذبۂ بے اصل طاری کر لوں۔" دل کے معاملات میں بھی عمر بھر ان سے کوئی لغزش نہ ہوئی۔ ان کا عشق اپنے گھر کی چہار دیواری تک محدود تھا۔

میرے والد میرزا کو بہت ملتے تھے اور بڑی عزت کرتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں میری شادی ہونا قرار پائی تو ان کو خاص طور پر اطلاع دی اور شرکت کے لیے دعوت بھی۔ والد کو معلوم تھا کہ میرزا مجھے ویسے ہی عزیز رکھتے ہیں جیسے والد خود۔ لاتور (دکن) سے میرزا خاص طور پر میری شادی میں شریک ہونے تشریف لائے۔ میرے لیے قنوج کا عطر لائے۔ دلھن کے لیے دوپٹہ۔ وہ ان دنوں ۴۰/- روپیہ ماہوار مشاہرہ پاتے تھے۔ والد نے سہرے کی فرمائش کی۔ میرزا بہت سٹپٹائے۔ کسی کی تعریف میں شعر کہنا ان کے مسلک اور ذاتی عقیدے کے خلاف تھا۔ سہرا کیوں کہہ کتے۔ والد نے ان کی خاموشی پر کہا: "اپنے بیٹے کے لیے سہرا نہ کہیے گا تو کس کے لیے کہیے گا۔" میرزا نے فرمایا: "لالہ جی! اس بچے کے لیے موتیوں کا سہرا کہیے تو لے آؤں۔ پھولوں کا فرمائیے تو حاضر کر دوں اور شادی کے موقع پر یہ سہرے ہی مناسب بھی ہیں۔ لفظوں اور حرفوں کے سہرے کو کیا کیجیے گا کہ مبالغے کے سوا ان میں کچھ نہیں ہوتا۔" والد بھی ادا شناس تھے، مسکرا کر چپ ہو گئے۔ میرزا کے جواب کا یہ اثر ہوا کہ والد نے یہ فرمائش دوسرے شعراء سے بھی نہ کی، ورنہ ان کی پوری کھیپ موجود تھی جن میں میرے استاد گرامی ابو الاثر حفیظ جالندھری، پنڈت ہری چند اختر اور میرزا فہیم بیگ ایسے ممتاز حضرات بھی شامل تھے۔ محبت کا بہر کیف یہ عالم تھا کہ میرزا رخصتی کے بعد عام کناروں کے ہمراہ میری بیوی کے ڈولے کو دوش بدوش کاندھا دیتے اور دعائیں دیتے گھر لائے۔

میرزا کس قدر عالی ظرف تھے، وہ اس سلکنے سے ثابت ہے جو ان کے آخری زمانۂ حیات میں لکھنؤ میں پیش آیا۔ ہوا یہ کہ چند لوگ انھیں رسوا کرنے پر آمادہ ہوئے۔ میرزا ان دنوں میں سلطان بہادر روڈ کی ایک حویلی کے اندرونی حصے میں اقامت پذیر تھے۔ وہ لوگ جن کے سرغنہ لکھنؤ کے بدنام غنڈے تھے، میرزا کے مکان پر آئے، صدر دروازے پر دستک دی۔ میرزا حسب

معمول اپنے تخت پر بیٹھے مطالعے میں مصروف تھے۔ آواز دے کر اندر بلا لیا۔ لوگوں نے کمال ادب سے ان کی تعریف کرنا شروع کی اور کہا کہ وہ ان کا جلوس نکالنا چاہتے ہیں۔ میرزا نے فرمایا کہ وہ ہرگز ایسی عزت افزائی کے مستحق نہیں۔ وہ لوگ نہ مانے۔ بزور انھیں کھینچ کر لے گئے۔ گدھے پر سوار کیا، جوتوں کا ہار گلے میں ڈالا اور گدھے کو ہانکتے لے نکلے۔ کچھ دور پہنچے تو پولیس نے مداخلت کی اور چند شرانگیزوں کو گرفتار کر لیا۔ میرزا بھی ہمراہ تھے۔ وہ قانونی پیروی نہ کرنا چاہتے تھے کہ ان کا خیال یہ تھا کہ جو کچھ شرپسندوں نے کیا وہ دیانت داری سے تھا کہ وہ اپنے علم کی روشنی میں یہیں تک پہنچ سکتے تھے۔ میرزا مجھ سے جب یہ واقعہ بیان فرما رہے تھے تو ان کا چہرہ جذبات سے قطعی عاری تھا۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا اس حادثے سے نہ صرف ان کا کوئی تعلق نہیں بلکہ واقعاتی لحاظ سے بھی اہمیت نہیں رکھتا۔

لاہور میں "آیات وجدانی" کا پہلا ایڈیشن چھپا تو ناشر نے انھیں پانچ سو روپے بطور معاوضہ دینے منظور کیے۔ سو روپے مسودہ حاصل کرتے وقت دے دیے باقی وعدہ۔ چند ماہ میں کتاب شائع ہو گئی۔ میرزا تقاضا کرنا تو خیر جانتے ہی نہ تھے۔ اپنی بدحالی سے مجبور ایک دن مجھ سے ذکر فرمایا کہ اگر ناشر ان کے باقی چار سو روپے دے دے تو یہ رقم کئی ماہ تک کے لیے ان کے اخراجات کی کفیل ہو جائے گی۔ میں نے اجازت چاہی کہ پتا کروں۔ فرمایا: "تجارت پیشہ لوگ ہیں۔ روپے ہاتھ میں نہ ہوں گے، ورنہ خود ہی بھیجا جاتے۔" یہ معاملہ پنڈت ہری چند اختر کے علم میں تھا۔ میں نے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا "میرزا یہاں کے کتب فروشوں کے چلن سے واقف نہیں، اگر تقاضوں پر بھی رقم وصول ہو جائے تو بڑی بات ہے۔" میں کتب فروش کے ہاں پہنچا۔ پھر ہری چند بھی گئے۔ آخر وہ بندۂ ضرورت میرزا کے یہاں گیا۔ سو روپے آگے رکھ کر چلا آیا اور ہم سے کہہ دیا کہ حساب بے باق کر آیا ہوں۔ جب میرزا سے پوچھا کہ آپ نے سو روپے لے کر معاملہ طے کیوں کر دیا تو فرمایا: "وہ تو سو روپے بھی نہ جانے کس مشکل سے مہیا کر سکا یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ اس کی کھال بھی کھینچ لی جائے۔" ہم خاموش اپنا سا منہ لے کر رہ گئے مجھے اب تک وہ نقشہ یاد ہے۔ میں نے میرزا سے عرض کی کہ "یہ لوگ بڑے چالباز ہیں آپ یونہی ان کے بھرے میں آ گئے۔" میرزا اس پر برافروختہ ہوئے اور بھویں تان کر کہا: "تم لوگ خواہ مخواہ کسی شریف آدمی پر تہمت لگاتے ہو۔ تم یہاں نہیں تھے ورنہ اس کی صورت دیکھتے وہ بے چارہ تو مارے شرمندگی اور مجبوری کے پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ مجھے تو سو روپے بھی لیتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی گناہ کر رہا ہوں۔ اس کا پیٹ کاٹ کر اپنا پیٹ پالوں، یہ کہاں کی شائستگی ہے۔ بھائی اسے دیکھا ہوتا تو پتا چلتا۔ بے چارے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے، وہ تو میں نے اُسے دلاسا دیا ورنہ

دو پڑنے میں کون سا کسر رہ گئی تھی۔

مولانا حفظ الرحمن منہاس دکسی بیماری کے باعث ناک سے بولتے تھے۔ اس لیے گنگنے صاحب ان کا عرف عام تھا) جنگڑ محلے میں رہتے تھے۔ صاحب جائداد تھے۔ اور میرزا کے جاں نثار قسم کے نیاز مند۔ ادبی خدمت کا بھوت سوار تھا۔ میرزا فہیم بیگ چغتائی کو برسوں اپنے یہاں ٹھہرایا۔ انگریزی کے انسائیکلو پیڈیا کی طرح ایک اردو کا انسائیکلو پیڈیا ترتیب دینا چاہتے تھے۔ میرزا فہیم بیگ چغتائی اس دفتر کے مہتمم تھے۔ تین برس میں پانچ سو کے قریب صفحات لکھے بھی گئے مگر چھپنے کی نوبت نہ آئی کیونکہ ابھی آغاز مکمل نہ ہوا تھا اور شاید وسائل ختم ہو چکے تھے۔ ہاں تو منہاس صاحب منت وسماجت سے میرزا یگانہ کو ٹیڑھے بنگلے سے اپنے یہاں لے آئے۔ ہر روز شام کو ایک محفل جمتی روٹیاں تنور سے آتیں۔ سالن اکثر میرزا فہیم بیگ چغتائی یا میرزا یگانہ پکاتے۔ کرسی کے قریب انگیٹھی رکھ لیتے۔ سالن پکتا رہتا، بحث جاری رہتی۔ بہت سے علمی مسئلے اور نکتے طے ہوتے۔ الفاظ کے مزاج اور معانی کو فقروں اور اشعار سے واضح کیا جاتا۔ اس بحث میں کتاب کا مواد تیار ہوتا۔ سند کے اشعار لکھ لیے جاتے۔ حوالوں کے لیے جن کتابوں کی ضرورت ہوتی ان کی فہرست منہاس صاحب کو دی جاتی، یہ حضرت بھی خدا رسیدہ ولی تھے۔ فہرست ہاتھ میں لیتے ہی فرماتے: "یہ کتابیں کون سی مل جائیں گی؟" ان کی آمدنی اڑھائی تین سو روپے ماہوار تھی۔ ان دنوں یہ رقم خاصی تھی، اس لیے اپنے محلے کے رئیس کہلاتے تھے۔ کاروبار یا ملازمت کا کوئی سلسلہ نہ تھا۔ بس انسائیکلو پیڈیا کے چکر میں الجھے رہتے۔ ذاتی کتب خانہ کوئی نہ تھا۔ صبح فہرست لے کر مختلف کتب خانوں میں پہنچتے، شام تک بیس چالیس کتابوں میں سے دو تین لے کر واپس آتے۔ اکثر ان کتابوں سے بھی حوالے دستیاب نہ ہوتے۔ آخر کار معلومات ارکان مجلس ہی سے حاصل کی جاتیں۔ اور طے شدہ معاملے کو در و غ برگردن راوی کہہ کر نقش قرطاس بنا لیا جاتا اور راوی کا نام دے دیا جاتا۔ میرزا یگانہ دو برس کے قریب وہاں رہے، پھر جھنگڑ محلے ہی میں علیحدہ مکان لے لیا۔ اہل خانہ لکھنؤ سے آگئے۔

میرزا فہیم بیگ طنز و مزاح، بدیہہ گوئی اور عبارت آرائی میں بے نظیر تھے۔ حاضر جوابی کا یہ حال کہ ہر بات کا فوری جواب حاضر، اکثر سنجیدہ اور کبھی مزاحیہ، مخلص، صاف گو، سادہ لوح، پرانے وقتوں کی یادگار، بات سے بات پیدا کرتے جاتے۔ داستان گوئی تو گویا ان پر ختم تھی۔ کوئی بات ہوتی اس کے جواب میں، اگر اپنی رائے کے حق میں کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ بیان کرنے لگتے اور اس انہماک سے کہ تصنیع اور اختراع کا شبہ تک نہ ہوتا۔ دلچسپی ایسی پیدا کرتے کہ ان کی بات یا کہانی اگر دو گھنٹے چلتی تو سب دم بخود بیٹھے رہتے، کسی کو جمائی تک نہ

آتی۔ میرزا بگانہ ایسے ناطق ہیں بیٹھے سنتے رہتے۔ بات ختم ہوئے پر اگر انھوں نے کہا بھی کہ "نہیم صاحب ہم نے یہ واقعہ کسی کتاب میں تو نہیں دیکھا" تو وہ جواب دیتے۔ "حضور ایسی باتیں صحیفوں میں نہیں ہوتیں، سینہ بسینہ ورثے میں آتی ہیں۔ میں نے یہ واقعہ دادا مرحوم سے سنا تھا۔" ایجاد بندہ وہ کہنے کے قائل نہ تھے کہ ان کے نزدیک بزرگ زیادہ معتبر تھے۔ نہیم بیگ صاحب کے بزرگ گوالیار دربار سے متعلق تھے۔ ان کے جاہ و حشمت اور وضع داری کے قصے مزے لے کر بیان فرماتے تھے اور فخر کرتے تھے۔

اسی محفل کے سرگرم رکن ایک نابینا شاعر تھے۔ دبلے پتلے مخنتی مگر خوب شکل۔ شعر تو خیر وہ اچھے کہتے ہی تھے۔ مگر گانے میں کمال رکھتے تھے۔ کھانا کھانے تک دو تین گھنٹے بحثیں خالص ادبی ہوتی تھیں، پھر لطیفہ بازی اور آخر میں اس صاحب کمال کا نغمہ۔ آپ گاتے وقت اکڑوں بیٹھتے۔ پنڈلی اور زانو کے درمیان جو نیم وا ساخلا ہوتا ہے، اس پر دائیں ہاتھ سے طبلہ بجاتے بائیں ہاتھ سے تالی پیدا کرتے۔ غزل چھیڑتے تو ہر شعر اور کبھی ایک مصرعے کے بعد اس لے میں گلے سے گھنگھرو کی آواز نکالتے۔ آواز میں ان کا سالوچ اور گونج میرے مشاہدے میں نہیں آئی اور نہ وہ سوز کہ جذبات میں ہلچل مچا دیتا ہے۔

میرزا دکن سدھارے تو منہاس صاحب کا دفتر ہی گاؤ خورد ہو گیا۔ نابینا شاید وطن چلے گئے اور میرزا فہیم بیگ گوالیار، سنتا ہوں فسادات کے زمانے سے کچھ قبل دہلی میں اقامت گزین ہو گئے تھے۔ یہ بامروت، نیک اور صلح کل ادیب ستمبر ۱۹۴۷ء میں فسادیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

میرزا کو بچوں سے پیار تھا مگر وطن اولاد سے بڑھ کر عزیز تھا۔ زندگی کے آخری دور میں اپنے بچوں کی محبت سے مجبور ہو کر انھیں دیکھنے کراچی تشریف لے گئے۔ قانونی ریشہ دوانیوں سے واقف نہ تھے، قانون کی زد میں ایسے آئے کہ ہندوستان واپس آنا آسان نہ رہا۔ ان دنوں ان کے دردناک خطوط پاکستان سے آتے تھے۔ فرماتے تھے۔ "جیسے بھی ہو لکھنؤ پہنچانے کی سبیل کرو۔" واپسی کی اجازت ملی، مجھ سے ملنے کے لیے دہلی تشریف لائے۔ اس قدر خوش تھے کہ کراچی اور لاہور میں پیش آنے والے افسوسناک واقعات کا ذکر بھی مسکرا کر کرتے تھے۔ میرے پاس پندرہ بیس روز کے قریب قیام فرمایا۔ گھر بھر کو لطیفوں اور شگفتہ گوئی سے زعفران زار بنائے رکھا۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ تشریف لائے۔ میرے یہاں ٹھہرے، لطیفے بھی ہوئے ہنسی مذاق بھی، مگر سنجیدگی کا پہلو ہمیشہ غالب رہتا۔ اس مرتبہ تو گویا انھیں کوئی کھوئی ہوئی جنت مل گئی تھی۔ بچوں سے بچوں کی سی توتلی زبان میں گفتگو فرماتے تھے۔

اس کے بعد دو مرتبہ اور بھی دہلی آئے۔ ایک دفعہ ایک مشاعرے کے سلسلے میں اور دوسری مرتبہ میری درخواست پر۔ یہ ان کی میری آخری ملاقات تھی۔ اب کے میرزا ہوٹل میں ٹھہرے۔ دمے کا بڑا زور تھا۔ فرمایا "گھر میں نہ ٹھہروں گا کہ رات بھر کھانستا ہوں تم لوگ سو نہ سکو گے۔"

طبیعت اکھڑی اکھڑی پہلے ہی سے تھی۔ دو دن کے قیام سے اور بگڑی۔ میں نے ڈاکٹر بلانے کی اجازت چاہی تو فرمایا: "مجھے جلد لکھنؤ پہنچا دو۔ میرا علاج وہیں ہوگا۔" میں نے دمے کی ایک مجرب اور آزمودہ دوا پیش کی تو فرمایا "میں نے کہہ جو دیا کہ دہلی میں مرنا پسند نہیں کرتا۔ وقت مت ضائع کرو۔" ہر چند میں نے کہا کہ یہاں بہترین اطبا کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ مگر وہ نہ مانے۔ لکھنؤ پہنچنے کے لیے ایسے بیتاب تھے جیسے کوئی دور افتادہ عاشق اپنے محبوب کو ملنے کے لیے بے قرار ہو۔ بہرکیف اسی شام ان کے جانے کا بند و بست ہو گیا۔ میں نے ٹکٹ اور سیٹ کی ریزرویشن سلپ جب ان کی خدمت میں پیش کی تو یوں مسکرائے گویا دل کا کنول کھل گیا ہو۔ فرمایا "ہاں بھئی اطمینان ہو گیا۔" اور پھر اپنی رباعیاں پڑھیں، میرے شعر سنے۔ شام تک مرض کی شدت کے باوجود اپنی کہتے رہے میری سنتے رہے۔

میں چار مرتبہ لکھنؤ گیا۔ تین مرتبہ تو غرض صرف میرزا کی خدمت میں حاضر ہونا تھا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء میں گیا۔ میرزا کو عثمان آباد سے پہنچنا تھا اور مجھے لاہور سے، مگر خدا جانے کیا ہوا کہ وہ ایک روز بعد پہنچے۔ ناواقفیت کی بنا پر میں امین آباد پارک کے ایک ایسے ہوٹل میں جا پھنسا جہاں شب بیداری کے تمام لوازمات موجود تھے مگر دن میں چائے تک میسر نہ آتی تھی۔ میں جلدی میں وہاں سے نکلا۔ میرزا کا مکان تلاش کرنے میں کافی دقت ہوئی۔ ان دنوں غالباً وہ جھنوائی ٹولے میں رہتے تھے۔ محلے کے ہر مکان میں کوئی نہ کوئی میرزا صاحب رہتے تھے اور سب کے سب شاعر۔ اتنے سارے میرزاؤں اور شاعروں کے انبوہ میں میرا میرزا کچھ گمنام سا ہو گیا تھا۔ دقت لازم تھی۔ مگر جب آغا جان (ابن یگانہ) کا نام لیا تو جھٹ پتا چل گیا۔ مردوں میں گھر پر کوئی نہ تھا، پردہ سخت ہونے کے باعث بالمشافہ گفتگو نہ بیگم یگانہ سے ہوئی نہ اقبال بہن سے۔ اس وقت یہ ماں بیٹی گھر میں تھیں۔ بہرکیف لکھ کر اپنا پتا چھوڑ آیا کہ آغا جان جب آئیں میرے پاس بھجوا دیجیے۔ گھنٹے بھر میں وہ ہوٹل پہنچ گئے اور پھر دن بھر امام باڑوں کی سیر کراتے رہے۔ شام کا کھانا ان کے ہاں کھایا۔ مختصر سی بیٹھک میں چاندنی بچھی تھی، ایک گاؤ تکیہ رکھا تھا، وہیں دستر خوان بچھا۔ کھانا سادہ تھا مگر ایسا لذیذ کہ میں نے اس سے پہلے کم کھایا تھا۔ میرزا کے ہاتھ کے پکے سالن میں لاہور میں بیسیوں مرتبہ چکھ چکا تھا اور وہ بہت لذیذ ہوتے تھے مگر اب پتا چلا کہ وہ اصل کی صرف نقل ہیں۔ دستر خوان پر میرے علاوہ آغا جان اور حیدر بیگ تھے۔ حیدر بیگ میرزا کے چھوٹے صاحبزادے ہیں ہاں

دنوں عمر شاید پانچ برس کی ہو گی مگر ان۔ دسترخوان پر نہایت اطمینان سے دو زانو ہو کر بیٹھنا سوالوں کا جواب (جی ہاں۔ جی نہیں) بکمال سنجیدگی سے دیتا' والد کو حضور ابا کہہ کر یاد کرتا۔ چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر سادگی اور انتہائی خود اعتمادی کے سے منھ میں یوں رکھنا جیسے نازک مزاج رئیس، پان کی گلوری منھ میں رکھتے ہیں کہ اس کا نشان تک ہونٹوں یا انگلیوں پر نہ آنے پائے۔ صرف دائیں ہاتھ کو کھانے کے لیے استعمال کرنا اور پانی کا گلاس اٹھانا تو یوں کہ ایک ہاتھ میں گلاس تو دوسرا گلاس کے پیندے کو سہارا دیتے ہوئے۔ مجھے اس مہذب و باتمیز بچے کی یہ ادائیں بہت پسند آئیں۔ سلیقہ شعاری اسی کو کہتے ہیں۔ دوسرے دن میرزا پہنچ گئے اب وہ خود میرے میزبان تھے۔

میرزا الانور (دکن) میں تھے کہ ایک ملنے والے تشریف لائے اور دو سیر کے قریب خمیرہ تمباکو پیش کیا۔ بہت تعریف کی اور کہا کہ یہ ہے تو مقامی مگر ایسا کہ لکھنؤ کے بہترین تمباکو کا مقابلہ کرتا ہے۔ باتوں باتوں میں میرزا قیمت دریافت کرنا بھول گئے۔ موصوف نے بھی طلب نہ کی، وہ تمباکو کئی روز تک کام آیا۔ میرزا کو پسند آیا۔ جب ختم ہونے کے قریب ہوا تو میرزا صاحب نے ان کو بلوا بھیجا، وہ آئے تو میرزا حقہ پی رہے تھے۔ میرزا نے مزید تمباکو کی فرمائش کی اور پہلے کی قیمت پوچھی۔ ان صاحب نے کہا: "قبلہ قیمت کی کیا ضرورت ہے آپ نے کئی مرتبہ ہم پر مہربانی فرمائی، میں نے معمولی سی خدمت کر دی تو کیا بات ہے۔" میرزا نے پوچھا: "میاں میں نے کب تمہارا کچھ سنوارا؟" انھوں نے کوئی دفتری واقعہ بیان کیا، اور کہا "عنقریب میں پھر اس سلسلے میں حاضر ہوں گا کہ مزید امداد کی ضرورت ہے۔" میرزا بڑے حیران ہوئے۔ جلتی ہوئی اور چلتی ہوئی چلم انڈیل دی اور فرمایا: "لاحول ولا قوۃ! تو میں حرام کا تمباکو پیتا رہا!" یہ رنگ دیکھ کر وہ صاحب جز بز ہوئے اور عرض کی: "حضور میرا یہ مقصد تو نہ تھا۔ میں تو غلام ہوں بحیثیت نیاز مند تمباکو پیش کرنے کی جرأت کی۔ اگر یہ حرکت آپ کو گراں گزری تو آپ قیمت دے دیجیے!" میرزا نے دام ادا کیے اور کہا: "میاں سرکاری کام کے لیے دانستہ میں نے کبھی کسی کی مدد نہیں کی، جو کام کیا حق سمجھ کر کیا اور بلا خوف و رعایت کیا۔ وہاں جو کچھ کام کرتا ہوں سرکار سے حق خدمت برابر پاتا ہوں، کسی سے الگ کچھ لینا بد دیانتی ہے۔ تم شوق سے دفتر میں آؤ، انصاف اور قاعدے کی رو سے مناسب کارروائی کرنا میرا فرض ہے اور ہاں اور تمباکو بھیجنے کی ضرورت نہیں کہ حالات اور مزاج میں تلخی پیدا کرتا ہے۔" یہ واقعہ مجھ سے مولانا اختر علی خاں مرحوم نے بیان کیا۔ میرزا اپنی تعریف میں کچھ کہنا خفیف الحرکتی سمجھتے تھے۔

میرے والد نے میری شادی بڑے چاؤ سے کی۔ باہر سے آنے والے مہمانوں کو آمد و رفت کا خرچ پیش کیا۔ میرزا نے لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا: "لالہ جی یہ لڑکا مجھے اپنی اولاد سے بڑھ کر عزیز ہے۔ اگر استطاعت رکھتا تو میں آپ کے اخراجات میں برابر کا شریک ہوتا، کیا کروں مجبور ہی

ہے۔ بہر کیف جو میں نے خرچ کیا ہے وہ قطعی اپنی خوشی اور اپنی حیثیت کے مطابق ہے، آپ سے کچھ لینے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔" والد بھی دنیا دار تھے۔ انھیں چال سوجھی۔ دوسرے دن باداموں کا ایک تھال (طبق) بیگم یگانہ کے لیے ساڑھی، میرزا اور بچوں کے لیے کپڑے کے ٹکڑے، طبق کو کامدار ریشمی رومال سے ڈھانپا، پانچ سو روپے نقد اوپر رکھے اور صبح ہی صبح ان کی خدمت میں پہنچے۔ ملازم نے تھال تپائی پر رکھا۔ میرزا نے پوچھا: "یہ کیا ہے؟" والد نے کہا: "دلھن کے میکے والوں نے آپ کے لیے نذر بھیجی ہے۔" میرزا نے ہر چیز کا جائزہ لیا، فرمایا: "بہت خوب، بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں۔ میری شیردانی کا کپڑا خوب ہے۔ بیگم ساڑھی کو بہت پسند کریں گی۔ مگر صاحب روپے تو لوٹا دیجیے۔ تحائف سب ٹھیک ہیں، میں نے خوشی سے لے لیے۔" والد نے کہا: "کس کو لوٹا دوں۔ سمدھیوں کو؟ کیا کہہ کر لوٹاؤں؟" میرزا نے فرمایا: "میری طرف سے معذرت کر دیجیے۔" والد نے کہا: "آپ کیا کرتے ہیں، یہ روپے آپ کے بیٹے کی سسرال سے آئے ہیں۔ واپس نہیں ہو سکتے۔ ہم قبول کر چکے ہیں اور اب واپسی سے مراد لی جائے گی کہ اس پیش کش کو ناکافی سمجھتے ہیں۔" میرزا نے فرمایا: "لاحول ولا قوۃ۔ لالہ جی خدانخواستہ انکار سے میری مراد یہ کیونکر ہوئی۔ ان لوگوں نے ہماری بساط سے بڑھ کر ہم کو دیا ہے خیر آپ قبول فرما چکے ہیں تو پھر یہ آپ ہی کیوں نہ رکھیے۔" والد نے کہا: "جو مجھے ملا وہ میں نے پہلے ہی رکھ لیا ہے۔ آپ کا حصہ رکھنا تو امانت میں خیانت ہے۔" میرزا نے یہ سنتے ہی روپیہ اٹھایا، آنکھوں سے لگایا، پھر چوما اور جیب میں رکھ لیا اور فرمایا: "ہاں بھئی ہاں اپنے بیٹے کی سسرال سے آئی ہوئی نذر فخر یہ لوں گا۔ میں نے خواہ مخواہ انکار کیا۔ اس سے واقعی ان لوگوں کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ بھئی واہ میں عجیب احمق ہوں۔" اور اس کے بعد والد سے بغل گیر ہوئے۔ مجھے سینے سے لگایا۔ دیر تک دعائیں دیتے رہے۔ وہاں سے ایک ساتھ اٹھے۔ کچھ دیر میرے والد کے ساتھ دکان پر بیٹھ کر میرزا میرے کمرے میں چلے آئے۔ آج وہ چہکتا بلبل ہزار داستان اور محبوب چمن کچھ گم صم سا تھا۔ میں نے فکر مندی کی وجہ پوچھی تو مسکرا کر فرمایا: "کچھ نہیں، میں سوچتا تھا، بیگم ہمراہ ہوتیں تو کس قدر خوش ہوتیں۔ اچھا شعلہ! یہ لو (جیب سے پانچ سو کے نوٹ نکالتے ہوئے) یہ میری طرف سے دلھن بیٹی کو دے دو۔" میں نے عرض کی: "قبلہ اسے معلوم ہے کہ کل ہی اس کے میکے والوں نے یہ رقم آپ کی نذر کی ہے اور یہ رقم انھیں واپس کرنا یا ان کی بیٹی کو تحفتاً دینا ایک ہی بات ہے۔" میرزا نے فرمایا: "ارے شعلہ تم تو محبت کی ہر راہ مسدود کیے دیتے ہو۔ مجھے اپنی بچی کو کچھ تو دینا چاہیے۔" میں نے عرض کی "حضور آپ دوپٹہ مرحمت فرما چکے وہ اسے زمانے کے ہر سرد و گرم سے محفوظ رکھنے کے لیے سایۂ رحمت کا کام دے اور پھر آپ کی دعائیں اس کی رہ حیات میں پھول بچھاتی جائیں گی۔ یہ عطیے کیا کم ہیں۔" میرزا نے فرمایا "یہ میری دعائیں میرے قلب و احساس کی آئینہ دار ہیں مگر مجھے کچھ نقد دینے کی آرزو ہے۔"

میں نے عرض کیا۔ تو حضور اپنی جیب خاص سے اور اپنی کمائی سے کچھ دے دیجیے جو وہ تبرک سمجھے۔" آپ نے فرمایا "میرے پاس ترپن روپے اپنے ہیں۔" میں نے کہا "دس دے دیجیے" میرزا نے گیارہ دن مجھے دیے اور فرمایا "فلسفہ موقوف، منطق مردود۔ اب اٹھو اور یہ حقیر رقم مجھ فقیر کی طرف سے جھٹ سے اپنی بیوی کو دے آؤ۔ خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔"

میرزا جب سے دکن گئے خانہ داری کا سلسلہ دہرا ہو گیا۔ بیگم بچے لکھنؤ میں رہتے تھے اور خود دکن میں۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ ملازمت پیشہ لوگوں کی تنخواہیں تو وہی رہیں مگر گرانی کے باعث اخراجات بڑھ گئے۔ میرزا کے چند خطوط انھی دنوں اس صورت حالات سے متعلق آ چکے۔ وہ تنگ تھے۔ پاتے ہی کیا تھے۔ پچھتر روپلیاں! میں خدمت کرنا تو چاہتا تھا مگر ان کے اصولوں سے ڈرتا تھا۔ اور مجھے قطعی گوارا نہ تھا کہ پندرہ برس کے مخلصانہ تعلقات میری حماقت کی نذر ہو جائیں۔ ۱۹۴۲ء میں حالات اور بگڑے، تمام ضرورت کی اشیاء کی قیمتیں بے قدر ہو گئیں۔ میں نے جرأت سے کام لے کر پچاس روپے بذریعہ منی آرڈر انھیں بھجوا دیے اخط نہ لکھا کہ مناسب جواز کی تلاش تھی۔ ہفتہ بھر میں منی آرڈر واپس آ گیا۔ دوسرے دن میرزا کا خط ملا، لکھا تھا "تمھارا منی آرڈر آیا تھا۔ میں نے واپس کر دیا کہ تم نے مدعا سے مطلع نہ کیا تھا۔ بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ تمھیں یہاں سے کسی چیز کی ضرورت ہے جس کی قیمت تمھارے اندازے کے مطابق پچاس روپیہ ہے اور میرے مالی حالات کے پیش نظر تم نے رقم پیشگی بھجوا دی۔ مگر تم نے یہ کیوں کر سمجھ لیا کہ میں سو پچاس بھی اپنے پاس نہیں رکھتا۔ بفرض محال ایسا نہ بھی ہو تو آخر سب رجسٹرار ہوں۔ سو دو سو کا اعتبار تو دکان دار کرہی لیتے ہیں۔ میں تمھاری ضرورت کی اشیا بآسانی حاصل کر سکتا ہوں۔ تمھارے میرے تعلقات ایسے نہیں کہ پیشگی ادائی کی ضرورت ہو۔ اب تم یہ کرو کہ جو چیزیں درکار ہوں ان کی فہرست بھیج دو میں خرید کر بھجوا دوں گا۔ قیمت لکھ دوں گا۔" اس خط کے جواب میں میں نے مدعا انھیں لکھ دیا۔ میرزا خیر بگڑے تو نہیں مگر اس قدر ضرور کہا کہ اس کوتاہ اندیشی کی ضرورت نہ تھی۔ خط کا اختصار بتاتا تھا کہ وہ خوش نہیں اور اطلاعاً یہ بھی فرمایا کہ "بہر کیف بسر ہو رہی ہے اور ان دنوں سے بہتر جب آمدنی کی صورت یہ بھی نہ تھی تم ناحق فکرمند ہوتے ہو۔" میں نے کچھ دن بعد وہی روپے بیگم یگانہ کی خدمت میں ارسال کر دیے۔ انھوں نے رقم وصول کر لی۔ اور میرزا کو مطلع کر دیا۔ اب کے میرزا بگڑے اور لکھا "تم یہ بار بار میرے صبر کو کیوں آزماتے ہو۔ میں نے پہلی مرتبہ ٹال دیا کہ مجھے تم سے بڑھ کر اور کوئی عزیز نہ تھا مگر اس قسم کی حرکتیں برداشت کرنے کا میں ظرف نہیں رکھتا۔ اس کی سزا میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ تم خود بیگم یگانہ کو لکھ کر روپیہ واپس منگواؤ اور ان سے معذرت کرو، ورنہ اس میں تم سے تعلقات ٹوٹ جانے کا

مجھے صدمہ برداشت کرنا پڑے گا، اور مت بھولو کہ یہ صدمہ میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہوگا، یہ خط غیر متوقع نہ تھا۔ اب میں سنبھل چکا تھا۔ میں نے سختی سے جواب دیا کہ "حضور آپ کی شاعری کا قائل ہوں، عالی ظرفی اور اخلاص کا قائل ہوں۔ آپ کی عزت اپنے والد اور اپنے استاد سے بڑھ کر کرتا ہوں۔ آپ کے اصولوں کا بھی قائل ہوں مگر ایسے بے ڈھب اصول کا ہرگز قائل نہیں جس کی رو سے ایک سعادت مند اور باتوفیق بیٹا اپنی والدہ کی خدمت نہ کر سکے۔ آپ یہ بتائیے کہ جب آغا جان اور حیدر بیگ برسرِ روزگار ہوں گے اور اماں کو روپیہ بھیجیں گے تو کیا آپ ان پر بھی اسی اصول کا اطلاق فرمائیں گا۔ اور یہ مت بھولیے گا کہ متعدد مرتبہ واضح طور پر آپ اقرار فرما چکے ہیں کہ آپ مجھے اپنی اولاد سے بڑھ کر عزیز سمجھتے ہیں، اور اگر یہ حقیقت ہے تو پھر آپ ماں اور بیٹے کے درمیان بولنے والے کون؟"

اس خط کے جواب میں میرزا کا بڑا پیارا خط آیا۔ فرمایا کہ "میں نے معاملے کے اس پہلو پر غور نہ کیا تھا۔ تم میرے بیٹے ہو شوق سے اپنی والدہ کی خدمت کرو، مجھے بھی جب ضرورت ہوگی بے تکلف امداد طلب کر دوں گا، البتہ بے طلب بھیجنے کی ضرورت نہیں۔"

میرزا کا انجام دنیادی معیار کے حساب سے اچھا نہ ہوا۔ محمد نقی کے ہمراہ پہلے مکان میں اٹھ آئے تھے۔ یہ مکان شاہ گنج میں واقع ہے۔ کئی برس پہلے بھی میرزا یہاں قیام فرما تھے، مگر پھر اپنے مکان میں منتقل ہو گئے۔ غنڈہ گردی کے حادثے کے بعد محمد نقی انھیں اپنے پاس لے آئے آخری وقت وہ ملحقہ کمرے میں تھے۔ میرزا کے پاس ان کا ذاتی ملازم تھا۔ انتقال کے صحیح وقت کا علم کسی کو نہیں۔ جز این قدر کہ رات کے گیارہ بجے چائے طلب کی، سگریٹ پی رہے تھے کہ دم الٹ گیا (دمے کے باعث سانس کئی دن سے اکھڑی رہتی تھی) تھوڑا سا پانی پیا اور پھر لیٹ رہے۔ صبح پانچ بجے کے قریب میرزا کے ملازم نے "ہائے میرے نواب صاحب" کی دھاڑیں ماریں تو محمد نقی اور دوسرے پڑوسیوں کو آپ کی رحلت کا علم ہوا۔ جنازے کے ساتھ چند لوگ تھے۔ وہ بھی سہمے سہمے، نہ جانے راہ میں کیا حادثہ پیش آئے۔ لکھنؤ کے غنڈوں نے یہ کہہ رکھا تھا کہ ہم میرزا کو کسی قبرستان میں دفن نہ ہونے دیں گے اور شاید اسی امکان کے پیشِ نظر آپ نے اپنی قبر کے لیے پہلے ہی سے زمین خرید رکھی تھی۔ ایک منہ پھٹ شاعر نے ان کے انتقال کے بعد لکھا تھا۔ "حیرت اس بات پر نہیں کہ ان کی میت کے ساتھ چند لوگ تھے بلکہ حیرت یہ ہے کہ یہ لوگ بھی کیوں تھے۔" واقعی فن کی موت۔ شرافت کی موت اور ہماسوست کی موت پہ اُسے کاندھا دینے والا کوئی نہ ہونا چاہیے تھا۔

میرزا کی موت کی خبر مجھے محمد نقی نے دی۔ کچھ عرصے بعد وہ دہلی ملنے آئے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میرزا کا پختہ مزار بن جائے۔ بہت مضبوط نہ سہی، ایسا تو ہو کہ بیس پچیس برس تائیں برداشت کر جائے۔ میں نے اس سلسلے میں ہاشم بھائی کو لکھا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ کلیات کا چھپنا زیادہ ضروری ہے جس کا اہتمام وہ فرما رہے ہیں۔ میں خود اس قابل نہ ہوا کہ یہ کام اپنی جیب سے کر سکوں۔ میرزا کو ان کے آخری تین یا چار برسوں سے مرکزی حکومت کی طرف سے ادبی وظیفہ مل رہا تھا (میرزا ایک سو ماہوار پاتے تھے اور اس کے علاوہ پندرہ روپے ماہانہ پنشن کے حیدر آباد دکن سے بسلسلہ ملازمت بھی آتے تھے) میں نے حکومت کی اس ادب اور ادیب نوازی سے متاثر ہو کر مولانا ابو الکلام آزاد کو مندرجہ ذیل ذاتی خط لکھا:

مولانائے ما! نیاز و سلام شوق۔ آپ میرزا یگانہ کو ضرور جانتے ہوں گے کیونکہ آپ کی نگاہ جوہر شناس سے کوئی وہ ذرہ پوشیدہ نہیں جو کچھ روشنی رکھتا ہو اور میرزا تو اپنے وقت کے بڑے شاعر تھے۔ شاعر تو وہ تھے ہی مگر بحیثیت انسان کہیں زیادہ بڑے تھے۔ میرے نزدیک انسان ہونا آج کے اشتہاری دور میں بڑی بات ہے۔ اس سے بڑھ کر ہونا تو نہ جانے کیا ہوتا ہوگا۔ میرزا بے باکی کی حد تک صاف گو تھے۔ اس لیے دوست پیدا نہ کر سکے ہندوؤں کے نزدیک وہ مسلمان تھے اور مسلمانوں کی نگاہ میں کافر۔ مجھے ان کا نیاز مند ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ۷۲ برس کی عمر میں میرزا نے گزشتہ ۳/۴ فروری کی درمیانی رات کو انتہائی کس مپرسی کی حالت میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ زندگی مالی پریشانیوں بلکہ بدحالی کے عالم میں گزاری مگر ان کے ماتھے پر شکن تک نہ ابھری۔ ہر مشکل کو، ہر مصیبت کو نہ صرف خندہ پیشانی سے برداشت کیا بلکہ جزوِ حیات بنا لیا۔ بہر کیف زندگی کو جیسا گزرنا تھا گزر گئی۔ اب میرزا مصائب کی دست برد سے آزاد ہیں۔ میرا خیال ہے ان کے خلاف جو طوفان تعصب ابھی باقی ہے وہ موجودہ نسل کے ختم ہوتے ہوتے ختم ہو جائے گا۔ اور پھر لوگ انھیں ادبی اور انسانی حیثیت سے دیکھنے لگیں گے۔ میری خواہش ہے کہ ان کا نشان باقی رہے، شاید یہ ایک شے ہی آنے والی نسلوں کے خراج عقیدت کے لیے کافی ہو۔ اگر آپ کی وساطت سے حکومت صرف ان کا مزار اور احاطہ پختہ بنوا دے تو فی الحال کافی ہے۔ ایک کتبہ تکیے کی طرف ہو جس پر ان کا نام، یوم ولادت و وفات اور انھی کا ایک شعر ہو:

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

میرے بس کی بات ہوتی تو میں اب تک بے دریغ تعمیر مکمل کرا دیتا۔ اڑھائی سو روپے

تک اب بھی دینے کے قابل ہوں اور اگر آپ یہ کام اپنے ہاتھ میں لیں تو یہ رقم نذر کر دوں
میں جانتا ہوں تعصب آپ کے قریب سے ہو کر نہیں گذرا۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدا نے
آپ کو وہ توفیق خاص طور پر عطا کی ہے جس سے انسان کے لیے حق شناسی اور حق بینی ممکن
ہو جاتی ہے اور یہ کار خیر جس کے لیے میں التجا کر رہا ہوں یقیناً ملک و قوم و ادب کی خدمت
ہے۔

میرزا کا مزار فی الحال ایک تودۂ خاک پر مشتمل ہے اس سے پہلے کہ لکھنؤ کی برسات
اسے باقی سطح سے ہموار کر دے از راہ کرم ادب و انسانیت کی مدد کیجیے۔

دہلی - ۱۶ / مئی ۱۹۵۶ء   خاکسار - دوارکا داس

مجھے اس خط کا جواب نہ ملا اور ملتا بھی کیا کہ مولانائے محترم خود بہت معاملہ شناس بزرگ
تھے۔ ممکن ہے میرزا مرحوم کا یہ شعر سن رکھا ہو اور پسند ہو:

جواب دے کے نہ توڑو کسی غریب کا دل
کوئی بلا سے سراپا امید وار رہے

میرزا کا مزار نہ بنا اور اب امید بھی کیا ہے۔ محمد نقی صاحب نے کوشش کی، قبر کا اندرونی
حصہ پختہ کروا دیا۔ ایک کتبہ بھی سنگ سرخ کا لگوا آئے جو کوئی شخص اپنی قبر کے لیے لے گیا تھا۔
میرے میرزا کو زندگی میں زیب و زینت سے تعلق نہ رہا۔ شان و شوکت سے واسطہ
نہ رہا۔ مرنے کے بعد قبر کی تزئین کیوں گوارا فرماتے:

خوش مذاقی شرط ہو جس کے نظارے کے لیے
اُس گلِ خود رو کو یارب زینتِ ویرانہ کر

میرزا یگانہ کا کتب خانہ ایسا وسیع تو نہ تھا مگر تین سو کے قریب چیدہ چیدہ کتابیں عربی،
فارسی، انگریزی اور اردو کی اس زمانے میں ان کے پاس تھیں جب لکھنؤ میں حادثہ بے ادبی
پیش آیا۔ اس کے علاوہ بے شمار تراشے، اپنے قلمی مسودے اور دوستوں کے خطوط ایک صندوق
میں محفوظ تھے۔ یہ سب ادبی سرمایہ غنڈوں کی دست برد کا شکار ہو گیا۔ کتابوں میں سے اکثر
تو بازار میں سستے داموں بک گئیں اور ایک دوست کے علم کے مطابق ان میں سے کچھ علی گڑھ
کے دار العلوم میں ہیں۔ مسودوں اور تراشوں کا کچھ پتا نہیں چلتا، غالباً وہ جلا دیے گئے تھے۔
میرزا محمد نقی اس اطلاع کے ذمہ دار ہیں کہ میرزا مرحوم کے تمام کاغذات اور بیاضیں جو بچ
رہی تھیں، ان کے انتقال سے چند روز پہلے ہاشم اسماعیل صاحب کو میرزا کے ایما سے بذریعہ
رجسٹری بھجوا دی گئی تھیں۔ ریڈیو اور چند دیگر اشیا پہلے ہی بمبئی پہنچ چکی تھیں۔

انتقال سے ایک یا دو برس پہلے میرزا نے مجھے لکھا کہ وہ اپنا ریڈیو میری بیٹی نرملا کو دینا چاہتے ہیں اور یہ کہ میں لکھنؤ سے منگوا لوں۔ میں نے لکھ دیا کہ میرزا کے کل سامان کے جائز حق دار ان کے اپنے بچے ہیں۔ ان میں سے کسی کو یہ چیز دے دی جائے۔ میرزا کی اولاد میں سے ان دنوں بلکہ آخری دن تک بھی ان کے پاس کوئی نہ تھا اور ہندوستان میں مجھ سے اور ہاشم سے بڑھ کر وہ کسی اور کو عزیز نہ رکھتے تھے۔

میرزا محمد نقی نے ایک اور بات کہی اور وہ یہ کہ انتقال سے دو دن پہلے شام کے وقت میرزا نے کلمہ پڑھا اور نقی صاحب سے پوچھا، "کہو بھئی میں نے کلمہ صحیح پڑھا۔" انھوں نے کہا بالکل صحیح، پھر پوچھا: "میں مسلمان ہوں؟" انھوں نے کہا، "آپ صحیح مسلمان ہیں" پھر کہا "میرا ایمان درست ہے"۔ نقی نے کہا: "بالکل درست۔"

یگانہ کا غیر مطبوعہ کلام

یگانہ کے کلام کے مندرجہ ذیل چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

۱۔ نشترِ یاس۔ ۱۹۱۴ء

۲۔ ترانہ ۔ ۱۹۳۴ء

۳۔ آیاتِ وجدانی۔ ۱۹۲۷ء/ ۱۹۳۴ء/ ۱۹۴۶ء

۴۔ گنجینہ ۔ ۱۹۴۸ء

یہ چاروں مختصر مجموعے ہیں، اور ان میں بھی بہت سا کلام مشترک ہے۔ مجموعی طور پر ان مجموعوں میں جو کلام ملتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

اردو غزلیات: ۱۶۹ ۔ فارسی غزلیات: ۱۰

اردو رباعیات: ۲۴۳ ("غالب شکن" میں ۲۳ رباعیات ایسی ہیں جو کسی مجموعے میں شامل نہیں)

فارسی رباعیات: ۱۵ ۔ مثلث: ۲ ۔ اردو نظمیں: ۲ ۔ فارسی نظم: ۱

یگانہ کی چھ بیاضیں اور کچھ متفرق مسودات میری نظر سے گزرے ہیں۔ ان میں سے چار بیاضیں "گنجینہ" کی طباعت سے پہلے کی ہیں، اور دو بعد کی جن میں آخر عمر تک کا کلام ہے۔ میں نے ان بیاضوں کا مطبوعہ کلام سے مقابلہ کیا تو بہت سا ایسا کلام دستیاب ہوا جو یگانہ کے کسی مطبوعہ مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ اگلے صفحات میں کلام شائع کیا جا رہا ہے۔ جو ۱۵ مکمل و نامکمل غزلوں، ۱۲۱ رباعیوں، ۴ نظموں اور ۲۷ متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کلام میں سے دو تین غزلیں جزوی طور پر بعض رسائل میں شائع ہو چکی ہیں، لیکن مکمل صورت میں یہ پہلی مرتبہ اب شایع کی جا رہی ہیں۔ غزلوں میں سے پہلی سات یگانہ کی زندگی کے آخری چھ سات برسوں کی تخلیق ہیں۔ رباعیات کا بڑا حصہ بھی اسی زمانے کا ہے۔

میرے پاس یگانہ کا غیر مطبوعہ اور غیر مدوّن کلام ہے، اس کا ایک حصہ بوجوہ شائع نہیں کیا جا رہا۔ یگانہ کی کچھ اور بیاضوں کی موجودگی کا بھی مجھے علم ہے جن میں غیر مطبوعہ کلام ہے، لیکن میں ان سے استفادہ نہیں کر سکا۔

پس نوشت: "تخلیقی ادب" کی کتابت مکمل ہو چکی تھی کہ مجھے "گنجینہ" کے اس قلمی نسخے سے استفادے کا موقع ملا جو یگانہ نے ۱۹۵۱ء میں مرتب کیا تھا اور اب جناب مالک رام (دہلی) کے پاس محفوظ ہے۔ اس مجموعے سے چار ایسی غزلیں ملی ہیں جو پہلے کبھی شائع نہیں ہوئیں۔ یہ چاروں غیر مطبوعہ غزلیات کے آخر میں شامل کی جا رہی ہیں۔ اس طرح غیر مطبوعہ غزلیات کی تعداد انیس ۱۹ ہو جاتی ہے۔ (مشفق خواجہ)

غیر مطبوعہ غزلیات

(۰)

بتوں سے خدا جانے کیسے بنے
چلو یاں سے اب اٹھ چلو سب بنے

کہاں کا نشیب اور کہاں کا فراز
جوانی وہ ہے جیسی دل میں ٹھنے

چھکنے پہ آئے تو دریا ہے دل
کہ اُمڈے تو پیچھے نہ ہٹتے بنے

کہاں رہ گئے رہزن و رہنما
وہ چٹیل بیاباں وہ جنگل گھنے

مرا پاؤں پھسلا تو پروا نہیں
مگر تم مرے ساتھ ناحق سنے

اچانک ترقی کوئی کھیل ہے
بُرا یا بھلا بنتے بنتے بنے

سمجھتے نہ تھے جب تو خیر اب سہی
سمجھ لیں گے آپس میں دونوں جنے

جسے ایسے ویسوں سے جھکنا پڑے
بجا ہے ہم ایسوں سے جتنا تنے

مساوات فطرت میں ہے بھی کہیں
کہیں میوے وانے کہیں گُڑ چنے

حقیقت کی تہہ کو پہنچنا محال
وہ پتلی چھنے چاہے گاڑھی چھنے

امید ایسی امید کس کام کی
کبھی کوئی بچہ تو زندہ جنے

غریبوں پہ کیا کیا ستم ڈھاتے ہیں
کھڑے ہیں جو یہ سامنے بت بنے

یگانہ بنے یا امام الغزل
وہ جو کچھ بنے، بنتے بنتے بنے

(۰)

اس سے تو غفلت اچھی، یہ کیا مصیبت آئی
چونکے تو ایسے چونکے جیسے قیامت آئی

معنی کی روشنی میں دیکھی جب، اپنی (صورت)
صورت کی روشنی میں ظالم کی سیرت آئی

کیا کسی مُنھ کی کھائی توبہ بھی بھول بیٹھے
اوروں پہ ہنستے ہنستے اپنی بھی شامت آئی

اُف یہ بھری جوانی، غیرت سے پانی پانی
کیا کیسے چوک ہیں کیا یوسف کی قیمت آئی

دنیا کا کیا بھروسا، دولت کا کیا ٹھکانا
دولت تو دولت آخر لٹنے کی نوبت آئی

ترسی ہوئی نگاہیں عالم وہ رنگ و بُو کا
اب کیا بتائیں نیت کیونکر سلامت آئی

بھاویں ہو کیا کسی کے دُنیا و دیں کی دولت
جب گھر میں آپ آئے دولت ہی دولت آئی

یہ کس کے ہتھکنڈے تھے سمجھے تو کون سمجھے
یاروں کے دم قدم سے یاروں کی شامت آئی

نظروں پہ چڑھ گئے کیوں ایسی پتے کی کہہ دی
کیوں میرزا یگانہ کیوں ایسی نوبت آئی

○

بندھی ہے ٹکٹکی آپس میں گفتگو نہ سہی
زبانِ حال سہی، حرفِ آرزو نہ سہی

بھرا ہے بادۂ بے رنگ سے یہ شیشۂ دل
دماغ تازہ ہے اپنا، شگفتہ رُو نہ سہی

ٹٹول لینے سے بیچارہ کیوں رہے محروم
ہوس نصیب کو احساسِ رنگ و بُو نہ سہی

بھری بہار میں نیت نہ ہوگی ڈانواں ڈول
خیال خام سہی، تیری آرزو نہ سہی

مزاج کیوں نہ بھٹکتا زمانہ سازوں کا
زمانہ اُن کے موافق ہے ایک تو نہ سہی

جو تیری یاد میں کھویا گیا تو کیا پروا!
جدھر بھی ہو دلِ گم گشتہ، قبلہ رُو نہ سہی

پیام حق تو اُدھر ہی سے آنے لگا اک دن
کھڑے ہیں منتظرِ وقت، جستجو نہ سہی
خدا کے سامنے پائیندگی جتا نا کیا
نگاہ پاک ہو، دل صاف ہو، وضو نہ سہی
کہاں وہ جلوۂ عریاں، کہاں یہ حُسنِ حجاب
یہی تو دید کے قابل ہے روبرو نہ سہی
کسے خبر ہے یہ صورت ہے کس مرض کی دوا
نظر میں جچتی نہیں ایسی رنگ و بو نہ سہی
یگانہ آم وہی ہیں، وہی ہیں خربوزے
یہ لکھنؤ ہے وہی، گو وہ لکھنؤ نہ سہی

○

جلوۂ حسن کا ہر چند اثر پڑتا ہے
پاس جاتا ہُوں تو کچھ اور نظر پڑتا ہے
بے گناہوں کو بھی پامال کیے ڈالتے ہو
پاؤں رکھتے ہو کہاں، اور کدھر پڑتا ہے
لڑکھڑاتی ہیں زبانیں سرِ محفل، کیا کیا
تمھیں دیکھو جو مری چُپ کا اثر پڑتا ہے
تجھے کیا دیکھے کوئی، کون سے رُخ سے دیکھے
اک نظر دیکھ لے بس عکس جدھر پڑتا ہے
✓ تو سہی پھونک دوں یہ پاپ کی بستی ساری
کیا کہوں بیچ میں اک آپ کا گھر پڑتا ہے
کیسے خوش ہوتے تھے پہلے مگر اب کیا کہیے
ناگہاں جب کوئی مہمان اُتر پڑتا ہے
جان کھا جائے گا یہ عیش و طرب کا دورہ
پڑنے لگتا ہے تو پھر شام و سحر پڑتا ہے
حُسنِ بے باک کی اللہ رے بیگانہ روی
دستِ گستاخ جہاں، کوئی نظر پڑتا ہے

دیکھ کس ناز سے دنیا تجھے ڈھکاتی ہے
ہاتھ چھوٹا ترا پڑتا ہے جدھر پڑتا ہے

فکرِ فردا ہے وہ بلا ہے کہ یگانہ صاحب
سوکھنے لگتا ہے دم ، سایہ اگر پڑتا ہے

○

خلش تو کوئی دلِ دوست میں نہ رہ جائے
بجا ہے شوق سے جو مُنھ میں آئے کہہ جائے

ذرا سی بات پہ لگتی ہے چوٹ کیا کہیے
دلِ حزیں کہیں اک ٹھیس میں نہ ڈھ جائے

یہ کیا کہ ہر کس و ناکس سے دل لگا بیٹھے ؟
وہیں کا ہو رہے انسان جس جگہ جائے

خود اپنی فکر میں ڈوبا رہے بُرا کیا ہے
اجی یہ دل کوئی تنکا نہیں کہ بہ جائے

ارے گئی تو گئی جس کی بات اُس کے ساتھ
یہ کیا ستم ہے جوانی کی یاد رہ جائے

کہاں کا جرم ، کہاں کی سزا ، کہاں کا عذاب
جہاں اشارۂ پنہاں کچھ اور کہہ جائے

وطن کو چھوڑ کے پہنچا غریب جنت میں
یہاں سے اور کہاں جاتے کس جگہ جائے

عجیب نسخۂ حکمت ہیں کھیل قدرت کے
مجال کیا ہے ذرا سی کسر جو رہ جاتے

دلِ ستم زدہ آغوشِ کامرانی میں
خدا نخواستہ آسودہ ہو کے رہ جاتے

یگانہ وہ تمھیں کیا مانتا نہیں لیکن
قلم کی مار تو ایسی نہیں کہ سہہ جائے

حُسن کافر کی پرستش عینِ ایماں کیوں نہ ہو
دل جو رکھتا ہے مسلماں کیوں ہو انساں کیوں نہ ہو
جھوٹ کو سچ کر دکھاؤں کل نہیں پرسوں سہی
دوست سے انکار مشکل، وعدہ آساں کیوں نہ ہو
اور ترساتا ہے مفلس کو ترستا دیکھ کر
حُسنِ ارزاں ضد کے مارے اور ارزاں کیوں نہ ہو
اپنی صورت، اپنی سیرت، اور یہ ظالم آئنہ
اپنی آنکھوں میں سبک حُسنِ پشیماں کیوں نہ ہو
شوقِ آزادی خیالِ خام تھا کل تک مگر
وقت آ پہنچا تو کارِ شوق آساں کیوں نہ ہو
پاؤں کی لغزش ہے اور کوئی سہارا بھی نہیں
ہاتھ اُٹھ کر کم سے کم اپنا نگہباں کیوں نہ ہو
آہ کب تک روز و شب کی یہ ورق گردانیاں
صبح و شامِ زندگی خوابِ پریشاں کیوں نہ ہو
خود کھنچا جاتا ہے دھارا اپنی منزل کی طرف
جذب صادق ہو تو پھر دشوار آساں کیوں نہ ہو
آگے کیا کیا سُوجھتی تھی واہ رے دیوانے واہ
علم کی عینک لگا بیٹھا تو حیراں کیوں نہ ہو
خانۂ دل میں بھری ہیں جانے کیا کیا دولتیں
قفلِ خاموشی مرے گھر کا نگہباں کیوں نہ ہو
ہنستے ہنستے رہ گیا اپنا سا مُنھ لے کر غریب
جا و بے جا ہنسنے والا خود پشیماں کیوں نہ ہو
کیا بتاؤں میری بربادی میں کس کا ہاتھ ہے
دستِ قدرت ہے تو پیدا کیوں ہے، پنہاں کیوں نہ ہو
کون نظروں میں سما سکتا یگانہ کے سوا
حق شناسی کفر کیوں ہو، عینِ ایماں کیوں نہ ہو

خدا کہاں ہے کسے در میان دے کوئی
بتوں کے نام پہ شاید امان دے کوئی
کدھر سے آتی ہے مستانہ بوئے پیراہن
کہاں ہے، کون ہے، کس کا نشان دے کوئی
نگاہِ حسن کا حسنِ طلب ہے جانِ امید
امید ایسی تو پھر کیوں نہ جان دے کوئی
مزا ستانے کا جب ہے کہ دل ٹھکانے ہو
حواس گم ہوں تو کیا امتحان دے کوئی
ارے وہ ناچ نچاؤں کہ روح وجد کرے
شکستہ ساز پہ میرے جو دھیان دے کوئی
خودی کا نشہ نہ چڑھ جائے، مت پلٹ جائے
خدا نکردہ یگانہ کو تان دے کوئی

○

کوئی محرم نہیں اس دل کے نہاں خانے کا
داغِ پنہاں نہیں یہ گنج ہے ویرانے کا
چارہ سازوں نے سُنی ایک نہ دیوانوں کی
راستہ روک لیا بیچ سے ویرانے کا
صبحِ پیری نے کیا دل کے کنول کو ٹھنڈا
آئنہ خانے پہ عالم ہے سیہ خانے کا
کیا اسی پردے میں ہو جائے گا دیدارِ خدا
شوق بیجا ہے ان آنکھوں کو صنم خانے کا

○

غضب ہے جرمِ شور انگیز پر مجبور ہو جانا
پتے کی بات کہہ کر بے دھڑک منصور ہو جانا
طلسمِ پیش و پس میں گھر کے رہ جانا قیامت ہے
غنیمت ہے لگی میں اپنی حد سے دُور ہو جانا

کمالِ عشق کن آنکھوں سے دیکھے گا جمال اپنا
خود اپنا دل جلا کر آپ شمعِ طور ہو جانا

○

سر سلامت پھر بہارِ سنگ طفلاں دیکھنا
دل سلامت لذتِ صد درد و درماں دیکھنا
جنگِ حسن و عشق کا کیا دل شکن نظّارہ ہے
شعلہ و پروانہ کو دست و گریباں دیکھنا
آنکھ بھر کر جاگتے میں کوئی دیکھے کیا مجال
خواب میں ممکن ہو شاید روئے جاناں دیکھنا
جلوۂ موہوم کیا اک درد کا پیمانہ تھا
ہو گیا آپے سے باہر ظرفِ انساں دیکھنا

○

جو دل کو توڑ کے فرمائے فکرِ دل جوئی
وہ کیا شکستہ دلوں کا مزاج داں ہوتا
غم اپنے حق میں ہے گویا غذائے روحانی
یہ دردِ دل جو نہ ہوتا تو میں کہاں ہوتا
خود اپنے دل کو دکھاتا ہوں اے معاذ اللہ
بغل میں کاٹتے اک دردِ جاوداں ہوتا
ثبوتِ زندگیٔ عشق کچھ تو دینا تھا
نشانِ دل نہ سہی، دردِ بے نشاں ہوتا
کہاں کی بوئے حقیقت، کہاں کا رنگِ مجاز
جو آپ سے دُور یہ پردہ نہ درمیاں ہوتا

○

کیا خوب اُلٹے پاؤں جوانی پھر آگئی
دیکھو نہ میرا شعر جوانوں سے لڑ گیا
دونوں کے دل سے پوچھیے انجامِ کارِ عشق
دل گھستے گھستے گھس گئی بنتا بگڑ گیا

دامِ خرد سے چھوٹ کے پہنچا مراد کو
دیوانہ بن کے قیس بنا ۔ یا بگڑ گیا
شیطان کا مقابلہ کیا عشقِ پاک سے
لڑنے کو لڑ پڑا مگر آخر پچھڑ گیا

○

ایک لیلیٰ کے اتنے دیوانے؛
سچ تو ہے ایک انار سو بیمار
آگئی چھینک رُک گیا پیشاب
پھر بھی انسان ہے فاعلِ مختار
کس مزے سے ہیں بیویوں والے
عیش کرتے ہیں روزمرہ ادھار
نہ تجھی میں رہا نہ مجھ میں کچھ
میرے آگے اب آشنا مُنھ نہ پسار
کیوں نہ مہنگے جلیں گے سستوں سے
کس کے دم سے ہے گرمیٔ بازار

○

نگاہ بے زباں نے کیا اثر ڈالا برہمن پر
مٹا ہے پیکرِ بے دست و پا کے رنگ و روغن پر
رہا تا حشر احسانِ ندامت میری گردن پر
بجائے مے ٹپکتا ہے زلالِ اشک دامن پر
شرف بخشا دلِ سوزاں نے مجھ کو دوست دشمن پر
وہ دل جس کا ہر اک ذرہ ہے بھاری موم و آہن پر
نہ جانے پہلی منزل برقِ سوزاں کی کہاں ہوگی
ستم آباد کے خطے میں یا اجڑے نشیمن پر
عجب کیا ہے سحر تک آنکھوں ہی آنکھوں میں پی جائیں
قیامت ڈھائیں گے بدبیں جمالِ شمعِ روشن پہ
زہے الزامِ آزادی کہ حسرت رہ گئی دل میں
نشیمن سے نکل کر بیٹھتے شاخِ نشیمن پر
نتیجہ کچھ بھی ہو لیکن وہ اپنا کام کرتے ہیں
دلِ بے مدعا ہنستا ہے کیا شیخ و برہمن پہ
بجائے نفسِ امارہ دلِ مجبور کو مارا
گوارا کر لیا کیوں خونِ انصاف اپنی گردن پہ

عدو کیوں منت پاس آپ کا صبر آزما ہوتا
ارے یہ تہمتِ بے جا بجائے دوست دشمن پر

○

دلِ خود را کہ پشیماں نتوانم دیدن
بہ کفے دست و گریباں نتوانم دیدن
روزِ عید آمدہ تا ساز یک آہنگ زنیم
جنگ با گبر و مسلماں نتوانم دیدن
وقت آنست کہ سازم بہ ہمیں لیل و نہار
خویش را بے سر و ساماں نتوانم دیدن
تا کجا گوش بر افسانۂ ماضی باشم
روز و شب خوابِ پریشاں نتوانم دیدن
بر ہمیں پشتِ ورق رنگِ تماشا ریزم
رشتۂ مقصود چو آساں نتوانم دیدن[1]

○

حُسن سے بے خبر گزرنا کیا
سجدۂ حق ادا نہ کرنا کیا

دم بخود ہیں تمام محرمِ راز
تہ کو پہنچے تو پھر ابھرنا کیا

دیکھ ڈالے بہت جلال و جمال
برق چمکے تو چشم ڈرنا کیا

اک نگاہِ غلط اِدھر بھی سہی
یار انصاف سے گزرنا کیا

دل دھڑکتا نہیں ترا ہے ہے
خونِ ناحق سے ہاتھ بھرنا کیا

"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"
پردے پردے میں یہ سنورنا کیا

صبح کے دم سے تھی وہ شادابی
شام ہوتی ہے اب نکھرنا کیا

دل کا کیا حال ہے کہو تو سہی
دردِ سر کا بہانہ کرنا کیا

ہو نہ ہو دل کسی کو دے بیٹھے
ورنہ بے وجہ مُنھ اُترنا کیا

دیکھ لیں وہ تو کیا قیامت ہو
دم بدم آہِ سرد بھرنا کیا

لا اُبالی جیے ، خوشی سے مرے
رات دن غم کے مارے مرنا کیا

---

[1] یہ اشعار ۱۴ اپریل ۱۹۲۶ء کو عید الفطر کے دن ، لاہور میں کہے گئے۔

اجی ظالم ہو گیا ہے جاہل ہو ۔ اپنے بندے کو نام دھرنا کیا
خاک اڑتی ہے پیٹ میں ساقی ارے خالی پیالہ بھرنا کیا

ہر طرف نت نئی خدائی ہے
پھر یگانہ کو یاد کرنا کیا

○

فریبِ آرزو کب تک، اُمیدِ سخت جاں کب تک؟
مجھے خود بھی تعجب ہے رہے گا دل جواں کب تک؟
رہو گے پردۂ سیمیں پہ رسوائے جہاں کب تک
ارے یہ خود نمائی خود فروشی کی دکاں کب تک
دو روزہ نوجوانی کیا ہے مٹی کا کھلونا ہے
تمہارے ساتھ دل بہلائیں گے پیر و جواں کب تک
زمانہ کون سا تھا؟ نوجوانی کا زمانہ تھا
زمانے سے لڑی رہتی نگاہِ پاسباں کب تک
زمانہ ساتھ دیتا ہے چلو جب ساتھ ساتھ اُس کے
مگر بچھڑے ہوؤں کی تاک رکھتا کارواں کب تک
عجب حربہ ہے خاموشی چلانا جس کو آتا ہو
چلے گی اُس کے آگے آپ کی تیغِ زباں کب تک
دلِ تاریک میں نیکی بھی جو آئی تو کیا آئی
اندھیرا ہی اندھیرا ہو تو ٹھہرے میہماں کب تک
کہاں لے جائے گی یہ فکرِ دُور اندیشی کیا جانے
نظر کے سامنے نیرنگِ باطل کا دُھواں کب تک
یگانہ کی غزل تم نے سُنی کی اَن سُنی کر دی
مگر دردِ سخن کی تاب لائے گی زباں کب تک

○

کیا بن پڑے جو شوقِ طلب کی مدد نہ ہو
کھٹکا ہے دل کو ہمتِ رہبر ہی بد نہ ہو

قدرت کے کارخانے ہیں یہ کیا بعید ہے
آغاز نیک جو نہ ہو، انجام بد نہ ہو
ہوش و خرد دو ورق کونین میں ہیں گم
پاؤں کہاں وہ دردِ طلب جس کی حد نہ ہو
کانوں میں ہیں رچی ہوئی کیا کیا روایتیں
کب تک دماغ پر اثرِ نیک و بد نہ ہو
خالی کا یہ مہینہ ہے، اب کی خدا کرے
سرکارِ حُسن میں مری درخواست رد نہ ہو
ٹکرائیے کسی سے نہ صدمے اٹھائیے
رد اِس طرف سے کیوں ہو اُدھر سے جو کد نہ ہو
عیدیں خدا نکردہ منائیں الگ الگ
دونوں کے واسطے یہ کہیں روزِ بد نہ ہو
دیکھو زمین پاؤں تلے سے نکل نہ جائے
اتنا اکڑ کے چلتے ہو، اک روز جد نہ ہو
میٹھی زباں سے آپ تو مُنھ مار دیتے ہیں
دکھ دیتے ہو وُہ منت کا احساں کہ رد نہ ہو
جب اور کوئی فیض نہ پہنچے تو کم سے کم
شاہوں کا عیب اپنے لیے کیوں سند نہ ہو!
لڑتی نہیں نظر تو غنیمت ہی جانیے
جلووں کی مار آنکھوں پہ ہو دل پہ زد نہ ہو
زندہ رہا تو کیا، ارے پیدا ہوا تو کیوں
وہ بدنصیب جس سے کسی کو حسد نہ ہو
عالم میں روشنی تو یگانہ کے دم سے ہے
کیا ہیں یہ چاند تارے جو یہ اک عدد نہ ہو

○

یہ دل ہے یا کوئی پتھر کہ چوٹ ہی نہ لگے
کھری کھری کہو مُنھ پر تو کیوں بُری نہ لگے

جبھی تک آپ کا نادم ہوں میں تو دل سے
کر اپنے ساتھ کوئی شرطِ بندگی نہ لگے

کبھی تو آئینہ دیکھو نگاہِ دشمن سے
خدا کرے یہ نصیحت تمہیں کڑی نہ لگے

وطن سے چھوٹ کے غربت میں دل لگے کیوں کر
یہ وہ نہال ہے جس کی قلم کبھی نہ لگے

بدل کے بھیس زمانے کی تھاہ لینا ہے
نگاہِ شک میں کوئی بات اجنبی نہ لگے

نکال لینے دو یاروں کو حوصلہ دل کا
دعائے بد بھی کریں وہ تو یاں کبھی نہ لگے

گناہ گار ہوں پھر بھی وہ دل دیا تو نے
تری جناب میں پہنچوں تو تھرتھری نہ لگے

یہی حدیثِ یگانہ جو تم نے دل سے سُنی
زبانِ غیر سے سُنیے تو کچھ بھلی نہ لگے

غیر مطبوعہ منظومات

کالا بھُوت

شعر کہنے لگا ہے کالا بھُوت — رنگ لایا ہے کیا نرالا بھُوت
گھی کے جلنے لگے خبیثوں میں — کس اندھیرے کا ہے اُجالا بھُوت
انھیں لاتوں کی ہے یہ بلہاری — پھاند سکتا تھا کیا ہمالا بھُوت

صورت و سیرت ایک سی واللہ
کس نے سانچے میں ایسا ڈھالا بھوت

انسانیت عین ایمان

بمبئی والے ہاشم اسماعیل — ہوں تو ایسے ہوں دوست، ایسے خلیل
حیدرآباد میں مجھے یہ ملے — جیسے نعمت خدا کی قدرت سے
ایسے مخلص کہاں سے پاؤں گا — کون ہے اک دواُرکا کے سوا
مرد جوہر شناس ، شائستہ — خدمت دوست پر کمر بستہ
وہ ہیں بمبئی میں لکھنؤ میں ہم — پھر بھی اُن کی نظر میں ہیں ہر دم
میرے دُکھ درد کا انھیں احساس — اپنے اخلاق ، اپنے فرض کا پاس
ہے یہ معیار اُن کے ایماں کا — مرتبہ جانتے ہیں انساں کا

جگر گتوں کو یگانہ دیکھ چکے
خوب رنگِ زمانہ دیکھ چکے

خدا خیر کرے

دل بہت آج دھڑکتا ہے خدا خیر کرے　　اپنے سائے سے بھڑکتا ہے خدا خیر کرے
ایک اک سانس پہ گھبرا کے تڑپ اٹھتا ہے　　آپ ہی آپ پھڑکتا ہے خدا خیر کرے

قطعۂ تاریخ

نواب معین الدولہ بہادر رئیس پائے گاہ حیدر آباد دکن کا عنایت نامہ مورخہ ۹ بہمن ۱۳۴۸ف آج سیلو میں۔ ۱۱ بہمن کو مجھے ملا (صاحب موصوف کی خدمت میں مجھے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہے) کہ میرا اک دیوان "معین سخن" طبع ہو رہا ہے، اُس کے لیے اک قطعۂ "تاریخ" بھیج دیجیے تو باعثِ تشکر ہے۔ میں نے حسبِ ذیل قطعہ کہہ کر بھیج دیا۔ (یگانہ)

اے زہے حُسنِ فیضِ مُلکِ دکن　　دور پہنچا ہے جس کا آوازہ
سرپرستوں سے ہے یہیں کے بندھا　　آج علم و ہُنر کا شیرازہ
تم بھی تسکینِ ذوق کیوں نہ کرو　　وا ہے شعر و سخن کا دروازہ

اک اضافہ ہے دید کے قابل
ہے معینِ سخن گلِ تازہ

۱۳۵۷ھ = ۱ - ۱۳۵۸

غیر مطبوعہ اشعار

رہوں گا صورتِ تصویر پابندِ رضا ہو کر
ملے گی چپ کی داد افسانۂ بعد فنا ہو کر

کون کہتا ہے روح کو آزاد؛ چاہے تو کھینچ لاتے آدم زاد
کوئی جلتا ہے رشک سے تو جلے ارے جیسا چراغ ویسی مراد

مقدر کے کرشمے ہیں خطا کیسی سزا کیسی
مجھے اپنے کیے پر یاس پچھتانا نہیں آتا

تقرب سے شیطان کو فائدہ! تری پائنتی کوئی سویا تو کیا

کمالِ عشق ہے دونوں جہاں سے بے خبر ہونا
حواسِ ظاہری و باطنی کا منتشر ہونا

بلائے جاں ہے مستوں کے لیے اندیشۂ فردا
مآل کار کی تصویر کا پیشِ نظر ہونا

جاگتی جوت کی تھی سب لیلا آنکھ مندتے ہی تھا اندھیرا پاک

قفس پر بادل آتے آشیانے پر گری بجلی
چمن میں آگ برسے خانۂ دل تک دھواں آئے

دعائیں ہوں تو ایسی ہوں سفارش ہو تو ایسی ہو
فلک آہیں کھینچے دل سے صدائے الاماں آئے

کیا کوئی بات دور کی سوجھی منھ کے پاس آ کے گھورتا کیا ہے
رنگ و بو ایسی اشتہا انگیز چکھ نہ ڈالوں تو پھر مزا کیا ہے
پہلے ہی چھتے گال کاٹ لیا ابتدا یہ تو انتہا کیا ہے
کس زباں سے ہو آپ کی تعریف آپ کے سامنے گدھا کیا ہے

عجب انداز ہے چشم ستم گر کی شرارت کا
زباں کو مل نہیں سکتا کوئی پہلو شکایت کا

نہ دوا چاہیے مجھے نہ دعا کاش اپنی دوا کرے کوئی
درد ہو تو دوا بھی ممکن ہے وہم کی کیا دوا کرے کوئی

مبارک ہو نوید وصل پر مدہوش ہو جانا
بھنور میں ڈوب کر گم گشتۂ آغوش ہو جانا
مذاقِ عشق سے نا آشنا ہے کامِ جاں جب تک
سمجھ میں آئے کیوں کر نیشِ غم کا نوش ہو جانا

ہاتھ پھیلا کے گڑگڑاتا کیا مانگتا ہے دعا تو صدقِ دل مانگ

شہیدانِ وفا سوتے ہیں جلتی دھوپ میں غافل
غضب کی نیند آتی ہے ہوائے تیغِ قاتل سے

صیاد آہ کیا کریں فصلِ بہار میں دل اختیار میں نہ اجل اختیار میں
دل تنگ ہوں کشاکشِ امید وبیم سے دن گن رہا ہوں حسرتِ روزِ شمار میں

تلاطم نے اچھالا تھا بھنور نے گھیر کر مارا
خیالِ خام تھا بحرِ فنا سے پار ہو جانا

کاٹ دی رات ایک کروٹ سے نیند تیری حرام کیا کرتا

بوسہ مانگیں مانگنے دو اتنے کھسیانے نہ ہو
منہ چڑھا دو بس جواب جاہلاں ہو جائے گا
طفلِ دل مچلا تو مچلا پھر ہے کس کے مان کا
دیکھ کر تجھ کو جواں کیا نوجواں ہو جائے گا

تختِ رواں سے ہمت مرداز کم نہیں منزل کی دھن میں خوف کسے گرد راہ کا

چوٹ کھاتے کھاتے دل سنگ آزما ہو جائے گا
درد بڑھتے بڑھتے آپ اپنی دوا ہو جائے گا

اجل کے واسطے خالی نہیں مکاں اپنا ہے ایک دشمنِ جاں آج میہماں اپنا

دیکھیے مشتِ خاک کو وقت نے کیا بنا دیا
نشۂ حسن لے اڑا، شوق نے پر لگا دیا
ہائے وہ ماجرائے شب ہائے وہ صبح اولیں
جھک کے سلام کیوں کیا آئنہ کیوں دکھا دیا

حق بجانب ہے جو صیاد گلا گھونٹ دے اب سوتے فتنوں کو اسیروں نے جگانا چاہا

کاش اپنی رُوح خانۂ تن سے نکل سکے
زنداں ہے آب و گِل کوئی راحت کا گھر نہیں

صیاد کیا سنائیں تجھے ماجرائے دل
نالوں میں اب وہ درد نہیں وہ اثر نہیں
ٹوٹیں وُہ ہاتھ جن کی نہ ہو التجا قبول
کٹ جائے وہ زبان کہ جس میں اثر نہیں

کیا عجب خاک کے پتلے میں کرامت دیکھی
غم غلط ہو گیا جب چاند سی صورت دیکھی
سر تو اٹھتا نہیں اب ناز اٹھانا کیسا
ناتوانوں کی مگر آپ نے ہمت دیکھی

یہ رنگ، یہ بُو، ایک ہی جھونکے کی ہے مہمان
قائم نہ ہوا پر کوئی بنیاد رہے گی
منزل کی طلب ہے تو پس و پیش کہاں تک
خالی کبھی راہِ عدم آباد رہے گی؟

لاشہ کسی غریب کا پھکوا دیا تو کیا
لپٹے گی رُوح سایۂ دیوارِ یار سے
دل نے جہادِ نفس کیا بھی تو کیا ہوا
آخر شہید ہو کے پھرا کارزار سے

ذرّے ہی پارس تھے اپنی خاکِ پُر تاثیر کے
آشنا تھا کون پہلے نام سے اکسیر کے
ڈوب کر لائے تہِ دریائے فطرت کی خبر
فکر سے جوہر کھُلے آئینۂ تدبیر کے

وہی امام ہے اِس شاہراہِ فطرت کا
جو دل کے ساتھ ہے اور دل کے اختیار میں ہے
طلسمِ خاک کو دیوارِ آہنیں نہ سمجھ
سوادِ منزل اِسی پردۂ غبار میں ہے
اسی کو کہتے ہیں شاید طلسمِ بیم و رجا
یہ کیفیت جو نگاہِ گناہ گار میں ہے

مزا ایسا چکھا دوں زندگی بھر یاد رہ جائے
دبے پھر کیا کسی سے وہ جو میری چوٹیں سہہ جائے

ارتقا ہے جو فرشتہ کوئی شیطاں ہو جائے
کیا یہ ممکن ہے کہ بڑھ کر کبھی انساں ہو جائے
وحشیو اپنی اسیری کو مبارک سمجھو
تو سہی بابِ سعادت درِ زنداں ہو جائے

چھٹ بھیّوں میں ڈھونڈتے کیا ہو میرے بانکے شعر کی بات
شیر کا نعرہ، گینڈے کا دھکا، سانڈھے کی چوٹ، گدھے کی لات

دعائے خیر کا وہ کیا امیدوار رہے — جو اپنی آگ میں جل کر گناہ گار رہے

مزا تو جب ہے یگانہ کہ یہ دل خود بیں — خودی کے نشے میں بیگانۂ خمار رہے

صورت آبادِ جہاں خوابِ پریشاں تھا کوئی
دیکھتے ہی دیکھتے سب نقشِ باطل ہو گیا

عجب نہیں جو کبھی چپ کی داد مل جائے — کسے خبر کوئی کس بھیس میں کدھر مڑ جائے

نہ لینے دوں تمھیں کروٹ تو خود ہی کروٹ لوں — جو میرے ساتھ کوئی شام یا سحر مڑ جائے

کیوں نکہتِ بے پروا جامے سے نہ ہو باہر
کس دن کو وفا کرتی پیراہنِ رسوا سے

باز آ ریشہ دوانیِ جفا سے ظالم — بڑھتے بڑھتے کہیں ایسا نہ ہو افسانہ بنے

محوِ فطرت ہو کوئی دل تو کہیں کا نہ رہے — عین حکمت ہے اگر آپ سے بیگانہ بنے

وہیں پہ عرش اُتر آئے کیا تماشا ہے
کسی کے دھیان میں متوالے جس جگہ بیٹھے

خونِ ناحق پہ پسینا بھی نہ آیا ظالم — توبۂ خشک عجب کیا ہے جو باطل ہو جائے

رنگ و بُو لائی نویدِ دردِ سر میرے لیے
کر چکے پیشین گوئی بال و پر میرے لیے

مجھ کو یگانہ سنگِ ملامت کا خوف کیا — میں تو وہ پاک شہدہ ہوں[1] یاں کہیں جسے

تمیزِ عشق و ہوس وحشیوں سے ناممکن
کھڑے ہیں بیچ دوراہے پہ حق و باطل کے

مری طرف سے بھی اک ہاتھ اے ترے صدقے — دھگڑ کا تاؤ خصم پر اتارنے والے

بیہودہ سر پٹکنے کا حاصل نہیں کوئی
نقشِ قدم تک اب سرِ منزل نہیں رہا

دامنِ مطلب نایاب کی اللہ رے ہوس — دستِ شل حوصلۂ بے سروپا کرتے ہیں

ہاتھ اٹھاتے ہی چمک جاتی ہے بجلی دور تک
ہائے اب وہ جنبش کہاں اس دستِ بے شمشیر میں

سرِ برہمن ابھی ٹھوکروں سے ہو پامال — بتوں کے دل میں اگر ڈال دے خدا نیکی

---

[1] لکھنؤ کا مشہور شہدہ مگر صاحبِ ایمان (یگانہ)

آج اسیروں میں وہ ہنگامۂ فریاد نہیں
شاید اب کوئی گلستاں کا سبق یاد نہیں

غالبیات

یگانہ نے کیا اُن پہ چلی بھونک دی ۔ غلبچی پکارے چھری بھونک دی
غلبچی بھونکتا پھرتا ہے جیسے کوئی بورا ہا
ہاہاہا، ہاہاہا، ہاہاہا
مژدہ باد اہل نظر غالب پرستی ہو چکی ۔ جلوۂ حسن یگانہ آج ہر محفل میں ہے

غیر مطبوعہ رباعیات

آندھی اُٹھ کر پہاڑ کے دامن سے
ہاتھی کو اُڑا لے گئی کجلی بَن سے
پامال کرے کون سی طاقت اُس کو
پتیاتا پھرے جو اپنے ہلکے پَن سے

ہر رنگِ شباب اپنی طرف کھینچتا ہے
ہر حُسنِ حجاب اپنی طرف کھینچتا ہے
آپ ایسے کہ جنبش نہیں کرتے ورنہ
ہر دامِ سراب اپنی طرف کھینچتا ہے

ایسا نہ ہو یہ حُسن مصیبت ہو جائے
یہ گرمیٔ بازار اک آفت ہو جائے
اچھا ہے ڈھل چلی جوانی اُن کی
سورج نہ ڈھلے تو پھر قیامت ہو جائے

لڑتے ہی نگاہ دل دھڑکنے نہ لگے
نیت معصوم کی بھٹکنے نہ لگے
دل کے اندر دبی ہوئی چنگاری
دنیا کی ہوا کھا کے بھڑکنے نہ لگے

مردانِ عمل کو اجر کی پروا کیا
خود ذوقِ عمل اجر ہے اندیشہ کیا
دنیا میری بلا سے خوش ہو کہ نہ ہو
میں اپنے سے خوش ہوں تو غمِ دنیا کیا

لڑتے ہی نظر پینگ بڑھا لیتا ہوں
الٹا سیدھا سبق پڑھا لیتا ہوں
دل کی باتوں کو سنگ دل کیا سمجھیں
دو باتوں میں داؤ پر چڑھا لیتا ہوں

پردہ کوئی رکھتا نہ طلب رکھتا ہوں
ہاں ایک کھٹک سی روز و شب رکھتا ہوں
جس کی کوئی دوا نہیں تیرے سوا
دل میں وہ دردِ منتخب رکھتا ہوں

کیا جانے کوئی کدھر کدھر جانا ہو
جانے وہی جس نے حق کو پہچانا ہو
منزل اپنی ہے اور جادہ اپنا
رہبر دیکھے تو کتنا کھسیانا ہو

مردانِ خدا کسی کے آگے نہ جھکے
دل شعلۂ غم سے پُھک رہا تھا پُھکے
جادہ اپنا ہے اور ارادہ اپنا
دھارا کیا پتھروں پہاڑوں سے رُکے

اتنا سادہ تو کوئی انسان بنے
محفل میں قدم رکھتے ہی نادان بنے
گہرے اتنے کہ تھاہ دیتے ہی نہیں
بیٹھے ہیں جو کھوئے ہوئے انجان بنے

کیوں ساری خدائی میں اب اندھیر نہ ہو
ایمان پلٹتے بھی کوئی دیر نہ ہو
جاتی رہے بھوک پیاس جلوہ ایسا
دیکھے تو کبھی چشمِ ہوس سیر نہ ہو

سکھیوں میں سہیلیوں میں ہنس لینے دو
پھولوں میں دو گھڑی تو بس لینے دو
بادل ہے گھرا ہوا برس لینے دو
ہاں دل کو ذرا اور ترس لینے دو

انساں کی صحبت آدمی چاہتا ہے
زندہ رہنا ہے زندگی چاہتا ہے
دل ہے چنگا تو پھر گنواروں سے بھی
ہنسنے بولنے کو جی چاہتا ہے

ظالم کو بھی دیوانہ ہنسا دیتا ہے
اندازِ ستم گری بھلا دیتا ہے
چھوتا ہے نہ چھیڑتا ہے، حیرت تو یہ ہے
پتھر بھی ہو دل تو گدگدا دیتا ہے

کیا کہیے زمیں کتنی ہے زر کتنا ہے
سب کچھ سہی جنجال مگر کتنا ہے
دولت کو برتتے ہو؟ یہ تو دیکھو
دولت کے ساتھ دردِ سر کتنا ہے

کل تک تو وہی ہم تھے وہی دنیا تھی
دل میں پنہاں مگر نئی دنیا تھی
دیکھا کرتے تھے خواب آزادی کا
آج آنکھ کھلی تو دوسری دنیا تھی

اندھوں کو مبارک ہو یہ دیوانہ روی — کیا جانیں یگانہ کی وہ بیگانہ روی
دریا ہوں میں صحرا کا بگولا تو نہیں — دیوانہ روی بھی کہ مستانہ روی

کہنے کو تو کعبہ بھی خدا کا گھر ہے — دیکھا تو وہی اینٹ ہے یا پتھر ہے
حق کا مرکز ہے حق شناسوں کے لیے — یہ سینۂ بے کینہ عجب مندر ہے

ایسا نہ ہو حق کا سامنا ہو جائے — سارا یہ طلسمات ہوا ہو جائے
کیا کرتا ہے سچ پہ جان دینے والے — یاروں کا مزا نہ کرکرا ہو جائے

سارے جھگڑوں سے پا گیا چھٹکارا — دل ہے خالی تو کیا کرے بیچارا
فرہاد کا دردِ سر اُٹھاتا کیوں کر — گھسیارے کا بنا رہا گھسیلا

ناپاک نظر واہ کہاں گڑتی ہے — کس گند میں کم بخت پڑی سڑتی ہے
ننگے کی طرف دیکھ کے ہنسنا کیا خوب! — جب دیکھو نظر بُری جگہ پڑتی ہے

کیوں مردِ مدافعانہ رفتار چلے — چلنا ہے تو چنگیزی تلوار چلے
جولاں گہِ ہستی کا یہی ہے دستور — میداں اُس کا ہے جو پہلے مار چلے

درشن کچھ بھی نہیں مگر نام بڑا — لیلیٰ کو کبھی آپ سے پالا نہ پڑا
کیا حُسن ہے واہ کیا مسیحائی ہے — مُردہ بھی تمہیں دیکھ کے ہوتا ہے کھڑا

زخمی ہو کر زمیں پہ سردار گرا — باڈی گارڈوں کا بال بیکا نہ ہوا
اس پر بھی ہے یاروں کو وفا کا دعویٰ — واللہ وفا یہ ہے تو کیا ہوگی دغا؟

وہ حُسن ہے کیا جس میں نہ ہو خوئے وفا — دل ڈھونڈتا ہے دل میں پہلوئے وفا
اربابِ ہوس کی دل لگی کیا؟ وہی رنگ — مستوں کی غذائے روح کیا؟ جوشِ صفا

نیرنگیِ دنیا سے وفا چاہتا ہے
سادہ لوحی تو دیکھو کیا چاہتا ہے
دیکھیں کس کس کو راس آتی ہے یہاں
ہر نخلِ ہوس نشو و نما چاہتا ہے

آئے گی قدم باقدم آتے آتے
ظالم تجھے کیا دیر قیامت ڈھاتے
نیرنگِ جمال پر چڑھا رنگِ جلال
دنیا ہی بدل گئی پلک جھپکاتے

ہوتا کوئی پہلو میں بٹھانے والا
آغوشِ محبت میں اُٹھانے والا
دل آپ ہی آپ گدگدائے بھی تو کیا
جب تک نہ ہو کوئی گدگدانے والا

کافر کوئی اپنا ہے نہ دیں دار اپنا
اچھا نہ سہی کوئی خریدار اپنا
ٹیکا ہے نہ گھٹتا ہے یہاں ماتھے پر
سیرت اپنی ہے اور کردار اپنا

تخریب جسے کہتے ہیں اہلِ غفلت
عارف کی نظر میں ہے سراسر حکمت
کیوں آگ نہ برسے کیوں نہ بھونچال آئے
نیت جیسی ہو جس کی ویسی برکت

جلووں کی یہ تکرار رہا کرتی ہے
آنکھ اپنی گنہ گار رہا کرتی ہے
وہ صبح کا عالم تھا یہ شب کا عالم
نظارے پہ یہ مار رہا کرتی ہے

دل ہے بنیادِ عالمِ کون و فساد
دل ہی نہ رہا تو زندگانی برباد
تھے دشمن و دوست سب اِسی کے دم سے
دونوں پہلوئے زندگی تھے آباد

ڈھکاتی ہے کیا کیا یہ لگاوٹ کی نظر
تیکھی چتون کبھی یہ میٹھے تیور
جب دیکھتا ہوں تمہیں تو جی چاہتا ہے
کچا کھا جاؤں جیسے مولی گاجر

کھلتے ہیں علم سے بشر کے جوہر
پاکیزہ سرشت و بدگہر کے جوہر
جب اُٹھ گیا پردۂ جہالت ناداں
کھلتے پھر کیوں نہ خیر و شر کے جوہر

آوازے کسی پہ کسنے والا تو کون؟ ہاں پیتے ہیں مے، ترسنے والا تو کون؟
الست مچاتے ہیں اُدھم شام وسحر ہم زندہ دلوں پہ ہنسنے والا تو کون!

زاہد تو ہے اپنے رنگ میں مستِ الست میں بھی اپنے خیال میں حُسن پرست
کیا یُوسفِ نادیدہ کی تعریف کروں وہ نکہتِ پیرہن کہ اندھا بھی ہو مست

روکے گا کوئی کیا دلِ آگاہ کی راہ دیوانے کی یا چور کی یا شاہ کی راہ
منزل ہے وہی سب کی مگر کیا کیجیے کھوٹی ہوئی کیوں بندۂ درگاہ کی راہ

دیوانۂ عشق کو نصیحت توبہ وہ عقل کی باتیں، وہ حماقت توبہ
جذبہ کسی جذبے سے ہی مٹ سکتا ہے نفرت سے بدل گئی محبت توبہ

جی چاہے تو دل لگائیے بسم اللہ آشوب کوئی اٹھائیے بسم اللہ
دل کی دنیا میں ہو کا عالم کیوں ہے سوتے فتنے جگائیے بسم اللہ

نامحرمِ اسرار نہ سُن لے کوئی دیکھو پسِ دیوار نہ سُن لے کوئی
شوریدہ مزاج سر پٹکنے نہ لگیں زنجیر کی جھنکار نہ سُن لے کوئی

ہر گام پہ تازہ گُل کھلاتے چلیے ہر روز کوئی فتنہ اٹھانے چلیے
فطرت کے ساتھ ساتھ چلنا ہے اگر ہر وقت بگاڑتے بناتے چلیے

گاڑے ہیں بہادروں نے کیا کیا جھنڈے کیا کیا کوڑے چکھائے کیا کیا ڈنڈے
تھی سہو و خطا جوششِ عمل کے دم تک جب دم نہ رہا تو پڑ گئے خود ٹھنڈے

دُنیا سے الگ بیٹھے ہو دامن جھاڑے بکھرائے ہوئے بال، گریباں پھاڑے
رُو بیٹھے تو سہی پھر بھی نہ پیچھا چھوڑا گھر چھوڑ کے جا بیٹھے کہاں پچھواڑے

ہنستے ہی رہیں ہم تو عدو کیوں نہ جلے
ایسی زندہ دلی کہاں تک نہ کھلے
گریہ وہ جسے تو ہی سنے یا نہ سنے
خندہ ایسا کہ سات گھر ٹھیکے لے

پھر درد خدا چاہے تو کروٹ بدلے
پیدا ہو تڑپ مردہ دلی کے بدلے
مٹنے کے نہیں زندہ دلی کے آثار
یارانِ قفس سے شرط کوئی بدلے

کیوں مجھ پہ توجہ ہے خدا خیر کرے
ناکردہ گنہ گار بھی بے موت مرے
جن کی کوئی پرستش ہی نہ ہو ایسوں سے
کرتا بھی ڈرے اور نہ کرتا بھی ڈرے

موجی من کی یہ ایک دھن کیا کم ہے
پاپی ہی سہی مگر یہ پن کیا کم ہے
کس پریم کی دیوی کا پجاری ہوں میں
گن کوئی نہیں مگر یہ گن کیا کم ہے

پرچھائیں سی پردے پہ دکھاتا کیوں ہے
امکانِ ہوس کو آزماتا کیوں ہے
میں یہ نہیں کہتا کہ پلٹ آئے شباب
بھولا ہوا خواب یاد آتا کیوں ہے

گزرا ہوا وقت ہاتھ کیوں کر آئے
پودا مرجھا گیا تو پھل کیا لائے
پھر کیوں جھوٹی تسلیوں کی خاطر
چوکا اک بوند کا گھڑے ڈھلکائے

پستی سے بلندی پہ جو چڑھتا جائے
ہر خطرے پہ لاحول ہی پڑھتا جائے
ایسے کو سہارا نہ ملے کیا معنی
گرتا پڑتا جو آگے بڑھتا جائے

آپ اپنی جگہ شرم سے جو گڑ جائے
اُس پر بھی کوئی ترس نہ اس کو آئے
میرا تو خدا ایسا نہ ہو گا بخدا
بندے کی خطا بندے کے منھ پر لائے

واعظ کو مناسب نہیں رندوں سے تنے
منبر پہ تتاڑ دیں اگر دل میں ٹھنے
اچھے ہیں یگانہ یا بُرے، جیسے ہیں
یاروں نے بتا دیا کہ خود ایسے ہیں بنے

قیمت میں ہیں بدگہر بلالی سے سوا
تیکوں کے ہیں بول، انگر عالی سے سوا
جی جانتا ہے طنز یگانہ کے منہ سے
گالی تو نہیں مگر ہے گالی سے سوا

مرزا کا قدم غلط نہ پڑتے دیکھا
ناحق کبھی یاروں سے نہ لڑتے دیکھا
سیدھے سے آدمی تھے بالکل سیدھے
جھکتے کبھی دیکھا نہ اکڑتے دیکھا

ناکامیوں سے حوصلہ ہوتا نہیں پست
بدنام سہی حال میں اپنے ہیں مست
لکھی تھی میرزا یگانہ کے لیے
باطن کی فتح اور ظاہر کی شکست

کیا کیجیے یہ دنیا نے دنی کے مارے
کیوں کر پنپیں گے بددلی کے مارے
ارباب خرد غم زدہ و دست بدل
ٹاپے ہیں سبک مغز خوشی کے مارے

سنتا ہی نہیں زمانہ کیا کہتا ہے
دل ہے اپنا وہ اپنے خوش رہتا ہے
دیوانہ تو دیوانہ اُسے کیا پروا
دھارا تہذیب کا کدھر بہتا ہے

بننے کی ہوس میں کوئی آستانہ بنے
ہستی نہ بگڑ جائے تماشا نہ بنے
فطرت کا تقاضا تو یہی ہے واللہ
انسان بنے آدمی ہوا نہ بنے

سینہ کافر کا چاک کر ڈالیں گے
قصہ دم بھر میں پاک کر ڈالیں گے
سچ کے بل پہ اکڑتا ہے چنگیزی
ہم سچ کو کچل کے خاک کر ڈالیں گے

یہ تیزی طبع، اُف یہ کج رفتاری
دس بیس پہ جانتے ہو خود کو بھاری
کیا نور ہے، کیا زعم ہے، ماشاءاللہ
آپ اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری

اک وہ ہیں پھرا کرتے ہیں اکڑے اکڑے
اک ہم کہ شکنجے میں پڑے ہیں جکڑے
بیچارہ جو ورد سے ہو خود دست بدل
کس ہاتھ سے ظالم کا گریباں پکڑے

پیدا ہوئے فاختہ اڑانے کے لیے — دولت ہاتھ آئی ہے لٹانے کے لیے
آزاد تو آزاد انھیں کیا پروا — کھانے کے لیے ہیں کہ بلبلانے کے لیے

الٹا رستہ بتانے والے باز آ — ٹوٹا چرخا چلانے والے باز آ
کل جگ میں ہوس فضول ست جگ کی — الٹی گنگا بہانے والے باز آ

نیت ہے بخیر بول اپنا بالا — سادہ سی بات، جس کا مطلب سیدھا
چولھا ملا کا چاہے اوندھا ہو جائے — رندوں کا پیالہ تو نہ ہو گا اوندھا

کچھ قدر ہنر ہے نہ کوئی قیمتِ فن — بن پڑنے کی بات ہے کہاں کی جدّتن
ڈفلی بھی عجب ناچ نچا دیتی ہے — منڈھتی ہے تو خوب بجتی ہے ٹھنک ٹھن

ہو گا کوئی شریف عالی گوہر — میں تو نہ شریف ہوں نہ اعلیٰ افسر
عزت جو مٹائے سے کسی کے مٹ جائے — ایسی عزت پہ مارتا ہوں ٹھوکر

ایسا نہ سمجھیو کوئی خیلا ہوں میں — دھن کا پکا ہوں گو اکیلا ہوں میں
دم کیوں نہ بھروں پیجرِ علیؓ کا ہر دم — معلوم ہے کس گرو کا چیلا ہوں میں

مٹتے مٹتے ہے اب تک اتنا کس بل — جمہور کی ذہنیت کو دیتا ہوں کچل
چنگیز بچہ ہوں شیخ چلی تو نہیں — "تاریخ پکارے ہے ہیں "گریٹ مغل""

سوتا ہوں ترے ساتھ ارے واہ رے میں — روتا ہے رتن ناتھ ارے واہ رے میں
دیکھا جو مجھے مہری کے رستے بھاگا — پالا ہے مرے ہاتھ ارے واہ رے میں

زندہ ہے ادب تو قوم مرنے کی نہیں — روشن ہے آفتاب سے روئے زمیں
مرزا کا ذکر خیر کرنے والو! — آخر یہ ٹریجڈی ہے یا فتح مبیں

بپتا اپنے ہی دیس میں کیوں نہ سہے
بیچارہ غریب کیا کہے کس سے کہے
رہنا ہے یہیں اچھی بُری سہنا ہے
دل میں اُن کی جگہ رہے یا نہ رہے

کچھ دن تو رہا فتح کا سودا سر میں
ہلچل سی مچ گئی زمانے بھر میں
لُوٹا تو سہی لُوٹ کے لے جائیں کہاں
دلّی کیوں کر سمائے اُن کے گھر میں

تصویرِ عمل بہ چشمِ بینا ہم ہیں
ظاہر ہے کہ لاشریک تنہا ہم ہیں
کام اپنا ہے، شوق اپنا ہے، ڈھب اپنا ہے
اپنی ڈیوٹی کے کارفرما ہم ہیں

دنیا میں وہ مزا رہا بھی تو نہیں
اس باغ میں اب بُوئے وفا بھی تو نہیں
پھولوں سے پھلوں سے چھک گیا ہوں ایسا
چکھنا معلوم، سُونگھنا بھی تو نہیں

ممکن نہیں سب کے سب تونگر ہو جائیں
تقدیر کے دائرے سے باہر ہو جائیں
ہے ایک کا رنج دُوسرے کی راحت
خوش کون رہے جو سب برابر ہو جائیں

عاشق ہی نہیں ہوس کے بندے بھی ہیں
اندھوں سے سوا عقل کے اندھے بھی ہیں
اک وُہ ہیں کہ دوست سے گلے ملتے ہیں
پرچھائیں پر دوڑیں ایسے تو بھی ہیں

ہاتھ آئے گا کیا سہل نیا مال کہیں
ہر ایک سے چل سکتے ہو یہ چال کہیں
معلوم ہے تم ایک ہی بیہودہ ہو
پہلے مجھ سے کتر نہ لو گال کہیں

محفل تری بے رنگ نہ ہو جائے کہیں
اس رنگ میں پھر بھنگ نہ ہو جائے کہیں
ثابت ہے ترا جلوہ بے رنگ مگر
اندھوں میں کوئی جنگ نہ ہو جائے کہیں

بھوکا ترا کبھی نہیں چھکنے کا
انداز تو دیکھو کوئی مُنھ تکنے کا
کیوں کر ممکن ہے حُسن سے مُنھ پھیرے
مارے سے کبھی دل نہیں مر سکنے کا

کیا کیا حرم و دیر میں آوارہ پھرا | بندہ اپنی نظر سے پھر بھی نہ گرا
ماحول سے جنگ پر تُلا کیوں نہ رہے | رہتا ہے جو ہر طرف گناہوں سے گھرا

افسانۂ حسن و عشق دُہرا لیتا | بچوں کی طرح سے دل کو بہلا لیتا
کیا کیجیے اب وقت کچھ ایسا آیا | خالی مل مل کے ہاتھ گرما لیتا

کیوں ذوقِ نظر طعنۂ غفلت سہتا | جی میں اپنے نہ جانے وہ کیا کہتا
جب حسن و شباب ہو سراپا دعوت | دل کو کب تک کوئی مسوسے رہتا

آندھی طوفان سر سے گزرے ہر چند | خاطر میں نہ لایا کوئی دشوار پسند
ثابت قدمی کا راز کیا پوچھتے ہو | گہرا اُتنا ہی ہوگا جتنا کہ بلند

نغمہ بھی کوئی وجد میں لاتا نہیں اب | کیسا ہی مزا ہو دل کو بھاتا نہیں اب
اللہ اللہ یہ وقت بھی آ پہنچا | پیاری صورت پہ پیار آتا نہیں اب

بازار میں جب ایک بھی گاہک نہ رہا | دُکھتے دل سے کسی نے کیا خوب کہا
آغاز وہ تھا حسن کا انجام ہے یہ | ساری وہ رنگ و بُو ہوا ہو گئی کیا

زمزم سے گناہوں کا ہے دھونا اچھا | یا دردِ ندامت سے ہے رونا اچھا
مہمل ہے یہ سب، دل تو یہی کہتا ہے | دوزخ میں گھس کے پاک ہونا اچھا

کچھ معنی و مطلب سے نہ آگاہ ہوا | حق چھوڑ کے باطل کا ہوا خواہ ہوا
استاد سے منھ موڑ کے کیا پھل پایا | پڑھ پڑھ کے کتاب اور بھی گمراہ ہوا

غیرت ہی نہیں، جاؤ جہنم میں پڑو | جوتے غیروں کے کھاؤ آپس میں لڑو
کیوں خاکِ وطن کو کر رہے ہو ناپاک | آباد کرو جیل الگ ہٹ کے سڑو

چنگیز کا پوتا ہوں علی کا بندہ   بندے کو تو آتا نہیں لندا پھندا
جیت ہے بڑی یار الیکشن میں چلے   جاتے نہیں چھوڑ دیتے چلتا دھندا

ایسے میں سویرا ہے بھگا لے جاؤ   اردو ہو کر فارسی بچا لے جاؤ
اتو بولا بدھار نے والوں کا   تشریف کا ٹوکرا اٹھا لے جاؤ

بھگو نے کہا، کہاں بہتر ہے دہی!   سیروں پی جائے دہی ہو کر کڑھی
مل جائے جو رام پور کا پس خوردہ   دو لقمے میں چھٹ جائے چھچھوندی منھ کی

دروازہ نہ کیوں بند ہو روزی کا   دھندا چل نکلا آتش افروزی کا
کس نے ہڑتال کا پڑھایا تھا سبق   خمیازہ اٹھاؤ اب بد آموزی کا

سنتے ہو یار، پھبتیاں یاروں کی   چلتی نہیں ہیں چٹکیاں یاروں کی
دیوانہ بن کے میں بھی اک کام کروں   کہیے تو اڑا دوں دھجیاں یاروں کی

مٹی میں نہ مل جائے عداوت ساری   برباد نہ ہو جائے یہ آتش باری
صدمہ پہنچا کے دیکھ لو میں کیا کہوں   پتھر میں بھرا گیا ہے، اک چنگاری

کیا ہو گئی، وہ حُسن کی رنگت نہ رہی   بس رنگ ہی رنگ ہے طراوت نہ رہی
روکھے پھیکے سے پیٹ بھر لینا کیا   کیا لذت عیش جب طبیعت نہ رہی

یاروں کا گلا ہے اور دشمن کی چھری   بنتی نہیں کچھ بات بجز "خانہ پُری"
کس دل سے یگانہ کو بھلا دے کوئی؟   واللہ قلم کی مار ہوتی ہے بُری

دو بھر ہو سماج پر، حکومت پہ کُھلے   جس کا دھندا کبھی چلائے نہ چلے
راس آئے نہ مذہب نہ سیاست ہی پھلے   بیچارہ غریب شاعری !! نہ چلے

چھٹ بھیّوں کی شاعری کا یہ زور یہ شور
ایسوں کو کہے گا کون میدان کا چور
شاعر ہیں یا مشاعروں کے ٹھیکے
سُن پائی کوئی "طرح" لگانے لگے زور

پڑھتا ہے کوئی شعر، کوئی سنتا ہے
مُنھ تکتا ہے کوئی، کوئی سر دُھنتا ہے
اربابِ نگاہ روتے ہیں موتی
اندھا نقّاد کنکری چُنتا ہے

نقّادِ چغد ہے کہ گدھا ہے کیا ہے
اندھا ہے کہ نیت کی خطا ہے کیا ہے
آیاتِ وترانہ دیکھ کر بھی نہ کھُلا
آئینہ ہے یا الٹا توا ہے کیا ہے

بالغ ہونے کی کیا دوا چاہتے ہیں
کیا آج ہی سب کام کیا چاہتے ہیں
شاعر بن جائیں دس برس کے اندر
دیکھو تو یہ خام کار کیا چاہتے ہیں

کہتے ہیں شہیدوں نے شہادت پائی
ٹھنڈے ٹھنڈے سدھارے احتیاطی
کیا کہیے مگر اُس کی خوشی کا عالم
مُنھ موڑ کے حق سے جس نے دولت پائی

یہ گردشِ انقلاب، یہ فتنہ گری
کیا ساری خدائی ہے خبیثوں سے بھری
آندھی، طوفان، زلزلے جاگ اُٹھے
شیطاں نے سنائی واہ کیا خوش خبری

رہنا ہے دیس میں تو بسنا سیکھو
مرنے کے لیے کمر کو کسنا سیکھو
رونے کا جو وقت آئے تو ہنس کر ٹالو
ہنسنا نہیں آتا ہے تو ہنسنا سیکھو

کس مُنھ سے کہوں قہرِ خدا نے مارا
یا خلقِ خدا کی بد دُعا نے مارا
کیسا انگریز اور کہاں کا چنگیز
تجھ کو تو بزرگوں کی خطا نے مارا

فطرت کا تقاضا ہے بشر سے لغزش
میدانِ عمل میں نامور سے لغزش
پیدا کتنے ہیں، کتنے معنی پنہاں
کب تک نہ ہو اربابِ نظر سے لغزش

ہاں جب ہے مزہ قدرِ عمل پہچانے
دشمن بھی مرے قلم کا لوہا مانے
تخریب بھی کرتا ہوں برائے تعمیر
میں کون سے جھمیلے میں پڑوں تو کیا جانے

اتنی طاقت کہاں سے کوئی لائے
سو مرتبہ اندر آئے، باہر جائے
اس پر یہ ستم جب آئے، ٹھوکر کھائے
ایسی بیہودہ نوکری ؛ باز آئے

تھے اور بھی جانور رفاقت کے لیے
تاکا مگر آپ ہی کو خدمت کے لیے
انساں سے جُدا رہ نہیں سکتا کُتا
انسان بنا کُتے کی صحبت کے لیے

مانجھا ڈھیلا ہے اکھڑی اکھڑی بیٹھک
کس بل پہ کرے گا فتح ایسا مردک
عادت ہے جسے کموڈ پر بیٹھنے کی
اُکڑوں بیٹھے گا وہ کس پہ کب تک

آپ اپنی مثال ہے لکھنؤ کا ہر فرد
عورت وہ مردمار، وہ نازک مرد
نواب بہادر کی نزاکت دیکھی
سارنگی سُن کے ہو گیا کان میں درد

کیوں لکھنؤ میرزا یگانہ سے تنا؛
بگڑا ہوا کھیل پھر بنائے نہ بنا
میدانِ ادب مار چلا چنگیزی
چت ہو گئے تم، پون بھٹی ہریالا بنا

بے کار ہے اے دوست زمانے سے گلہ
دیتے ہیں بہادر ہی بہادر کو صلہ
حاصل ہے کسے عزت و ذلت کا شرف
جو لکھنؤ کے ہاتھوں یگانہ کو ملا

انساں وہی انساں ہے سعید الدارین
دکھ درد پہ اوروں کے جو ہو خود بے چین
کس مُنہ سے کہوں کہ میں ہوں تیرا بندہ
بندہ تیرا ہے ایک الطاف حسین[1]

آئینۂ اسلاف ہوں یہ کیا کم ہے
وصّاف نہیں صاف ہوں، یہ کیا کم ہے
گاندھی نہیں، اجمل نہیں، آزاد نہیں
میں بندۂ الطاف[1] ہوں یہ کیا کم ہے

---

[1] حضرت سیدی و مولائی مولوی الطاف حسین صاحب بی اے، ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول، اٹاوہ۔ (یگانہ)

دیکھو صغریٰ[1] یہ حال میرا کیوں ہے　　مُنھ میری طرف سے تم نے پھیرا کیوں ہے
چاروں جانب تھیں چار شمعیں روشن　　آج ایک طرف گھر میں اندھیرا کیوں ہے

غیروں کو ستایا نہ عزیزوں سے لڑے　　دور آنا مگر کسی سے بھاری نہ پڑے
کہتے ہیں مہاراج[3] بڑے آدمی ہیں　　ہم ایسے سر پھروں سے کیا ہو گئے بڑے

جگر مراد آبادی

جو میں نے کہا وہ بھی وہی کہنے لگا　　دو باتیں سُن کے تیسری کہنے لگا
میں نے کہی فارسی تو دیکھا دیکھی　　کالا کوا بھی فارسی کہنے لگا

چھٹ بھیّوں کا اندازِ فلاطونی کیا؟　　میرے آگے فریب موزونی کیا؟
منگل اتوار والے کالے کوّے　　تو کیا وہ "کموڈیا" بدایونی کیا؟

یہ کس نے بتائی رسم و راہِ ادبی　　میدانِ سخن میں یہ مبارز طلبی
کالا کوا بھی گاتا پھرتا ہے غزل　　کیا فیضِ یگانہ ہے زہے بوالعجبی

غالبیات

بگڑی تو عزیزوں سے بنائے نہ بنی　　یوں مر کے دکھا دیتے ہیں جب جی میں ٹھنی
وہ ٹھاٹھ کچھ اور ہی تھا یہ شان کچھ اور　　غالب شکنی کہاں، کہاں خود شکنی!

انگریز چھپر بیں کہیں آتے ہیں جناب　　کیا دور تھا آ جاتا کوئی اور عتاب
کیا عہدِ وفادار بنے تھے مرزا　　کیسا سوکھا ملا قصیدے کا جواب

---

[1] رباعی جو ام صغریٰ کی یاد میں ۱۹۰۹ء میں بمقام عثمان آباد کہی گئی تھی۔ اس پیاری بچی کی یاد اب تک دل کو تڑپاتی ہے۔ [2] یگانہ [3] مہاراجہ کشن پرشاد شاد
[4] فانی بدایونی

ڈیڑھ مرزا سے پٹے رشتہ جوڑا   پھر گومتی والوں ہی کا کتہ و چھوڑا
دِلّی والوں کو کیا اچھوتا چھوڑا؛   غالب کا بت بتاؤ کس نے توڑا؛

رہزن کے رُوپ میں رہبر یہ کیا؛   غالب کا پٹیت ایسا سخنور یہ کیا؛
واللہ یگانہ نے عجب کام کیا   سیتاں[1] کے بھیس میں پیمبر یہ کیا؛

مغرب زدہ بیدھوں کو نہ یوں چمکارو   چمکار کو کب مانتے ہیں پھٹکارو
یہ زورِ قلم ملا ہے کس دن کے لیے؟   مارو مارو غلیچیوں کو مارو

شرحیں لکھنے دو یوں ہی دن کاٹنے دو   انبار لگانے دو گڑھے پاٹنے دو
آیات و ترانہ کا مزا کیا جانیں   غالب کے سگوں کو ٹھیکرا چاٹنے دو

کیا مطلب مرہٹوں پہ کیسی بیتی   یا غدر کے پرکٹوں پہ کیسی بیتی
یہ دیکھنا ہے قلم سے چنگیزی کے   غالب کے دلچٹوں پہ کیسی بیتی

کیوں کیا ہوئی وہ ہیٹ بُسر کی تیزی   غالب کے پھندیت، نیم ٹرکی تیزی
ناک اُلٹی چھری سے پوچھ لی یاروں کی   کیا پوچھو ہو میرے "پارکر" کی تیزی

دل کتنوں کے چٹنی ہوئے پستے پستے   بہ بہ گئیں غم سے آنکھیں رِستے رِستے
کیا لاگ غلیچیوں سے رکھتا ہے قلم   تیز اور ہوا جاتا ہے گِھستے گِھستے

مرزا کو فلاطوں سے سوا پاؤ گے   سقراط و ارسطو کا چچا پاؤ گے
غالب کو غلیچی کی نظر سے دیکھو   ایسا نہ کرو گے تو خطا پاؤ گے

حافظ کو بھی اپنا پیشوا کہنے لگے   غالب کو بھی اپنا ہی سگا کہنے لگے
اپنی ہی جماعت میں گھسیڑا کیا خوب   دیکھا جسے ڈانڈ گا[2] چچا کہنے لگے

---

[1] سیتاں، لکھنؤ کا مشہور شہدہ گر صاحب عمارہ۔ ۱ یگانہ۔ [2] ڈانڈ گا: دکنی لفظ بمعنی لمبا تڑنگا، موٹا تازہ۔

یگانہ کے غیر مطبوعہ خطوط
دوارکاداس شعلہ کے نام

(۱)

عثمان آباد دکن ۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۲۸ء

عزیزم شعلہ صاحب زاد لطفکم

بعد سلام و دعائے شوق واضح ہو کہ محبت نامہ آپ کا آیا۔ خوش وقت فرمایا۔ پردیس میں دل بہلنے کی صورت یہی خطوط ہیں جو گھر سے اور ادھر اُدھر سے آجاتے ہیں۔ زیبا صاحب کی خیریت بس آپ ہی سے معلوم ہوتی رہتی ہے، اُن کا کوئی خط کبھی آیا ہی نہیں۔ اُن کا پتا بھی میں بھول گیا، خود لکھنا بھی چاہوں تو کیسے لکھوں۔ ساحر اور جوشش کا حال معلوم نہیں۔ ان سب کا پتا لکھ بھیجیے۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو لکھیے۔ اگر آپ کی محبت کا تقاضا یہی ہے تو سُنیے فقیروں کو کمل کے سوا اور کیا چاہیے۔ کوئی گرم کمل جو اوڑھنے کے قابل ہو بھیج دیجیے اور آدھ سیر خشک مہندی۔ آپ کے شعر بڑے اچھے خاصے ہیں۔ چند تازہ رباعیاں ارسال کرتا ہوں مگر اُنھیں کہیں چھپوائیے گا نہیں کیونکہ "نیرنگ خیال" کے ہاتھ فروخت ہو چکی ہیں۔

میں جس مقام پر ہوں جون جولائی کے مہینے میں بھی پچھلے پہر سے خنکی ہو جاتی ہے۔[1]

خیر اندیش ۔ میرزا یگانہ لکھنوی[2]

(۲)

۷۸٦

عزیز من ۔ بعد سلام شوق واضح ہو کہ آپ کا ایک خط کل پہنچا جس میں

---

[1] یہ جملہ بعد میں حاشیے پر اضافہ کیا گیا ہے۔

[2] خط کی دوسری جانب یگانہ نے اپنی چھے رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ یہ سب مطبوعہ ہیں اور "ترانہ" میں (ص ٦۸، ۸٦، ۸۸، ۱۱۰، ۱۲٤، ۱۷۵) موجود ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ پھر کھانسی بخار نے ستایا ہے۔ کیا کہوں بار بار آپ کی ناسازی مزاج پہ کچھ ہنسی بھی آتی ہے۔ آخر فرمایئے تو سہی نوجوان آدمی کے لیے آئے دن کا یہ جھگڑا کب تک۔
آپ نے مجھے اب تک یہ نہ بتایا کہ آپ کی نظر میں کوئی ایسی صورت [عورت؟] ہے یا نہیں جو آپ کی شریکِ زندگی ہو کر آپ کے سکون و اطمینان کا سبب ہو سکے۔ آپ اپنے کسی فہمیدہ و معقول عزیز یا دوست کے مشورے سے اپنی زندگی کو سیدھے راستے پر لگا دیجیے۔ ماں کی عدم موجودگی میں بیوی ہی اک ایسی چیز ہے جو انسان کی ہمدردی، نگہداشت اور خدمت کر سکتی ہے۔ وقت بہت ٹلتا جاتا ہے اور بات کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میری تو یہی دُعا ہے کہ پروردگارِ عالم جلد آپ کو ایک شریف النفس بیوی عطا کرے۔ آپ نے مخمل بھیجنے کو لکھا ہے، اُس کے ساتھ ایک یا دو گرم بنیائنیں بھی روانہ کر دیجیے تو عین عنایت ہو۔ یہاں دو بجے شب سے دن کے سات آٹھ بجے تک اچھی خاصی خنکی محسوس ہوتی ہے۔ مہندی کے لیے تو آپ کو پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔ اسی پارسل میں آدھ سیر خشک پسی ہوئی مہندی بھی رکھ دیجیے گا۔

زیادہ شوق دیدار۔ میرزا یگانہ لکھنوی
از عثمان آباد۔ دکن
29/7/28 [۱۹ جولائی ۱۹۲۸ء]

(۳)

عثمان آباد دکن۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۲۸ء

عزیز من! بعد سلام و دعائے شوق واضح ہو کہ محبت نامہ مورخہ ۱۲ ستمبر موصول ہوا۔ آپ کا اندازِ تحریر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی کسی پر عاشق ہو۔ بھائی میری تعریف مجھ سے کیا کرتے ہو۔ میں جیسا ہوں اللہ بہتر جانتا ہے مگر ہاں کچھ نہ کچھ مجھے بھی محسوس ہوتا ہے کہ میں کیا کہوں۔ میرا یہ شعر میری حقیقت کا پتا دیتا ہے:

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

آپ نے میری رباعی کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ کاش یہ فلسفۂ زندگی غالب کو بھی معلوم ہوتا۔ میں یہ کہوں گا کہ غالب فلسفۂ زندگی سے آشنا ضرور تھے مگر اسے کیا کیجیے کہ وہ بیان پر کافی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ جاننا اور بات ہے مگر شاعر کی زبان میں ادا کرنا

ۃ خط کے آخر میں یگانہ نے اپنی دو رباعیاں لکھی ہیں جو "ترانہ" میں ص ۱۱۰ و ۱۰۶ پر موجود ہیں۔

بالکل جداگانہ بات ہے۔

خیر میرا حال یہ ہے کہ جب سے حیدرآباد سے عثمان آباد آیا ہوں معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے احباب مجھے بالکل بھول گئے۔ حیدرآباد میں تھا تو لوگ ادھر ادھر سلسلہ جنبانی کرتے رہتے تھے وہاں سے چلا آیا تو اب کوئی کروٹ نہیں لیتا، یہ بڑی مشکل ہے۔

گھر کا حال یہ ہے کہ میری محترم و جان نثار بیوی اور میرے بچے میرے لیے تڑپ رہے ہیں اور میں اُن کے لیے بے قرار ہوں۔ اُن کی آواز میرے کانوں میں اور میرے پاؤں کی آہٹ اُن کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ آج دس مہینے سے میں اُن کو اور وہ مجھے دیکھنے کو ترستے ہیں۔ اللہ اکبر۔ دل کی دنیا کا یہ منظر بھی کیا عالم دکھا رہا ہے۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ عزیزم آغا جان سلمہٗ کو آپ بھی ایک خط لکھیے۔ وہ دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ افسوس ہے کہ آج پانچ برس سے میں ایسی آفتوں میں مبتلا ہوں کہ دم لینے کی مہلت نہیں ملتی۔ آغا جان کی تعلیم اب تک کچھ بھی نہ ہو سکی۔ جب سانس لینا دشوار ہو تو اور فرائض کہاں تک پورے ہو سکتے ہیں۔ اس کا رنج و قلق جو مجھے اور میری اہلیہ محترمہ کو ہے اسے اللہ ہی جانتا ہے۔ آپ نے اپنی چھوٹی بہن کا ذکر کیا ہے کہ وہ مجھے یاد کرتی ہے، حق تعالیٰ اسے خوش رکھے، پروان چڑھائے۔ میری طرف سے بہت بہت دُعا او پیار۔ مخلصی و محبی انور صاحب کو میرا سلام شوق کہیے۔ آپ کے اشعار اصلاح کر کے بھیجتا ہوں ملاحظہ ہو:

مجھ کو بے تاب کر دیا تو نے	اکؔ دل درد آشنا تُو نے
لے کے دل مجھ کو نعمتِ غم دی	خوب نعم البدل دیا تُو نے
درد کی جب دوا نہ تھی کوئیؔ	درد پھر کس لیے دیا تُو نے
دل دیا ہے تو سوز و ساز بھی دے	نہ دیا یہ تو کیا دیا تُو نے
حسن فانی پہ مبتلا کر کے	کیا کیا اے مرے خدا تُو نے

عشق کی انتہا بھی ہے شعلہؔ!
کر تو دی آج ابتدا تُو نے

۱؎ یگانہ نے لفظ "اک" قلم زد کر کے اس کی جگہ "ہاں" لکھا ہے اور حاشیے میں یہ عبارت لکھی ہے:
"اس مصرعے میں لفظ "ہاں" سے زور نہ دیا جائے تو ردیف بے کار ہو جائے گی۔ اور یہ بڑا عیب ہے۔"

۲؎ یگانہ نے یہ مصرع قلم زد کر کے ذیل کا مصرع لکھا ہے: ہائے جب اس کی کچھ دوا ہی نہ تھی

آپ کی حسبِ خواہش اپنی ایک یادگار غزل لکھ بھیجتا ہوں[1]

میرا اپنا فقط عثمان آباد دکن لکھا کیجیے۔ شولاپور نہ لکھا کیجیے۔

شولاپور انگریزی علاقہ ہے۔

خیر اندیش۔ میرزا یگانہ لکھنوی

(۴)

عثمان آباد۔ دکن۔ ۱ر اکتوبر ۱۹۲۸ء

عزیز من، سلام و دعائے شوق قبول ہو۔

آج آپ کا نامۂ اخلاص مورخہ ۲۸ ستمبر صادر ہوا۔ سارے خط کو کئی بار پڑھا۔ آپ نے حریتِ فکر اور آزادیٔ خیال کا ذکر کرتے کرتے یہ غضب کیا کہ میرا ایک شعر نقل کر دیا:

دل اپنا جلاتا ہوں کعبہ تو نہیں ڈھاتا

اور آگ لگاتے ہو کیوں تہمتِ بے جا سے

اُف میں کیا کہوں کس عالم میں تھا اور کہاں پہنچ گیا۔ الٰہی توبہ۔ دل کی دُنیا کا بھی کیا عالم ہے۔ ابھی کچھ تھا۔ ابھی کچھ ہے۔ یہ شعر نقل کر کے آپ نے میرا اسرار مزا کر کرا کر دیا۔ آپ کو غالباً معلوم ہے کہ میں اپنی باوفا اور محترم بیوی کا بندہ ہوں۔ چوبیس گھنٹے میں بس جب تک دفتر میں رہتا ہوں یا جب تک شطرنج کھیلتا رہتا ہوں (عثمان آباد آکر لڑکپن کا یہ شوق جو بالکل بھول گیا تھا، پھر تازہ ہو گیا ہے) وہ گویا مجھ سے جدا ہو جاتی ہیں، باقی ہر وقت میرے دل و دماغ پر اُن کا قبضہ رہتا ہے۔ آج کل میں نے ایک رباعی کہی ہے جس میں اپنے جذبات کی نہیں ان کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ آپ جانتے ہیں ہندوستان کی بیویاں اپنے شوہروں پر کس درجہ جان فدا کرتی ہیں (خصوصاً ہندو عورتیں جن کی مہر و وفا و صدق و صفا کی نظیر دنیا کی کوئی قوم پیش ہی نہیں کر سکتی) آپ کو معلوم ہوگا کہ لفظ "ساجن" یا "پیا" میں محبت کا کیسا اتھاہ سمندر موجیں مارتا ہے۔ جب کسی کا شوہر پردیس جاتا ہے اور اس کی جدائی کو بہت دن گزر جاتے ہیں تو اس وقت عورت کے عالمِ شوق و انتظار کی تصویر ممکن ہی نہیں کہ الفاظ سے کھینچی جا سکے ہاں بس الفاظ ایک دھندلا سا اشارہ کر دیتے ہیں۔ یہ دھندلا سا اشارہ بھی وہی صاحبِ کمال سخنور کر سکتا ہے جس کو اس کام کے لیے وہبی طاقت ملی ہے۔ ورنہ جذبات کی گہرائیوں کو

---

[1] اس خط کے ساتھ یگانہ نے اپنی مشہور غزل "جب تک خلشِ درد خداداد رہے گی" الگ کاغذ پر لکھ کر بھیجی تھی۔ غزل کا عنوان "انا الموجود" ہے۔

نگاہ کے سامنے سے گم نا قریباً محال ہے۔ خیر میں رَو میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ ہاں تو جب کسی عورت کو اپنے شوہر کی جدائی میں شوق و اضطراب حد سے بڑھ جاتا ہے اور وہ ہر وقت اس کی آمد آمد کی منتظر رہتی ہے اور اتفاق سے "کاگا" (کوّا) آ کر سامنے بیٹھ جاتا ہے تو وہ بیچاری دُکھ درد کی ماری کوّے کو مخاطب کر کے کہتی ہے کہ کاگا ہاں سچ بتا کیا وہ آرہے ہیں۔" کاگا راہ تو دے کاگا" یعنی وہ آرہے ہیں انھیں راستہ دے۔ یہ الفاظ کہتے پر اگر کوا جس مقام پر بیٹھا ہوا ہے وہاں سے اُٹھ کر قریب ہی دُوسری جگہ پر جا بیٹھے تو گویا یہ فال نیک ہے۔ یعنی کاگا نے راہ دے دی اور فال نکل آئی کہ ہاں اب وُہ ضرور آرہے ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے۔ اسی عالمِ شوق کو پیشِ نظر رکھ کر میں اپنی اہلیۂ محترمہ کی تصویر اپنے آئینۂ دل میں دیکھ رہا تھا کہ آپ کا خط ملا۔ اچھا اب وُہ رباعی ملاحظہ ہو:

دکھ درد کے ماروں کا نصیبہ جاگا   گھر بوٹنا ہے آج دلدّر بھاگا
دن کاٹے ہیں گن گن کے اسی دن کیلیے   ساجن آتے ہیں راستہ دے کاگا

اللہ اکبر۔ اگر سوز و ساز کے ساتھ کوئی ہجراں نصیب بیوی کسی دُوسری خوش گلو عورت کی زبان سے یہ رباعی گاتے ہوئے سُن لے تو غور فرمائیے کتنا وجد طاری ہو۔ گھر بوٹنا ہے، اِس کے معنی یہ ہیں کہ ساجن کی آمد آمد پر گھر کی رُت پھر گئی ہے۔ سارا گھر بزبانِ حال یہ سندیسا سنا رہا ہے کہ وہ آئے وُہ آئے۔ دلدّر بھاگا یعنی نحوست دُور ہوئی۔ دن پھر گئے۔ غرض یہ ہے کہ میں آج کل اس رباعی کے مزے میں تھا کہ آپ نے یہ شعر یاد دلا دیا:

دل اپنا جلاتا ہُوں کعبہ تو نہیں ڈھاتا
اور آگ لگاتے ہو کیوں تہمتِ بےجا سے

توبہ توبہ یہ دُوسرا عالم ہے جہاں اِس وقت میں آنا نہیں چاہتا تھا مگر آپ نے یاد دلا کر ستم کیا۔ یہ غزل تو "نیرنگِ خیال" کے سالنامے میں چھپ گئی ہے مگر آپ کہاں ڈھونڈتے پھریں گے، میں اُس کی نقل بھیجے دیتا ہُوں۔ یہ غزل بھی عجیب غزل ہے۔ فارسی کی غزل جو آپ نے طلب کی ہے وہ اِس پایہ کی نہیں ہے مگر ہاں بعض اشعار اُس کے بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔ یہ آپ نے ایک ہی کہی کہ بیماری میں خدا یاد آتا ہے، اس لیے بیماری لگی رہے تو اچھا ہے۔ بیمار ہوں آپ کے دشمن۔ یادِ خدا کا بہترین طریقہ دردِ دل ہے، الحمدُ للہ شکر کیجیے کہ خدا نے آپ کو اپنی عنایت سے یہ دولت عطا فرمائی ہے۔ حق تعالیٰ آپ کو مطمئن رکھے اور اعلیٰ مراتبِ انسانیت تک پہنچائے۔

دعا گو۔ میرزا یگانہ

(۵)

عثمان آباد ۔ دکن ۔ ۱؍ مئی ۱۹۲۹ء

عزیزِ من سلامت رہو

آج بہت دنوں کے بعد یاد کیا ۔ میں تو خط لکھتے لکھتے تھک گیا۔ آپ کے سابق پتے سے کئی خط لکھے ایک کا جواب نہ ملا۔ مختصر یہ کہ میں یہیں عثمان آباد ہوں ، اور یہ مہینہ مالی منفعت کے اعتبار سے اچھا گزرا ۔ دو سو روپے اس مہینے میں آمدنی ہوئی ۔ مگر آج کل لکھنؤ میں آب و ہوا بہت خراب ہے ۔ طاعون کا زور ہے ۔ عزیزم آغا جان سلمہٗ اب سے دور بہت علیل ہو گئے تھے ، اب رو بصحت ہیں ۔ مگر اُن کی چھوٹی بہن جو پانچ سال کی ہے ، علیل ہو گئی ہے ۔ میں تو اس فکر میں ہوں کہ کچھ رقم پس انداز ہو تو بچوں کو لے آؤں ۔ مگر اب بیماریوں کا سلسلہ ہے ۔ روپے بیماریوں میں اُٹھے جاتے ہیں ۔ ڈیڑھ سال سے بچوں سے جدا ہوں ۔ اللہ اکبر ۔ ارادہ ہے کہ آئندہ ستمبر میں بچوں کو لے آؤں ، خیر خدا مالک ہے ۔ آپ نے اپنے والد ماجد کی علالت کا ذکر کیا ہے ، اللہ تعالیٰ سب پر اپنا فضل و کرم رکھے ۔ کیا کہوں آپ کی خیریت نہ معلوم ہونے سے دل کو کتنا قلق تھا ۔ مگر شکر ہے کہ آج آپ کی خیریت معلوم ہوئی ۔ خط برابر لکھتے رہیں ۔ یہاں ایسی تنہائی ہے کہ خدا کی پناہ ۔ زیادہ شوقِ دید ۔ میرزا یگانہ ۔

میرزا فہیم بیگ صاحب[۱] کو کئی خط لکھے آپ کی خیریت دریافت کی مگر انھوں نے کسی خط کا جواب نہ دیا ۔ شاید خفا ہیں ۔ حفیظ صاحب کیسے ہیں میرا اسلام کہیے ۔ زیبا کیسے ہیں ، اُن کی خیریت لکھیے ۔

میرزا یگانہ

"نیرنگِ خیال"[۲] میں میاں بے خود موہانی کا مسلسل مضمون شائع ہو رہا ہے جس میں میرزا غالب کی کھلی ہوئی چوریوں پر ملمع سازی کی جا رہی ہے ۔ اُس پر میں نے ایک رباعی کہی جو قولِ فیصل ہے :

دیوانوں کے یہ زور نہ دیکھے نہ سُنے	نادانوں کے یہ شور نہ دیکھے نہ سنے
جھنڈے پہ چڑھانے کو چڑھاتے ہیں مگر	غالب سے "چچا چور" نہ دیکھے نہ سُنے

---

[۱] یہ عبارت حاشیے پر اضافہ ہے ۔

[۲] یہ عبارت خط کی دُوسری جانب اضافہ کی گئی ہے ۔ اس سے پہلے چار رباعیاں ہیں جو "ترانہ" میں (ص ۱۲۴ ، ۱۵۲ ، ۱۵۷ ، ۵۹ ا ب) موجود ہیں ۔

اس کا ایک ایک حرف کیا ایک ایک نقطہ صداقت سے لبریز ہے۔ انور صاحب کو سلام کہیں اور یہ رباعیاں اُن کو بھی سُنا دیجے۔ فقط میرزا یگانہ

(۶)

عثمان آباد، دکن۔
۱۰ر جولائی ۲۹ء

عزیز من ۔ زاد لطفکم۔ .... مرسلہ پارسل پہنچا، ممنون فرمایا۔ اس کے ساتھ آپ کا محبت نامہ بھی .... کہ عنقریب آپ کی شادی ہونے والی ہے؛ میں برابر آپ سے تقا[ضا] ...... خوشگوار فرض سے آپ کو جلد ادا ہو جانا چاہیے۔ حق تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ آپ کو .... و مسرت سے ہم آغوش کرے۔

میرے بھوپال جانے کی بھی ایک ہی کہی۔ یارانِ سرِ پُل ایسی ہی بے پر[کی] ...... بھوپال میں تو میرا کوئی شناسا تک نہیں معلوم ہوتا۔

خیر اب اِدھر کا حال سُنیے۔ صغریٰ بی بی کی علالت کا حال تو آپ کو معلوم تھا، آج ایک مہینہ ہوا کہ میری پیاری صغریٰ نے ہمیشہ کے لیے ہم لوگوں کو داغِ مفارقت دے دیا۔ میں پردیس میں تنہا ہوں اور تنہا بھی ایسا کہ کسی سے مِلتا جُلتا نہیں۔ چار پانچ گھنٹے دفتر میں گزر جاتے ہیں۔ باقی میں ہوں اور .... میں، اُمّ صغریٰ کی یاد دل کو تڑپاتی ہے۔ میرا تو یہ حال ہے نہ معلوم ..... ہوگا۔ بچے سبھی کو پیارے ہوتے ہیں، مگر یہ مرنے والی تو ایک ...... سر سے پاؤں تک یگانہ بیگم کی تصویر تھی۔ اللہ اللہ ..... کہ بھائی ابا اب چلے آنے اب چلے آئے مگر کہاں ..... ایسے پاؤں پکڑے کہ وہ غریب مرتے مر گئی اور غریب باپ ..... حسرت دل میں لے گئی۔ بھائی کچھ نہ پوچھو یہ سوچ کر کلیجہ ..... پہنچ نہ سکا اور وہ دل کی حسرت دل ہی میں لے گئی۔ .... عرصے میں میرے سب بچے کئی کئی بار بیمار پڑے، آخر پیاری صغریٰ کی [جا]ن یوں جاتی رہی۔ اب آج کل میری بڑی بچی حسن بانو علیل ہے۔ دعا کیجیے ..... اللہ اسے شفا دے۔ آغا جان سلمہٗ بھی کئی بار بیمار پڑے۔ بارے آج کل اچھے ہیں ..... اُسے جلد لکھنؤ پہنچنا اور بال بچوں کو یہاں لے آنا چاہیے مگر پھر وہی کہنا پڑتا ہے کہ بندہ مجبورِ محض ہے۔ میں ستمبر کے پہلے ہفتے کے قبل عثمان آباد سے ہِل نہیں سکتا۔ اب اِس میں جو کچھ بھی گزر جائے آپ کے دیکھنے کو میرا دل بھی تڑپتا ہے اور شادی کے موقع پر پہنچ سکتا تو اور بھی خوشی ہوتی۔ مگر کیا کروں

---

(۱) خط کے دریدہ ہونے کی وجہ سے بعض الفاظ ضائع ہو گئے ہیں۔ ایسے تمام مقامات پر نقطے لگائے گئے ہیں۔

مجبور ہوں۔ اگر ستمبر کے مہینے میں آپ کی شادی قرار پانے گی تو شاید کوشش کرکے .... ایک دن کے لیے لاہور آسکوں گا ورنہ جو حال ہے وہ ظاہر ہے۔ [ہر] حال میں شکر اس امر کا کرتا ہوں کہ کسی حالت میں پروردگارِ عالم کی طرف سے ..... جذبۂ شکایت پیدا نہیں ہوا۔ اور یہ جذبۂ عبودیت بھی اُسی ..... کے تصدق میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ مجھے ہر حال میں ثابت قدم .....

آپ کا خیر طلب۔ میرزا یگانہ

(۷)

۶۶ شاہ گنج، لکھنؤ ۲۴ ستمبر ۲۹ء

عزیزم شعلہ صاحب۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور پروان چڑھائے۔

محبت نامہ صادر ہوا۔ یہ سن کر مسرت ہوئی کہ آپ کی شادی کے دن قریب ہیں۔ میں نے بے شک آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر لکھنؤ میں ہوتا تو شریک ہونا ممکن تھا۔ میرا دل خود آپ کے عزیز شفیق کے دیکھنے کا متمنی ہے۔ میں روانگیِ دکن کی تاریخ یکم اکتوبر مقرر کرچکا تھا۔ آج آپ کا خط ملا کہ ۱۱ اکتوبر کو آپ کی شادی قرار پائی۔ چونکہ میں بال بچوں کو لے کر دکن جارہا ہوں اور یہ نہیں معلوم کہ دکن سے پھر لکھنؤ پلٹنے کا موقع مل سکے گا یا نہیں، اس وجہ سے میرا دل بھی یہی چاہتا ہے کہ آپ کو خصوصاً ایسے مبارک موقع پر دیکھ لوں۔ لہٰذا میں فقط اتنا کرسکتا ہوں کہ اپنی رخصت میں توسیع کراؤں اور آپ سے مل کر پھر لکھنؤ آؤں اور یہاں سے پھر دکن روانہ ہوجاؤں۔ اخراجات وغیرہ کی ذمہ داری آپ نے خود اپنے سر لی ہے تو اب مجھے کیا عذر ہوسکتا ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ علاوہ سفر خرچ کے اور بھی کچھ رقم آپ کی اُٹھ جائے گی۔ خیر جیسا مناسب ہو جلد تحریر فرمائیے کہ میں اپنا پروگرام مرتب کرسکوں۔ آغا جان آج کل تو اچھے ہیں آپ کو اکثر یاد کرتے ہیں اور تسلیم کہتے ہیں۔ اگر ممکن ہوا تو ان کو بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔ کیونکہ میری روانگیِ دکن کا زمانہ قریب آجانے کی وجہ سے میری جیب بہت کچھ خالی ہوچکی ہے۔

جواب جلد عنایت ہو۔

خیر اندیش۔ میرزا یگانہ[۱]

۱۔ اس خط کے ساتھ ایک پرچی بھی منسلک ہے جس کا اُوپر کا حصہ ضائع ہوچکا ہے، اس پر جو عبارت باقی رہ گئی ہے وہ یہ ہے: "..... اکتوبر تک لاہور پہنچ کر آپ سے ملوں گا آنے [illegible] ہوں گے۔ فی الحال تیس روپے بھیج دیجیے۔ خیر اندیش۔ میرزا یگانہ لکھنوی۔"

(۸)

مائی ڈیئر شعلہ۔ آپ کی غزل دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ آپ کے دل کو سوز و گداز سے کافی بہرہ ہے مگر یہ وہ دولت ہے جو انسان کو شاعر بنا کر عرف عام میں دنیاوی اعتبار سے نکما بنا دیتی ہے۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میرزا یگانہ
عثمان آباد۔ ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۰ء[1]

بھئی میرا بلاک ضرور بنوا لیجیے۔ اس کے متعلق مفصل خط لکھ چکا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ رباعیاں چھپ جائیں۔

(۹)

احاطہ محمد حسین کردستانی
گزری منصور علی خاں، آگرہ
۳۰ر اکتوبر ۱۹۳۲ء

مائی ڈیر شعلہ۔ بعد سلام و دعائے شوق واضح ہو کہ میں بخیر و عافیت آگرہ پہنچا۔ طبیعت ابھی تک ٹھیک نہیں ہے۔ یونانی علاج ہو رہا ہے۔ سینے پر بلغم بہت جمع ہو گیا ہے جس کے اخراج کے لیے ابھی کئی دن تک علاج کرنا چاہیے۔ یگانہ بیگم صاحبہ تیلوں کی خوشبو سے بہت خوش ہوئیں۔ دعا فرماتی ہیں۔ آغا جان بھی صندل کے صابون سے بہت خوش ہوئے۔ سب نے نرملا کو بھی پوچھا کہ صورت شکل کیسی ہے۔ میں نے کہا اچھی خاصی گجری سی ہے مگر بیماری سے بہت لاغر ہو گئی ہے۔ خیر۔ اپنے والد ماجد کی خدمت میں میرا اسلام کہہ دیجیے۔ "نیرنگِ خیال" کے ایڈیٹر آپ کے پاس آئیں تو ۹۲/- روپے لے کر رباعیاں اُن کے حوالے کر دیجیے۔ اور تاکید کر دیجیے کہ بہت اعلیٰ درجے کی کتابت و طباعت کا انتظام کریں۔ میں نے اُن سے ایک سو روپے پر معاملہ اس لیے طے کر لیا ہے کہ اُنھوں نے انگریزی فیشن کی جلد بندھوانے اور اعلیٰ درجے کی طباعت اور کتابت کا وعدہ کیا ہے۔ میرزا صاحب کی خدمت میں سلام شوق، زیادہ نیاز۔ فوٹو کب تک آئے گا؟

میرزا یگانہ لکھنوی

---

[1] تاریخ انگریزی میں ہے۔

(۱۰)

احاطہ آغا محمد حسین کردستانی
گزری منصور علی خان۔ آگرہ
۴۔ نومبر ۳۲ء

پیارے شعلہ۔ آپ کا تحفۂ اخلاص پہنچا۔ ماشاءاللہ دونوں فوٹو اچھے اور بہت اچھے اُترے۔ نوک پلک ہر اک کی درست۔ مگر آپ جانتے ہیں عورتوں کی نگاہ نکتہ چینی کے بغیر نہیں رہتی۔ آپ پر یہ الزام دکھا گیا ہے کہ ننھی کے نہ کنگھی کی نہ کپڑے بدلوائے۔ گود میں بٹھا لیا، مگر انھیں کون سمجھائے کہ:

تکلف سے بری ہے حُسنِ ذاتی
قبائے گل میں گل بُوٹا کہاں ہے (آتش)

ولادت مولود مبارک۔ حق تعالیٰ عمر و اقبال عطا فرمائے اور زچہ کو صحت بخشے۔ میری طبیعت اب تک ٹھیک نہیں ہے۔ برابر علاج کرا رہا ہوں۔ کچھ افاقہ تو ضرور ہے مگر اندازے سے زیادہ طول ہُوا۔ آغاجان سلمہ اور یگانہ بیگم صاحب کا مزاج بھی ناساز ہے۔ سب کا علاج ہو رہا ہے۔

فوٹو بہت اچھے آئے مگر ضرورت ہے ہر دو فوٹو کی تین تین کاپیاں اور بھیج دیجیے کیونکہ بعض احباب کے تقاضوں کو ٹالنا مشکل ہوگا۔ آپ تو ماشاءاللہ جوان ہیں مگر میرا فوٹو خزاں کی بہار دکھا رہا ہے اور بعض احباب اس خزاں کی بہار کے زیادہ مشتاق ہوں گے۔ زیادہ کیا لکھوں۔

میرزا یگانہ چنگیزی

نیرنگِ خیال والوں سے معاملہ طے ہو جائے تو ایک فوٹو اُن کو بھی بلاک بنوانے کے لیے دینا پڑے گا۔ اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں میری طرف سے تسلیم عرض کر دیجیے۔ یگانہ بیگم صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ننھی بٹیا ہے تو پیاری پیاری، پاس ہوتی تو گود میں لیتی، پیار کرتی۔

(۱۱)

احاطہ آغا محمد حسین کردستانی
گزری منصور علی خان۔ آگرہ
۱۱۔ نومبر ۱۹۳۲ء

مائی ڈیر شعلہ

سلام شوق۔ اتنا تو معلوم ہو [ہوا ؟] کہ آپ کے ہاں بچی پیدا ہوئی ہے اور زچہ کا مزاج ناساز ہے۔ پھر آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ براہ کرم خیریت سے جلد مطلع فرمائیں۔ کیا بات ہے۔ فوٹو کی تین کاپیاں اور بھیج دیجیے ایک کافی نہیں ہو سکتی۔ اپنے والد ماجد کی خدمت میں میرا سلام عرض کیجیے۔

میرزا یگانہ

(۱۲)

احاطہ آغا محمد حسین کردستانی
گزری منصور علی خاں۔ آگرہ
۲۸ر دسمبر ۳۲ء

مائی ڈیر شعلہ۔ سلام شوق۔ ابھی آپ کا خط ملا حالات معلوم ہوئے۔ خداوند عالم جلد سب کو صحت عطا فرمائے اور آپ کو اطمینان بخشے۔

آغا جان کی طبیعت فی الحال بہتر ہے مگر مرض گھڑی گھڑی عود کرتا ہے، اس وجہ سے حالت قابل اطمینان نہیں کہی جا سکتی۔ اس لڑکے کی علالت نے مجھے سخت پریشان کر ڈالا ہے۔ جو کچھ پس انداز کیا تھا وہ خالصے [خالصے ؟] لگ گیا اور اب مزید مشکلوں میں پڑ گیا ہوں، وہ یہ کہ اس تین مہینے کی رخصت کی وجہ سے میرا تبادلہ ہو گیا۔ عثمان آباد میں جما جمایا بیٹھا تھا وہاں سے سارا سامان دیکھیے کہاں لے جانا پڑتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر مالی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ میں پہلے ہی سمجھتا تھا کہ طویل رخصت لینے سے یہ سب قباحتیں پیدا ہو جاتی ہیں مگر کیا کرتا آغا جان کی علالت اور ماں کی مامتا پر نظر رکھ کر سب کچھ گوارا کرنا پڑا۔ خیر اللہ مالک ہے پھر کوئی اچھا اسٹیشن مل جائے گا۔ اس وقت تو دشواریوں کا سامنا ہے۔ ایک فوٹو آپ کو بھیجتا ہوں غالباً پسند آئے گا۔ میں پرسوں ۳۰ر دسمبر کو حیدر آباد روانہ ہو جاؤں گا۔ اور وہاں سے پھر اپنے مستقر پہ پہنچ کر خط لکھوں گا۔ دیکھیے کہاں قیام ہوتا ہے۔ یگانہ بیگم صاحب دعا کہتی ہیں اور آغا جان تسلیم۔

میرزا یگانہ لکھنوی

(۱۳)

لاتور (دکن)۔ ۱۷ر اپریل ۱۹۳۳ء[1]

مائی ڈیر شعلہ۔ سلامت رہو۔ ذرا دیکھو تو سہی کتنے دنوں سے مجھے بھولے

---

[1] مقام اور تاریخ انگریزی میں ہے۔ خط کی پشت پر دو رباعیاں ہیں۔ ان میں سے پہلی "ترانہ" (ص ۷۰) میں ہے دوسری (مری سن کی ہر ایک رمس کیا کم ہے) غیر مطبوعہ کلام کے تحت شائع کی جا رہی ہے۔

بیٹھے ہو۔زیادہ کیا لکھوں۔تم خود سمجھ لو۔

میرزا یگانہ لکھنوی
سب رجسٹرار۔لاتور دکن

(۱۴)

لاتور، دکن۔۹ر مئی ۱۹۳۳ء[1]

عزیزی و شفیقی زاد لطفکم۔سلامِ شوق۔آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کی دُلھن کا مزاج زیادہ ناساز ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو جلد صحت یاب کرے اور آپ کو اطمینان مرحمت فرمائے۔دل لگا ہوا ہے۔اُن کی خیریت سے مطلع کیجیے۔بچّی کا مزاج کیسا ہے۔وہ بھی آئے دن بیمار رہتی ہے۔زندگی کے یہی مزے ہیں۔پندرہ دن سے مَیں بھی نزلے کی شدت سے تکلیف اُٹھا رہا ہوں۔بال بچے آگرے میں ہیں اور خیریت سے ہیں۔اپنے والد کی خدمت میں سلامِ شوق عرض کر دیجیے۔

خیر اندیش۔میرزا یگانہ لکھنوی

سُکھ میں جو سواد ہے تو دُکھ کے دم سے
سُکھ ہی سکھ ہو تو پھر اجیرن ہو جائے
یگانہ

(۱۵)

عزیز من، سلامت رہو۔

کاتب نے مسوّدے میں بین السطور بہت کم چھوڑا تھا۔خیر میں نے غزلیں دیکھ لیں۔ان کے صاف کرانے میں کہیں غلطی نہ رہ جائے۔غور سے مقابلہ کر لینا۔

دُوسرا مسوّدہ بھی پہنچ گیا ہے۔آٹھ دس دن بعد دیکھ کر بھیجوں گا۔باقی سب خیریت ہے۔

میرزا یگانہ چنگیزی
غوری منزل۔حیدر گوڑہ۔حیدر آباد دکن

۲۸۔فروری ۳۵ء[2]

---

[1] پتا اور تاریخ انگریزی میں لکھے ہیں۔
[2] یہ جملہ بعد میں حاشیے پر اضافہ کیا گیا ہے۔

(۱۶)

غوری منزل، حیدر گوڑہ
حیدرآباد دکن ۔ ۲۸ر جون ۱۹۴۵ء

پیارے دوست[1] ۔ آؤ تمھیں پیار کرلیں۔ محبت نامہ پہنچا۔ رقم پہنچی۔ دل و دماغ پر جو اتنا بوجھ تھا، ہلکا ہوا۔ میں خدا کا کیا شکر ادا کروں کہ یہ کام اوّل سے آخر تک کس خوبی سے سرانجام پایا۔ میرا فرض تم نے خود اپنے ذمّے لیا اور پورا کر دکھایا۔ کس شریف باپ کے بیٹے ہو۔ کس پاک نفس ماں کی گود کے پالے ہو۔ خدا تمھارے والدین کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ نرملا ستیہا کو پروان چڑھا ئے۔

اپنے پچھلے خط میں مَیں نے ناسازیِ مزاج کا حال دریافت کرتے ہوئے "آیاتِ وجدانی" (جدید) کا کسی پبلشر سے معاملہ طے کرنے کی بابت لکھا تھا۔ غالباً وہ خط اب تمھیں مل گیا ہوگا۔ یہاں سب خیریت ہے۔ میں اچھا ہوں۔ آغا جان سلام کہتے ہیں۔ وہ ماشاءاللہ فہمیدہ ہیں۔ تمھارے کریکٹر کا اُن پر اثر ہے۔

خیر اندیش ۔ میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی[2]

اقتباس از "آیاتِ وجدانی" (جدید)[3]

کیا سمجھتے تھے یگانہؔ محرمِ رازِ فنا   غرق ہوکر آپ اپنا ناخدا ہو جائے گا

مگر آج کل میرزا صاحب پر شعلہؔ کا یہ شعر:

ناخدا ہو نہ میسّر تو سفینا کیا ہے
تم مرے پاس نہیں ہو تو یہ جینا کیا ہے

---

[1] خط کے شروع میں لفظ PERSONAL لکھا ہے اور سُرخ روشنائی سے ذیل کا اضافہ کیا ہے:
"دُکھ درد تُو ہی سمجھے نہ سمجھے
گونگا تو گونگا کس کو پکارے
وہی سب کی سُنتا ہے اور داد کو پہنچتا ہے۔"

[2] اس عنوان کے بعد "از میرزا مراد بیگ" کے الفاظ لکھے تھے جو بعد میں قلم زد کر دیے گئے۔

[3] حاشیہ مطابق اصل:

Dwarka Das 'Shola' of
lahore, the greatest friend
of Meerza Yagana, who has
always strongly felt for him"

دو متضاد کیفیتیں پیدا کر رہا ہے۔ یعنی واقعات کے لحاظ سے پہلا مصرع غلط ثابت ہوکر نود سے سکون کا باعث ٹھہرا ہے اور دُوسرا مصرع صحیح ثابت ہو کر دل کو تڑپاتا رہتا ہے۔ اس بالسٹھ برس کے سِن میں بھی وہی اقتصادی کشمکش نے مرزا یگانہ کو لکھنؤ کا دردِ مفارقت برداشت کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اس نازک وقت میں شعلہ کا آڑے آجانا یادگار رہے گا۔[۱] (میرزا مراد بیگ ۱۹۴۲ء)

(۱۰۷)

غوری منزل، حیدرگوڑہ

حیدرآباد دکن، ۱۹ جولائی ۱۹۴۵ء

پیارے عزیز سلامت رہو۔ محبت نامہ پہنچا۔ حالات معلوم ہوئے۔ تمھارے دوست نے اگر اپنا وعدہ وفا نہیں کیا تو خیر جانے دو۔ مگر ہاں یہ امر قابل افسوس ہے ضرور کہ اُنھوں نے تمھیں ذلیل کرنے کی کوشش کی۔ تعجب ہے۔ خیر تمھارا دل بڑا ہے۔ معاف کردو۔ انساں ہی تو ہے سہو و خطا کا پُتلا۔

ارے یار یہ کیا بات ہے، لکھنؤ سے تمھاری مادرِ محترمہ کا خط آیا ہے کہ حسبِ معمول جو منی آرڈر انھیں پہنچتا تھا، وہ اِس مہینے نہیں پہنچا۔ مجھے کل سے فکر ہوگئی ہے۔ غالباً تمھارے ہاں سے کوئی بُھول ہوگئی ہے۔ مجھے جو رقم تم نے بھیجی تھی، وہ تو میں نے بانٹ دی۔ قرض کا بوجھ ہلکا ہُوا۔ خیر منی آرڈر کے بارے میں جلد اطلاع دو کہ یہ کیا معاملہ ہے۔

"آیات وجدانی" (جدید) کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ وہاں کسی پبلشر[۲] سے مثلاً تاج کمپنی یا اور کوئی میرا مجموعۂ کلام شائع کرنے پر آمادہ ہو تو اُس سے ایک ایڈیشن کا معاملہ کرلیا جائے۔[۳] تم کہو تو اس کا مسودہ تمھارے پاس بھیج دوں۔ بچی کو دُعائیں۔ آغا جان تسلیم کہتے ہیں میرزا یگانہ۔

ہاں کئی مہینے سے اک ضروری بات لکھنا چاہتا ہوں مگر بھول جاتا ہُوں۔ آغا جان نے پارسال ۱۹۴۴ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ مگر اب تک اُن کا سرٹیفکیٹ نہیں آیا۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۵ء کو رجسٹرار صاحب پنجاب یُونی ورسٹی کو درخواست کے ساتھ پانچ روپے کا منی آرڈر بطور ارجنٹ فیس روانہ کیا گیا اور اس کے بعد دو دفعہ یاددہانی بھی کی گئی۔ مگر وہاں سے کوئی جواب ہی نہیں آتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آتنی تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔ اس معاملے میں ذرا

---

[۱] کچھ فرق کے ساتھ یہ عبارت "آیاتِ وجدانی" (جدید) میں ص ۸۰۔۷۵ پر موجود ہے۔

[۲] خط کے شروع ہی میں PERSONAL لکھا ہے۔

[۳] اضافہ برحاشیہ: شیخ مبارک علی سے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی اور پبلشر ہو

کسی سے پُوچھو تو سہی کہ اب تک سرٹیفکیٹ ایجادی]ا نذر کرنے کی وجہ کیا ہے ؟

(۱۸)

غوری منزل، حیدر گوڑہ
حیدر آباد دکن ۔ ۳۰ اگست ۱۹۴۵ء

پیارے عزیز سلامت رہو۔ دو خطوط پہنچے۔ حالات معلوم ہونے میں پہلے ہی سمجھتا تھا کہ کوئی بھول ہوئی ہے جو منی آرڈر حسب معمول نہ پہنچ سکا۔ خیر گھر سے بھی رسید کا خط آگیا۔ اخبار کا تراشہ جو تم نے بھیجا ہے اچھی چیز ہے۔ دلچسپ۔ ہنسنے کے قابل۔ سمجھ تو یہ آتی ہے کہ بیچارہ عبدالمجید کس ذہنی کوفت میں مبتلا ہے۔ کیا کیا اول فول بکتا گیا ہے۔ مگر اسے کیا کیجیے کہ ایک کالم سیاہ کرلینے کے بعد بھی اُس کی کوفت ہرگز مٹی نہ ہوگی۔ وہی یگانہ کی ایک رباعی اور ایک شعر رہ رہ کے یاد آتا ہوگا۔

دکھتی رگ پکڑلی بلبلا اُٹھا
ستلج سے نیل تک حکومت کا خیال

غریب اپنے دل کو یہ کہہ جھوٹی تسلی دیتا ہے کہ [یگانہ] کو کبھی ایک بامعنی شعر لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ نہ کبھی چار انسانوں کو اپنے کمال کا قائل بنا سکے۔ جی ہاں۔ یہ تمہاری زبان بول رہی ہے یا دل بول رہا ہے۔ "چار آدمیوں کو اپنے کمال کا قائل نہ بنا سکے"۔ یہ کیا معنی؟ اور تو کون ہے؟ یہ اتنا کچھ اول فول بک گیا کیا۔ یہ خود ثبوت نہیں ہے لوہا مان لینے کا۔ کمال کی قدر ہر جگہ محبت سے نہیں ہوتی۔ کسی کو محبت ہو جاتی ہے اور ہزاروں کو عداوت۔ دونوں باتیں ثبوت ہیں اپنی اپنی جگہ۔

کہتا ہے کہ "ذیل کے تین اشعار اور ایک نثر کا فقرہ پڑھیے"۔ اس کے بعد میری اک رباعی اور ایک شعر اور اک فقرہ نثر کا نقل کیا ہے۔ یہ شخص رباعی کو رباعی نہیں دو شعر سمجھتا ہے۔ ہت تیرے اناڑی کی دم میں نمدا۔

ارے میاں، اب لکھنؤ اور غالب کے معاملے کو کیا تازہ کرو گے۔ وہ دونوں بت ٹوٹ چکے۔ دونوں مقدمے فیصل ہوکر مثلیں (کذا) داخل دفتر ہو چکیں۔ غنیمت ہی جانو کہ یگانہ نے اقبال کی طرف توجہ نہ کی۔ دو چار رباعیوں ہی پر بلا ٹل گئی اور کہیں اقبال کو بھی مرزا نے نمبر پہ لے لیا ہوتا تو پھر دیکھتے اقبالچیوں کا حال۔ بڑی خیر گزری۔ اور یہ رباعیاں بھی خود اقبالچیوں نے اشتعال دے کر کہلوائی ہیں۔

ا۔ خط کے شروع میں لفظ PERSONAL لکھا ہے۔

خیر یہاں تک تو اک زخم خوردہ اقبالیؔ کا معاملہ تھا۔ اب کچھ اور باتیں کر لوں۔ آپ نے جو لکھا ہے کہ "آیات وجدانی کا معاملہ کسی سے طے ہو جائے تو پھر کتاب کی طباعت کے سلسلے میں پریس والوں کے سر پر کون سوار رہے گا" بھئی یہ سوال تو خارج از بحث ہے۔ اتنی کسے فرصت کہ پریس والوں کے سر پر سوار رہے گا۔ بس اصل معاملہ طے ہو جائے۔ یعنی ایک ایڈیشن ایک ہزار جلد کی جو رقم قرار پائی ہے وہ وصول کر کے مسودہ حوالے کر دیا جائے، اس شرط کے ساتھ کہ کاپیاں اور پروف دفعہ دفعہ کر کے وہ میرے پاس بھیج دیا کریں۔ میں صحت کر کے بھیج دوں تو چھاپنا شروع کر دیں اور جہاں تک جلد ممکن ہو چھاپ دیں۔ میں عنقریب مسودہ آپ [کے] پاس بھیجتا ہوں۔ کسی پبلشر سے بات چیت کر کے معاملہ طے کر لیجیے۔

ہاں نرملا سلمہا کو بہت بہت دعائیں۔ بے شک لڑکی کے لیے بر کا سوال نہایت پیچیدہ اور غور طلب ہوتا ہے۔ خدا اس کا نصیبہ بلند کرے۔ کسی شریف نیک بخت خوش نصیب انسان کا ساتھ ہو کہ زندگی کامیاب گزرے۔ الٰہی آمین۔

میں آج کل تو اچھا ہوں۔ آغا جان تسلیم کہتے ہیں۔ میرزا یگانہ

(۱۹)

غوری منزل، حیدر گوڑہ حیدر آباد دکن، ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۵ء

عزیز من سلامت رہو۔ بہت دنوں سے نہ میں نے کوئی خط لکھا نہ تم نے۔ کوئی خاص بات قابلِ ذکر ہے بھی نہیں۔ اور ہے تو یہ ہے کہ میرے اک کرم فرمائے مخلص مسٹر فراق گورکھپوری پروفیسر الٰہ آباد یونی ورسٹی جو ابھی چھوٹے ترقی پسندوں کی انجمن کے جلسے میں شرکت کی غرض سے یہاں آئے تھے جو اک تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ شعر و سخن کا بھی صحیح ذوق رکھتے ہیں، یہاں ریڈیو پر اور ترقی پسندوں کے مشاعرے میں جو نظم اور رباعیاں سُنا گئے اُس پر یہاں کے بہترین تعلیم یافتہ اصحاب نے نہایت بیزاری کا اظہار کیا۔ یہ سُن کر مجھے سناٹا سا آ گیا کیونکہ میں ہرگز فراق سے ایسی کایا پلٹ کا متوقع نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسندوں میں شریک ہو کر اُن کی مت بھی پلٹ گئی اور وہ بھی اردو شاعری کی تخریب ہی پر تُل گئے۔ افسوس۔

ہاں بھئی جلٹ کی سب ٹکیاں ختم ہو گئیں۔ چند پیکٹ جلد سے جلد بھیج دیجیے۔ نرملا سلمہا کو دعائیں۔ باقی سب خیریت ہے۔

جرمنی کی اک پیٹنٹ دوا ہے NESTROPINE۔ اگر لاہور میں کہیں

لہ اضافہ برحاشیہ

مل سکے تو بھیج دو۔ آج کل کچھ دنوں سے پیشاب میں عوذشں ہو گئی ہے۔ پرانا مرض ہے۔
تیم اکتوبر کے "آج کل" میں "ادب خبیث" کے عنوان سے میرا مضمون نکلا ہے۔ اس میں بلینک ورس کی بحث ختم کر دی گئی ہے۔ اب اس پر کوئی معقول بحث نہیں ہو سکتی۔ ڈھٹائی کی اور بات ہے۔

خیر اندیش۔ میرزا یگانہ لکھنوی

(۲۰)

غوری منزل۔ حیدر گوڑہ
حیدر آباد دکن۔ ۱۲۰ر نومبر ۱۹۲۵ء

پیارے عزیز سلامت رہو
تمہارا خط پا کر رنج ہوا۔ آشوبِ چشم کی تکلیف کے ساتھ تم پر یہ سانحہ اور زیادہ باعثِ رنج و غم ہے۔ اور موت بھی کس قدر غیر معمولی۔ تمہاری دُلھن اور نہ ملا سلمہا اس وقت جتنی بھی غمگین ہوں بجا ہے۔ حق تعالیٰ مرحوم و مغفور کو جوارِ رحمت میں جگہ دے تمہاری دُلھن کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ اس وقت اِس دُکھے ہوئے دل کو تسکین کی ضرورت ہے یقین ہے تمہاری دل جوئی اُن کو سہارا دے گی۔ خداوندِ عالم صبر عطا فرماتے۔
بچی کو دُعا۔ میں بحمد اللہ اچھا ہوں۔ آغا جان تسلیم عرض کرتے ہیں۔
امید ہے کہ اپنے مزاج کی حالت سے جلد اطلاع دو گے۔ دل لگا رہے گا۔ غالباً اب درد میں افاقہ ہو گیا ہو گا۔

میرزا یگانہ

(۲۱)

غوری منزل، حیدر گوڑہ
حیدر آباد دکن۔ ۲۳ر نومبر ۱۹۴۵ء

پیارے عزیز سلامت رہو۔
تمہارے پچھلے خط سے تمہارے آشوبِ چشم اور تمہارے خُسر صاحب کے انتقال کی خبر سُن کر میں نے خط لکھا تھا۔ معلوم نہیں اب تمہارا مزاج کیسا ہے۔ امید ہے اب آنکھیں اچھی ہو گئی ہوں گی۔ اپنی خیر و عافیت سے مطلع کرو۔ دل لگا رہتا ہے۔

لہ اضافہ بر حاشیہ

میں بقر عید کے ایک دن پہلے بیمار پڑا۔ کئی دن تک جاری بخار سے پریشان رہا اور بہت ناتواں ہوگیا۔ اب اچھا ہوں۔ مگر ناتوانی ابھی تک باقی ہے۔ باقی سب خیریت ہے۔ بچی کو بہت بہت دعائیں۔ آغا جان تسلیم کہتے ہیں۔

خیر اندیش۔ میرزا یگانہ

(۲۲)

غوری منزل۔ حیدر گوڑہ
حیدرآباد دکن۔ ۱۴ر دسمبر ۱۹۴۵ء

پیارے عزیز سلامت رہو

سیفٹی ریزر کی پتیوں کا پارسل پہنچ گیا۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں کہ اب تمھاری آنکھوں کا کیا حال ہے۔ ایک خط جو تمھارے کارخانے کے کسی صاحب کا لکھا ہوا تھا، ملا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ آشوب میں کمی نہیں ہوئی۔ دل لگا ہوا ہے۔ اپنی خیریت سے جلد اطلاع دو۔ میں بحمداللہ اچھا ہوں۔ شکر ہے۔

آغا جان تسلیم کہتے ہیں۔ بچی کو دعائیں۔ میرزا یگانہ

(۲۳)

غوری منزل۔ حیدر گوڑہ
حیدرآباد دکن۔ ۲۰ر فروری ۱۹۴۶ء

پیارے عزیز سلامت رہو۔

تمھارا محبت نامہ مورخہ ۹ر فروری پہنچا جس سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تمھارے بھائی اسمبلی کے انتخاب میں کامیاب ہو گئے۔ خدا مبارک کرے۔

تم نے دو خطوں میں لکھا کہ منی آرڈر لکھنؤ روانہ کر دیا گیا ہے مگر مجھے اب تک لکھنؤ سے کوئی ایسی اطلاع نہیں آئی۔ معلوم نہیں رسید تمھارے پاس پہنچی یا نہیں۔ خدا کرے تم اپنے کاروبار حسب سابق مستعدی سے کرتے رہو۔ معلوم نہیں مجھے حیدرآباد سے رخصت ہونے اور لکھنؤ آباد کرنے کا موقع کب ملے گا۔ غیب سے کوئی سامان ہو تو ہو۔ جب انسان سے کچھ بنائے نہیں بنتی تو عالم بالا کی طرف دیکھتا ہے۔ بچی کو بہت بہت دعائیں۔ میرزا یگانہ ۲۰/۲/۴۶

(۲۴)

غوری منزل - حیدر گوڑہ
حیدر آباد دکن - یکم اپریل ۱۹۴۶ء

پیارے عزیز سلامت رہو - میں بحمداللہ اچھا ہوں - مگر :

جزائے خیر دے اللہ اس دیرینہ دشمن کو
بلائے زندگی لپٹی ہے اب تک نیم بسمل سے

تمھارے اشعار جواب تک پڑے رہ گئے اُس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ اب یہ کام کیا کسی کام کی طرف طبیعت رجوع نہیں ہوتی - دُوسری بات یہ ہے کہ اب مزاج کا حال تولہ ماشہ ہے - ہر گھڑی ذرا ذرا سی تکلیف بہت معلوم ہوتی ہے - ذہن کے سامنے فرائض فرائض فرائض اور ان کے متعلق اپنی کوتاہی یا مجبوری کے سوا اور کچھ نہیں - زیادہ کیا لکھوں - نرملا سلمہا کو دُعائیں -

کبھی کبھی[1] اپنی والدہ کو خط ضرور لکھ دیا کرو - یہ بھی گویا ایک قسم کی دوا ہے -

میرزا یگانہ

(۲۵)

غوری منزل - حیدر گوڑہ
حیدر آباد دکن - ۱۳ر جون ۱۹۴۶ء

پیارے عزیز خدا تمھیں خوش رکھے -

یہ کیا اتنی جلدی بال سفید کر لیے - میرے بال تو ابھی تک ساتھ دے رہے ہیں مگر حیدر آباد کے پانی نے دانتوں کو بہت نقصان پہنچایا - مُنھ بہت بدنما ہو گیا - خیر یہ تو ہونے والی بات تھی - مگر ادھر چھ مہینے سے میرے دہنے پاؤں کی ایڑی میں درد شروع ہوا اور بڑھتا چلا گیا، چنانچہ ایک مہینے سے تکلیف بہت بڑھ گئی ہے، پاؤں کی طاقت کم ہوتی جاتی ہے - یہ سب سن کا اقتضا ہے، کوئی ان ہونی بات نہیں ہے - میں جلد سے جلد لکھنؤ پہنچنا چاہتا ہوں اور بخاری (ذوالفقار) نے ابھی ایک مہینہ ہُوا کوئی آٹھ سو روپے دلوا کر (جس میں سے ایک معقول حصہ بمبئی ہی میں خرچ ہو گیا، حالات ہی ایسے پیدا ہوتے گئے) لکھنؤ پہنچنے کا انتظام کر دیا ہے مگر میں ابھی تک حیدر آباد میں اٹکا ہُوا ہوں، حالانکہ ایک ایک دن مجھ پر

---

[1] یہ جملہ حاشیے پر بعد میں اضافہ کیا گیا ہے -

کٹھن ہے۔ بخاری نے آغا جان کو اناؤنسر کی جگہ دے دی ہے۔ میرا بہت کچھ لحاظ کیا۔ اگر آغاجان کی یہ نوکری آئندہ چل کر مستقل ثابت ہوئی تو غالباً وہ پچاس روپے مہینہ گھر بھیج سکیں گے، اُس وقت قریباً نصف بوجھ تمہارے کاندھوں سے اُتر جائے گا۔ لکھنؤ پہنچنے کے بعد اِس معاملے میں کوئی رائے قائم کرسکوں گا۔ بچی کو بہت بہت دُعائیں۔ یگانہ

(۲۶)

سرکاری مسافرخانہ، نام پلی
حیدرآباد دکن، یکم اگست ۱۹۴۶ء

پیارے عزیز سلامت رہو۔

اُمید ہے تم لوگ مع الخیر ہوگے۔ ڈاک خانے کی ہڑتال نے بڑی طوالت پکڑی۔ سمجھ میں نہیں آتا تم لکھنؤ کا انتظام کیا کروگے کیوں کر کرو گے۔ میں "آیات وجدانی" کی طباعت کی دُھن میں ہوں۔ طباعت کا کام قریب ختم آپہنچا۔ اب جلد بندی کا انتظام کرنا ہے۔ دیکھیں لکھنؤ کب تک جانا ہوتا ہے۔ دم بہت گھبراگیا ہے۔ نرملا ستیما کو بہت بہت دعائیں۔

یہاں میرے حالات نے ایک نئی کروٹ لی۔ مسافرخانے میں ٹھہرا ہُوا ہوں۔ یہاں ایک مہینے تک کا انتظام ہوگیا ہے۔

خیر اندیش۔ میرزا یگانہ چنگیزی

(۲۷)

میرزا یگانہ چنگیزی
علی اختر ہاؤس۔ اسٹیشن روڈ
حیدرآباد دکن۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۴۶ء

پیارے عزیز سلامت رہو

۷ ستمبر کو مجھے بڑے زور شور سے بخار آیا لرزہ کے ساتھ۔ کمر میں اس قیامت کا درد رہا کہ عجب نہ تھا منہ سے چیخ نکل جاتی۔ چوبیس گھنٹہ بعد بخار تو اُتر گیا مگر کسر چھوڑ گیا یعنی آج انیس[۱] دن ہوچکے ہیں خفیف حرارت رہتی ہے اور بارہ بجے رات سے جھرجھری ہونے لگتی ہے۔ دوائیں کر رہا ہوں کوئی فائدہ نہیں۔

بھئی اب تمہیں مجھے لکھنؤ پہنچادو، اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں سے تین سو ۳۰۰ روپے

---

[۱] پتا اور تاریخ انگریزی میں ہیں۔

فراہم کرلو۔ میں نے لکھنؤ روانہ ہونے کا سامان کرنے کے لیے تین سو روپے فراہم کر لیے تھے مگر انسان کا ہر منصوبہ پُورا نہیں ہوتا۔ کچھ ہوتا ہے اور بہت کچھ نہیں ہوتا۔ دو ڈھائی برس کی کوششوں کا یہ نتیجہ تو نکلا کہ "آیاتِ وجدانی" کا جدید ایڈیشن چھپ کر شائع ہو گیا۔ زندگی کا ایک بڑا کام انجام پاگیا۔ مگر بکھیڑا یہ پڑ گیا کہ وہ تین سو روپے جو میں نے لکھنؤ جانے کے لیے رکھے تھے وہ غیر متوقع اسباب کی بنا پر کتاب کی طباعت اور جلد بندی میں خرچ ہو گئے۔ اب کتاب تیار ہوئی تو سہی مگر اس کے گاہک کتنے؟ وہی اِکّا دُکّا دو دو چار چار کر کے کچھ جلدیں نکلیں اور جو کچھ دام ملتا گیا وہ صرف ہوتا گیا۔ اک دم سے سو پچاس جلدیں نکل نہیں سکتیں۔ اب اس کتاب کے ذریعے سے اتنی رقم مہیا نہیں ہو سکتی کہ میں لکھنؤ پہنچ جاؤں۔ ضعف بہت ہو گیا ہے اور حرارت کسی طرح دفع نہیں ہوتی۔ اب مجھے لکھنؤ جانا چاہیے وہاں پہنچ کر تین مہینے آرام لینے کے بعد میرا قیاس یہ ہے کہ تم پر جو ماہانہ اخراجات کا بوجھ ۱۹۴۳ء سے پڑ رہا ہے وہ شاید بالکل ہلکا تو نہ ہو گا البتہ پچاس سے گھٹ کر تیس روپے ہو جائیں گے۔ یہ میرا ذہنی تخمینہ ہے۔ الغرض ذرا ہمت کر کے مجھے لکھنؤ پہنچا دو۔ بچی کو بہت بہت دعائیں۔

میرزا یگانہ

(۴۸)

میرزا یگانہ چنگیزی
علی اختر ہاؤس۔ اسٹیشن روڈ۔ حیدر آباد دکن
یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء

پیارے عزیز سلامت رہو
معلوم نہیں تم کیسے ہو اور تمھارے کاروبار کا کیا رنگ ہے۔

۷ ستمبر کو میں ایک نہایت ضروری خط تمھیں بھیج چکا ہوں۔ یقین ہے پہنچ گیا ہوگا۔ اپنی ناسازیِ مزاج اور بڑھتے ہوئے ضُعف کو پیشِ نظر رکھ کر پھر لکھتا ہوں کہ مجھے اب ہرگز یہاں ٹھہرنا نہیں چاہیے۔ اب تمھیں مجھے لکھنؤ پہنچا دو۔ اس کے لیے کم از کم مجھے تین سو روپے کی ضرورت ہے اور یہ رقم تمھیں فراہم کرنا ہے۔ جیسا میں پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں کہ لکھنؤ جانے کے لیے میں نے تین سو روپے مہیا کر لیے تھے۔ مگر آیاتِ وجدانی کی طباعت و جلد بندی کی مد میں اُٹھ گئے۔ خیر کتاب چھپ کر شائع تو ہو گئی۔ زندگی کا آخری کام انجام پا گیا۔ مگر ابھی تک صرف تین سو جلدیں بندھ سکیں۔ باقی جلد بند کے ہاں پڑی ہیں اور ادھر میری مسلسل علالت سے اتنا ضعف بڑھتا جاتا ہے کہ یہاں ایک دن بھی ٹھہرنا خلافِ عقل ہے۔

اس لیے سب سے ضروری کام یہ ہے کہ میں لکھنؤ چلا جاؤں۔ ۲۵ اکتوبر کو بچے یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے اور یہ کام تمھیں پر موقوف ہے۔ وہاں پہنچ کر مجھے اُمید ہے کہ جلد صحت ہو جائے گی۔ اس کے بعد کتاب کے معاملے پر غور کروں گا۔ آیندہ دیکھا جائے گا۔ میرزا یگانہ

(۲۹)

سلطان بہادر روڈ۔
لکھنؤ۔ ۹ نومبر ۱۹۴۶ء

پیارے دوست سلامت رہو

تمھارا خط مورخہ ۲۹ اکتوبر مجھے حیدر آباد میں ملا۔ خیر خدا خدا کر کے میں لکھنؤ پہنچ گیا۔ آغا جان بھی میری علالت کی طوالت سے گھبرا کر یہاں چند ہفتوں کے لیے آ گئے ہیں۔ تمھیں بہت بہت سلام کہتے ہیں۔ تمھاری والدہ دعا کہتی ہیں اور بہنیں تسلیم کہتی ہیں۔ میں اب کسی قدر بہتر ہوں مگر قدرتی طور پر ضعف اور اپنے حالات کی وجہ سے کشمکش کا مقابلہ کیے جاتا ہوں۔ خدا تمھاری پریشانیوں کو جلد رفع کرے۔ بچّی کو بہت بہت دعائیں۔

میرزا یگانہ چنگیزی

(۳۰)

سلطان بہادر روڈ۔ لکھنؤ
۳ دسمبر ۱۹۴۶ء

عزیزی و شفیقی سلامِ شوق۔

میں لکھنؤ پہنچ تو گیا مگر حیدر آباد دکن میں چار سال کی مسلسل کوششوں کے باوجود کچھ بن نہ پڑا۔ مددِ معاش کی کوئی صورت نہ نکلی۔ خالی ہاتھ آیا۔ اک شاعر اور مجھ ایسے شاعر کے حصے میں روایاتی ناکامی کے سوا اور کیا آ سکتا۔

آغا جان سلمہٗ دو سال سے سخت جفاکشی کے بعد بھی اب تک کامیاب نہ ہو سکے۔ گزشتہ اپریل میں ذوالفقار علی شاہ بخاری نے (یادش بخیر) بمبئی ریڈیو میں اُنھیں اناؤنسر کی جگہ دے دی تھی جس سے اُمید بندھی تھی کہ آغا جان کچھ ہم لوگوں کی مدد کر سکیں گے اور اس طرح تمھارے کاندھوں سے کچھ بوجھ اُتر جائے گا۔ مگر زمانے کی بدلتی ہوئی رفتار کا کیا ٹھکانا ہے۔ بخاری ریڈیو سے غالباً الگ ہو کر امریکہ چلے گئے اور آغا جان پھر اُسی کشمکش حیات میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں اب وہ بمبئی میں کس حال سے بسر کریں گے۔ میں حیدر آباد میں بڑی مشکل سے "آیات وجدانی" کی کچھ جلدیں فروخت کر کے دو سو روپے مہیا کر کے لکھنؤ پہنچا تھا۔

یہاں پہنچتے پہنچتے اور نومبر کا مہینہ گزار لینے کے بعد وہ رقم اور تمھارے بھیجے ہوئے پچاس روپے سب خرچ ہو گئے۔ خدا کرے تمھارے حالات اصلاح پر آجائیں اور ادھر توجہ کرنے کا تمھیں موقع مل سکے۔ یگانہ

(۳۱)

میرزا یگانہ چنگیزی۔
سلطان بہادر روڈ۔ لکھنؤ
۱۱ دسمبر ۱۹۴۶ء

پیارے عزیز سلامت رہو

منی آرڈر پہنچا۔ یہاں لکھنؤ آکر غلہ تو غلہ مٹی کے تیل اور جلانے کی لکڑی کا وہ توڑا ہے کہ بعض اوقات اندھیرے میں رہنا پڑتا ہے۔ بن پڑے تو یہاں کسی دوکان سے مٹی کے تیل کا ایک پیپا مجھے دلوا دو۔ تاکہ کچھ دیر لکھنے پڑھنے کا کام کر سکوں۔ زیادہ کیا لکھوں۔

میرزا یگانہ

(۳۲)

۲۵۰۔ سلطان بہادر روڈ
منصور نگر۔ لکھنؤ
۵ فروری ۱۹۴۷ء

مائی ڈیر[1]

اُمید ہے خیریت سے ہو گے۔

یہاں کرفیو لگا ہوا ہے۔ اپنے گھر سے نکل نہیں سکتا۔ ... سُنّی گرفتار ہوئے ہیں اور کچھ شیعہ بھی۔

تمھارا۔ یگانہ

(۳۳)

میرزا یگانہ چنگیزی
۲۵۰ سلطان بہادر روڈ۔ منصور نگر۔ لکھنؤ
۱۷ مارچ ۱۹۴۷ء

پیارے عزیز سلامت رہو

---

[1] یہ خط انگریزی میں ہے یہاں ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے۔

ہم لوگ نہایت تشویش میں ہیں، اپنی خیریت سے جلد مطلع کرو۔ ایک خط پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ خدا تم سب کو امن و امان میں رکھے۔ میرزا یگانہ

(۳۴)

میرزا یگانہ چنگیزی
۲۵۰ سلطان بہادر روڈ منصور نگر۔ لکھنؤ

۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء

عزیز شفیق سلامت رہو

تمہارا خط مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۴۷ء موصول ہوا۔ تمہاری خیریت تو منی آرڈر پہنچنے ہی سے معلوم ہوگئی تھی۔ ملک کے حالات تو جیسے کچھ ہوتے جارہے ہیں دیکھتے رہنے کے سوا کیا چارہ ہے۔

اب تمہارے خط سے تمہاری خانگی حالت معلوم ہوئی البتہ یہ بات تشویش کی ہے۔ بٹوارہ ہوجائے گا، سب الگ الگ ہوجائیں گے، مگر ہم لوگ تمہارے ہی حصے میں رہے اور رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ اتحاد و یک جائی میں جو قوت ہے وہ کہاں باقی رہے گی۔ خیر جیسی خدا کی مرضی۔

تمہاری والدہ تمہیں بہت بہت دعائیں کہتی ہیں۔

خیر اندیش۔ میرزا یگانہ

(۳۵)

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی
ایم آرٹن کمپنی۔ باغ عام روڈ۔ حیدرآباد دکن
۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء

پیارے عزیز سلامت رہو

عزیزی درگاداس کے خط سے اتنا تو معلوم ہوگیا کہ تم لوگ جانیں بچا کر صحیح سلامت لاہور سے نکل آئے اور جائداد جو کچھ تھی وہ آزادی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ خیر جان بچی لاکھوں پائے۔

میں اب تک چل رہا ہوں، پھر رہا ہوں، بس اور کیا کہوں۔ آج لکھنؤ سے تمہاری والدہ کا خط آیا ہے۔ کئی بار تمہاری خیریت پوچھ چکی ہیں۔ دعائیں کہتی ہیں۔ اپنی خیریت کا خط اُن کو بھی لکھ بھیجو تو مناسب ہے۔ خیر اندیش۔ میرزا یگانہ

(۳۶)

میرزا یگانہ چنگیزی
بنگلہ نواب شہید یار جنگ بہادر۔ حیدر گوڑہ۔ حیدر آباد دکن
۲۲ر جولائی ۱۹۴۸ء

پیارے دوست۔ تم کس قدر یاد آتے ہو۔ مگر یاد کر کے خاموش رہ جاتا ہوں۔ خط تک نہیں لکھنا۔ لکھوں تو کیا لکھوں۔ شکنجے میں جکڑا ہوا ہوں۔ کچھ بنائے نہیں بنتی۔ اپنی فیملی کے لیے گویا میں مر چکا۔ خیر تم اپنی خیریت سے جلد آگاہ کرو۔ بہت دنوں سے کچھ معلوم نہیں کہاں ہو کیسے ہو۔ تمہارے حالات کیا ہیں۔ بچی کیسی ہے۔ اُس کی شادی کے فرض سے ادا ہوئے یا نہیں۔ خدا اُسے پروان چڑھائے۔ خیر اندیش۔ میرزا یگانہ چنگیزی[1]

(۳۷)

مکان کورٹ صاحب
سلطان بہادر روڈ۔ لکھنؤ
۲۶ر مارچ ۱۹۴۹ء

فرزند عزیز[2]، خدا تمہیں سلامت رکھے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ تمہارا خط پا کر مجھے اور میرزا صاحب کو (جو بیمار ہو کر یہاں آئے ہیں) کتنی مسرت ہوئی، کتنی تسکین پہنچی کہ ہمارا عزیز ہم لوگوں کو کسی حال میں نہیں بھولا۔ سلطنت حیدر آباد کی تباہی سے بہت پہلے میرزا صاحب کا ایک خط مجھے ملا تھا جس سے یہ معلوم کر کے رنج ہوا تھا کہ تم بالکل تباہ ہو کر لاہور سے دہلی آ گئے ہو۔ میں اس وقت کوئی خط تمہیں اس وجہ سے نہ لکھ سکی کہ میرزا صاحب کے خط میں تمہارا صحیح پتا درج نہ تھا اور پھر یہاں میرے حالات روز بروز سخت ہوتے گئے، پریشانیوں میں پھر کچھ نہ سوجھا۔ آغا جان ادھر سے ادھر نوکری کے لیے پریشان پھرتے رہے۔ پھر یہاں تمہارا چھوٹا بھائی حیدر بیگ تنگ دستی کے سبب انٹرمیڈیٹ کی تعلیم ترک کرنے اور تلاشِ روزگار میں ترکِ وطن کرنے پر مجبور ہوا اور کراچی چلا گیا۔ خیر وہاں اُسے اک جگہ مل گئی اور آغا جان بھی کوئی چھ سات ماہ سے کراچی میں آ گئے ہیں، ریڈیو اسٹیشن میں نوکر ہو گئے ہیں۔

---

[1] خط کی دُوسری جانب ایک رباعی لکھی ہے (کیوں مجھ پہ توجہ ہے خدا خیر کرے)۔ یہ رباعی غیر مطبوعہ کلام کے تحت شائع کی جا رہی ہے۔

[2] یہ خط بیگم یگانہ کی طرف سے ہے، لیکن یگانہ کے قلم سے ہے۔

اب یہ دونوں بھائی تو غالباً وہیں کے ہو گئے۔

میرزا صاحب سے تمہارا حال معلوم کر کے دل بہت کڑھا۔ سارا گھر بار لٹ جانے کے بعد جانیں سلامت رہ گئیں۔ خیر یہی بہت ہے۔ شکر ہے مالک کا۔ اپنی دلہن اور بیٹی زہرا کو بہت دعائیں کہو۔ معلوم نہیں لڑکی کی شادی سے فراغت پائی یا نہیں۔ تمہاری بہن اقبال بیگم تسلیم کہتی ہیں۔ خیریت سے ہیں۔ تمہاری چھوٹی بہن عامرہ بیگم تسلیم کہتی ہے۔ میرزا صاحب سخت بیمار ہوئے اور غنیمت ہے اُن کے بعض دوستوں نے یہاں تک پہنچا دیا، ورنہ خدا جانے وہاں کیا حال ہوتا۔ وہ تمہیں خود بھی اک خط لکھ رہے ہیں جو اسی خط کے ساتھ ملفوف ہے۔ تم نے ہر حال میں ہم لوگوں کو یاد رکھا۔ ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ خوش رہو آباد رہو۔

آغا جان کا پتا یہ ہے، میرزا آغا جان۔ اناؤنسر۔ پاکستان ریڈیو۔ کراچی

دعا گو۔ یگانہ بیگم

(۳۸)

میرزا یگانہ چنگیزی
مکان کورٹ صاحب سلطان بہادر روڈ
لکھنؤ۔ ۲۶ مارچ ۱۹۴۹ء

پیارے دوست خدا تمہیں آباد رکھے۔

ابھی ابھی تمہارا خط پا کر تمہاری والدہ کو جتنی مسرت ہوئی اور مجھے اُس کا کہاں تک شکر ادا کروں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ میں سخت بیمار ہو کر حیدرآباد سے یہاں پہنچا ہوں اور ہنوز تندرست نہیں ہوا ہوں۔ تمہارا خط پڑھ کر دل کو کتنی تسکین پہنچی۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۲ر فروری کو حیدرآباد میں مجھے شدید بخار آیا۔ چار دن تک تو یوں ہی اپنے مقام پر پڑا رہا۔ ۲۵ر فروری کو ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اُس نے دیکھ کر کہا کہ فوراً عثمانیہ اسپتال میں داخل ہو جائیں، نمونیا ہو گیا ہے۔ خیر میں اسی وقت اسپتال پہنچا۔ بھرتی ہو گیا۔ علاج شروع ہوا۔ بخار تو وہاں جانے کے دوسرے ہی دن اُتر گیا۔ مگر علاج ہوتا رہا۔ آٹھ دن تک علاج ہونے کے بعد مجھے بس اتنا محسوس ہوا کہ سینہ بلغم سے تو صاف ہو گیا ہے مگر درد موجود ہے اور ضعف بڑھتا جاتا ہے۔ آخر بڑھتی ہوئی ناتوانی اور اسپتال کی خوفناک فضا سے تنگ آ کر دل گھبرانے لگا؛ بال بچے یاد آنے لگے۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ مجھے اب جانے کی اجازت دیجیے۔ خیر وہاں سے رخصت ہو کر میں اپنے مقام پر پہنچا اور ایک ہفتہ تک بے علاج پڑا رہا کہ شاید رفتہ رفتہ طبیعت درست ہو جائے کیونکہ بخار

تو اتر گیا تھا۔ مگر ایسا نہ ہُوا ضعف بڑھتا ہی گیا۔ آخر ۱۲ ؍ مارچ کو لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ ۱۳ ؍ مارچ کو یہاں پہنچ گیا۔ میں نے آرام لینے کے بعد حکیم صاحب سے رجوع کیا۔ اب معلوم ہو گیا کہ نمونیا کے بعد ورم جگر اور فم معدہ میں ورم باقی ہے۔ اس کا علاج شروع ہُوا۔ پانچ دن کے علاج میں حکیم کی دوا سے کوئی فائدہ محسوس نہ ہوا تو یہاں اک ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ آج پانچواں دن ہے۔ ڈاکٹر کے علاج سے یقیناً فائدہ محسوس ہو رہا ہے مگر پیٹ میں ابھی کسر باقی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ چندروز بعد طبیعت بحال ہو جائے گی۔ میں اپنی اور اپنی زندگی [کی] تلخیوں کا کیا ذکر کروں۔ مگر زندگی پیچھا چھوڑتی ہی نہیں (بلائے زندگی لپٹی ہے اب تک نیم بسمل سے)

آغا جان بمبئی ریڈیو سے الگ ہونے کے بعد کوہ مری، پشاور اور کہاں کہاں مارے مارے پھرے۔ اب کراچی ریڈیو اسٹیشن میں انھیں جگہ مل گئی ہے۔

جون ۱۹۴۸ء میں مَیں جب حیدرآباد پہنچا تھا تو اُس وقت تمھارا چھوٹا بھائی حیدر بیگ یہاں انٹرمیڈیٹ میں پڑھ رہا تھا۔ مگر حیدرآباد پہنچ کر میں اتنا مجبور ہو گیا کہ گھر پر خرچ بھیجنا بالکل بند ہو گیا۔ حیدر بیگ بے چارہ ان سختیوں سے مجبور ہو کر کراچی چلا گیا۔ تعلیم ترک ہو گئی۔ غنیمت ہے اُن کو وہاں ٹیلیفون آپریٹر کی جگہ مل گئی ہے اور وہ اپنی ماں کو خرچ بھیج دیتے ہیں۔

میں وہی پندرہ روپے کی پنشن لے کر پھر یہاں آ گیا ہُوں۔ جب حیدرآباد کی سلطنت باقی تھی تو اس وقت ارکانِ دولت نے میری قابلِ رحم حالت کا کوئی لحاظ نہیں کیا، تو اب تو سلطنت ہی مٹ گئی۔ قصہ ختم ہُوا۔

یہ تو میرا حال تھا، اب اپنا حال لکھو۔ خدا تمھیں خوش رکھے، تمھارا روزگار چلنے لگے۔ بیٹی نرملا ستمبھا کو بہت بہت دُعائیں۔ اُس کی شادی سے فراغت ہو چکی یا ابھی نہیں۔

دعاگو۔ میرزا یگانہ

(۳۹)

میرزا یگانہ چنگیزی
۲۵۰۔ سلطان بہادر روڈ۔ کاظمین
لکھنؤ۔ ۱۰ ؍ اپریل سنہ ۱۹۴۹ء[1]

پیارے عزیز سلامت رہو
ڈاکیے نے آواز دی۔ تمھاری بہن اقبال بیگم ستمبھا نے لفافہ دیکھتے ہی

---

[1] نام، پتا اور تاریخ انگریزی میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ جملہ لکھا ہے "میرا موجودہ پتا نوٹ کر لیجیے"۔

کہا کیجیے شفا بجانی کا خط آگیا، پڑھ کر ذرا اطمینان ہوا کہ تمہارے حالات نسبتاً اب بہتر ہو چلے ہیں۔ خیر جو ہونا تھا سو ہوا۔ دھن دولت گئی تو گئی روزی کا سہارا اک دُکان تو رہ گئی۔ جانیں تو سلامت ہیں، آگے اللہ مالک ہے، وہ بڑا مسبّب الاسباب ہے۔ لاہور میں بعض دوستوں نے تمہارے لیے قربانیاں کیں، تمہارے جیسے شریف انسان کو ایسے دوست ملے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، ہاں مگر ایسے شیطانی دور میں یہ امر یقیناً بساغنیمت ہے۔ لالہ رتن چند بھی آپ ہی کی طرح تباہ ہو کر دہلی آ گئے اور آنکھوں سے معذور ہو گئے۔ افسوس ہے۔ میرا بہت بہت سلام کہیے۔

ہاں بھئی تم نے یہ بات میرے دل کی کہی، اک بار پھر ملاقات ہو جائے تو بہت اچھا ہے، جو دم ہے غنیمت ہے کیا جانیے کل کیا ہو۔ تین کم ستر برس کو پہنچ چکا ہوں۔ بہتر تو یہی ہے کہ اسی اپریل میں اس کام سے فارغ ہو جاؤں کیونکہ گرمی اور بڑھتی جائے گی۔ میں اب کسی قدر اچھا ہوں اگرچہ کمزور ہوں۔ تاریخ مقرر کر دو تو مناسب ہے۔ تمہاری والدہ بہت دُعائیں کہتی اور بہن تسلیم کہتی ہیں۔ تم نے جو یہ کہا ہے کہ:

پلٹ کے آنہ سکیں گے کبھی وُہ دن شاید
کہ تم بھی شاد رہو اور شادماں ہم بھی

تو بلا سے نہ آئیں وُہ دن۔ ہمارے قالب پر چاہے جتنی سختیاں گزریں، ہماری روح کو سکون ضرور حاصل ہے۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ زیادہ شوقِ دید۔ خیر اندیش۔ میرزا یگانہ

آپ کو سلطان بہادر روڈ کا پتا نہ مل سکا تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ یہ سڑک بہت کم مشہور ہے اس کے ساتھ محلہ کاظمین کا پتا دینا ضروری ہے۔[۱]

(۴۰)

میرزا یگانہ چنگیزی[۲]

۲۵۰۔ سلطان بہادر روڈ۔ کاظمین

لکھنؤ۔ ۸ر جون ۱۹۴۹ء[۳]

پیارے عزیز سلامت رہو

بھئی اب تو میں پھر واپس چلا، اگرچہ ہاتھ پاؤں کمزور ہو چکے ہیں۔ بات

---

[۱] اضافہ برحاشیہ

[۲] خط کے آخر میں 'مقطع' کا عنوان درج کر کے ایک غزل (حسن کافری پرستش میں ایماں کیوں نہ ہو) کے چار شعر لکھے ہیں۔ [۳] نام، پتا اور تاریخ انگریزی میں ہے۔

یہ ہے کہ تمھاری والدہ پر بہت سختیاں گزر رہی ہیں۔ میری پنشن وہی پندرہ روپے۔ لڑکے نوکر تو ہیں مگر افسوس کی بات ہے کہ بہت کم توجہ کرتے ہیں۔

میرے واپس جانے کا بڑا سبب یہ ہے کہ کرایہ مکان دو سال ۲۴۰/- روپے کو سخت تقاضا ہو رہا ہے۔ ۳۱ر جولائی تک مہلت مانگی ہے۔ جا تو رہا ہوں مگر یہ نہیں معلوم کہ وہاں یہ رقم کیوں کر فراہم کر سکوں گا۔ حالات بالکل بدل گئے۔

غالباً ۵ ار جون تک روانہ ہو جاؤں گا۔ بچّی کو دعائیں۔ یگانہ

(۴۱)

میرزا یگانہ چنگیزی[۱]

۲۵۰۔ سلطان بہادر روڈ۔ کاظمین

لکھنؤ۔ ۲ر اپریل ۱۹۵۵ء

پیارے شعلہ سلامت رہو

تمھارا محبت نامہ مورخہ ۲۵ فروری جب سے اب تک میز پر دکھا رہا اسی انتظار میں کہ اپنے فرض سے ادا ہو جاؤں تو جواب لکھوں۔ خدا کا شکر ہے کہ ۱۴ر مارچ کو تمھاری چھوٹی بہن عامرہ بیگم کی شادی کی تقریب خوشی خوشی سرانجام پا گئی۔ ہاں اب میں تمھارے پاس آسکتا ہوں۔ تم مجھے پہچان تو لوگے مگر افسوس کروگے پوپلا منھ، جھکا ہوا ڈیل دیکھ کر۔ خیر خدا نے مجھے بڑے فرض سے سبکدوش کیا۔ اب کوئی زیادہ فکر کی بات نہیں ہے۔ جو کچھ ہونا ہے ہو جائے کچھ پروا نہیں۔

لاأبالی جیسے خوشی سے مرے

رات دن غم کے مارے مرنا کیا!

تمھاری والدہ کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ اب تمھارا مکان بن گیا۔ اب خدا تمھیں اپنی بچّی کے فرض سے سبکدوش کرے۔ آمین۔ لالہ رتن چند کا آنکھوں سے معذور ہو جانا میرے ذہن ہی میں نہ تھا۔ خیر علاج کے لیے یورپ جا رہے ہیں مناسب ہے۔

سیفؔ شادانی صاحب کو میرا بہت بہت سلام کہیے۔ میرزا فہیم بیگ کا واقعہ سن کر رنج ہوا۔ ہاں اب قتل و غارت گری کے واقعات میں کوئی اہمیت نہیں رہی۔

وڈیا سہتا نرملا سہتا کو بہت بہت دعائیں۔ بقدر ضرورت سفر خرچ

---

[۱] نام، پتا اور تاریخ انگریزی میں ہے۔

بھیج دو تو میں آجاؤں۔ زیادہ شوق دید۔

خیر اندیش۔ میرزا یگانہ چنگیزی

(۴۲)

میرزا یگانہ چنگیزی[1]
۲۵۰۔ سلطان بہادر روڈ۔ کاظمین
لکھنؤ۔ ۷ر اپریل ۱۹۵۰ء

مائی ڈیر شعلہ سلامت رہو

محبت نامہ ملا۔ کل ہفتے کے دن منی آرڈر مل گیا تو میں اِن شاءاللہ تعالیٰ انوار کے دن ۹ر اپریل کو شام کی گاڑی سے روانہ ہو جاؤں گا۔ ابھی مجھے ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ شام کو کوئی گاڑی جاتی ہے یا نہیں۔

زیادہ شوق دید۔ میرزا یگانہ چنگیزی

(۴۳)

میرزا یگانہ چنگیزی[2]
۲۵۰۔ سلطان بہادر روڈ۔ کاظمین
لکھنؤ۔ ۲۰ر اپریل ۱۹۵۰ء

پیارے دوست سلامت رہو

میں خیریت سے پہنچا۔ امید ہے اب چند روز کسی قدر سکون سے گزریں گے۔ جن کے سخت تقاضے تھے اُن سے پیچھا چھوٹا، خدا کا شکر ہے۔ میرے نام کا منی آرڈر آپ کی دُکان پر پہنچا ہوگا۔ اگر وصول ہو گیا ہو تو مجھے بھیج دیجیے۔ تمھاری اماں بہت بہت دُعائیں کہتی ہیں۔ صابن اُنھیں پسند آیا۔ عامرہ بیگم تسلیم کہتی ہیں۔ وِدّیا رانی اور نرملا سلمھا کو دُعائیں۔ تمھاری والدہ نے مجھے دیکھ کر ہنسی ہنسی میں یہ فرمایا کہ شعلہ کے ہاں آٹھ دس دن رہ کر گھی کھانے کو ملا تو چہرے کی رونق پھر گئی۔ میں نے کہا تو گیا وہیں جاکر رہوں۔ مگر ابھی تو کئی مہینے کے لیے وہی گھی کافی ہے جو اُنھوں نے میرے ساتھ کر دیا ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔

خیر اندیش۔ میرزا یگانہ

---

[1] و [2] نام، پتا اور تاریخ انگریزی میں ہے۔

(۴۴)

میرزا یگانہ چنگیزی
۲۵۰ سلطان بہادر روڈ۔ کاظمین
لکھنؤ۔ ۲۹ را پریل ۱۹۵۰ء

پیارے عزیز سلامت رہو

پچھلے خط میں اپنے پہنچنے کی اطلاع دے چکا ہوں۔ منی آرڈر جو میرا تعاقب کرتا ہوا آپ کی دُکان تک پہنچا تھا وہ پھر میرا تعاقب کرتا ہُوا یہاں واپس آیا اور مجھے مل گیا۔ بھائی کیا کہوں، آپ نے تو پانچ سیر گھی کا حکم دیا تھا مگر یہاں آکر دیکھتا ہُوں تو گھی کیسا گھی کی بُو باس بھی نہیں۔ خدا جانے کون سا تیل ہے، یہ توڈالڈا بھی نہیں ہے، کسی گھاس کا روغن ہے۔ معلوم نہیں یہ دُکان دار کا فریب ہے یا کسی اور کا۔ اچار بہت مزے دار ہے۔

اپریل کا مہینہ گزر جانے کے بعد اب کل سے گرمی کا آغاز ہوا ہے۔ آج تو ہوا میں کچھ لُو کی کیفیت پیدا ہے۔ خیراندیش۔ میرزا یگانہ چنگیزی

ودیا اور نرملا سب کو دعائیں۔

(۴۵)

میرزا یگانہ چنگیزی
۲۵۰ سلطان بہادر روڈ۔ کاظمین
لکھنؤ۔ ۱۶ راگست ۱۹۵۰ء

عزیز شفیق زاد لطفکم

سلام شوق۔ ادھر کئی ہفتوں سے آپ لوگوں کا حال کچھ معلوم نہیں۔ کیا بات ہے۔ میں نے ۲۴ رجولائی کے بعد دو خط بھی بھیجے مگر جواب نہ ملا۔ اپنی خیریت سے جلد آگاہ کیجیے۔

بچّی کو بہت بہت دُعائیں۔ میرزا یگانہ

(۴۶)

میرزا یگانہ چنگیزی[۱]
۲۵۰ سلطان بہادر روڈ۔ کاظمین
لکھنؤ۔ ۱۶ را کتوبر ۱۹۵۰ء

---

[۱] خط کی پیشانی پر سرخ پنسل سے انگریزی میں لفظ "ارجنٹ" لکھا ہے۔

میں جانتا ہوں تم غیر مطمئن حالت میں ہو ورنہ اتنے دنوں تک مجھ سے بے خبر نہ رہتے۔ خیر جس حال میں ہو اب فوراً اُٹھ کھڑے ہو۔ اپنی والدہ اور عامرہ بیگم کے لیے پرمٹ بنوا کر پشاور تک ممکن نہ ہو تو کم از کم لاہور تک پہنچا دو، کسی معتبر شخص کے ساتھ۔ وقت اب ایسا ہی آگیا۔ مگر میں تو ہرگز لکھنؤ نہ چھوڑوں گا۔ بواپسی ڈاک اس کا جواب اثبات میں بھیجو۔ جیتے رہو۔ خوش رہو۔ آباد رہو۔

جواب بیرنگ بھیجنا آج کل یہاں خط بہت تلف ہو رہے ہیں۔

خیر اندیش۔ میرزا یگانہ چنگیزی

(۴۷)

سلطان بہادر روڈ۔ منصور نگر
لکھنؤ۔ ۶ ر اگست ۱۹۵۱ء

میرے پیارے عزیز سلامت رہو

عزیزی عرشؔ ملسیانی نے مجھ سے میری تازہ تصویر مانگ بھیجی تھی۔ میں تو فوٹو وو ٹو کھچواتا نہیں۔ اتفاق سے پنشن کے کاغذات کے ساتھ مجھے دو فوٹو حیدر آباد بھیجنے تھے، ایک میرے پاس رکھا تھا، میں نے ابھی لفافے میں رکھ کر (تمہارا یہ رجسٹری شدہ خط ملنے سے پانچ منٹ پہلے) عرشؔ کو بھیج دیا اور یہ بھی لکھ دیا کہ یہ فوٹو دیکھ کر آپ لوگ کھل کھلا پڑیں گے۔ شعلہ کو بھی یہ فوٹو دکھا دینا۔ کہاں تو وہ فوٹو جو شعلہ نے لاہور میں کھچوایا تھا اور کہاں یہ فوٹو!

الغرض تمہاری عمر دراز کہ تھوڑی دیر بعد تمہارا خط آگیا۔ شکووں سے لبریز۔ دیکھ کر ہنسی آئی۔ میں وہ خط جابجا نوٹ لکھ کر اس خط کے ساتھ ہی ملفوف کرتا ہوں۔ میرے خط نہ لکھنے کی وجہ ظاہر ہے کہ تمہاری والدہ کو کراچی بھیجنے کے لیے سال بھر سے میں کئی دماغی الجھنوں میں مبتلا تھا۔ اس کام سے فراغت نصیب ہوئی تو اب مناسب معلوم ہوا کہ تمہیں بھی اطلاع کر دوں۔ پنڈت ہری چند اخترؔ کے مصائب اور اُن کی عالی ظرفی سبق حاصل کرنے کے قابل ہے۔ سلام ہو ایسے بہادروں پر۔

اس سے پہلے تمہارا کوئی خط سادہ یا رجسٹری شدہ مجھے نہیں ملا۔

خیر اندیش۔ میرزا یگانہ چنگیزی

(۴۸)

میرزا یگانہ چنگیزیؔ معرفت مولانا رشید ترابی
۱۴۔ کلیٹن روڈ۔ کراچی (پاکستان)
۱۱؍ جنوری ۱۹۵۲ء

پیارے عزیز سلامت رہو

بہت دنوں بعد تمھاری خیریت مسٹر رام رتن مہتا سے معلوم ہوئی۔ لکھنؤ سے یہاں آنے کے بعد میں نے تمھیں کوئی خط نہیں لکھا۔ کیا کیا حالات پیش آئے کیا لکھوں۔ مختصر یہ ہے کہ:

اک موجِ پریشاں ہوں عجب ہلچل میں

عارضی پرمٹ پر آیا تھا لڑکوں کو دیکھنے کے لیے۔ مگر کیا کیجیے ناگزیر حالات کے باعث واپسی کی تاریخ گزر گئی اور میں یہاں اٹک کر رہ گیا ہوں مگر میں ہرگز ہرگز یہاں نہیں رہوں گا۔ لوگ کہتے ہیں اب جانا نہیں ملے گا۔ خیر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ کل اک D.O. گورنمنٹ آف انڈیا میں ہائی کمشنر کے دفتر سے بھیج دیا گیا ہے جس میں میرے معاملات کی طرف توجہ دلائی اور سفارش کی گئی ہے۔

بھائی اب ذرا اُٹھ کھڑے ہو اور مجھے جلد یہاں سے نکالو D.O. کا جواب جلد سے جلد بھجوانے کی کوشش کرو۔ اب تک زندگی میں کوئی غم (لڑکی کے مرنے کے سوا) نہیں اُٹھایا تھا۔ مگر وطن چھوٹنے کا یہ غم اٹھایا نہ جائے گا۔ دیکھو جلدی کرو۔ کھانسی کا مرض تو بہت دنوں سے ہے مگر اب تنفس اتنا بڑھ گیا ہے کہ دس قدم چل کر ہانپنے لگتا ہوں۔ پانچ منٹ باتیں کروں تو دم پھولنے لگتا ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ نرملا سلما کو بہت بہت دعائیں۔ خیر اندیش۔ میرزا یگانہ چنگیزی

(۴۹)

میرزا یگانہ چنگیزیؔ معرفت مولانا رشید ترابی
۱۴۔ کلیٹن روڈ۔ کراچی (پاکستان)
۱۴۔ جنوری ۱۹۵۲ء

پیارے عزیز سلامت رہو

لے دمڑے نام، پتا اور تاریخ انگریزی میں ہے۔ پتے کے قریب حاشیے پر انگریزی لفظ "ارجنٹ" لکھا ہے۔

۱۱ر جنوری کو اک خط لکھ چکا ہوں۔ یقین ہے مل گیا ہوگا۔ اور تمھیں بھی رنج پہنچا ہوگا میں جس حال میں ہوں۔ اب جس طرح بن پڑے کوئی وسیلہ ڈھونڈھ کر میری رہائی کی تدبیر کرو تاکہ یہاں سے نجات ہو۔ یہاں سے ہائی کمشنر کے دفتر کا جو اک D.O. گورنمنٹ آف انڈیا میں بھیج دیا گیا ہے، اُس کا جواب حسبِ دلخواہ بھجوا دینے کی جلد فکر کرو تاکہ میں وطن پہنچ کر مروں۔ مسٹر رام رتن مہتہ سے جو کچھ ممکن تھا انھوں نے کیا۔ خدا اُنھیں خوش رکھے مگر دفتر والے حسبِ عادت کچھ نہ کچھ ......[۱]

میرزا یگانہ چنگیزی

(۵۰)

میرزا یگانہ چنگیزی[۲] معرفت مولانا رشید ترابی
۱۳ر کلیٹن روڈ۔ کراچی
۱۸ر جنوری ۱۹۵۲ء

پیارے عزیز، سلامت رہو، آباد رہو

کل تمھارا خط پا کر بڑا سہارا ملا۔ تسکین ہوئی۔ یہاں تو ہر طرف سے یہی آواز آرہی ہے کہ اب یہاں سے چھٹکارا نہیں ہوگا، لاحول ولاقوۃ۔ بات یہ ہے کہ مسٹر مہتہ حسن اتفاق سے چند روز کے لیے پرمٹ آفیسر کی جگہ پر آگئے تھے۔ میری مثل [مسل ؟] اُن کی نظر سے گزری تو اُنھوں نے فوراً چٹھی لکھ کر مجھے بلوایا اور میں بیماری کی حالت میں اُن کے پاس دفتر میں پہنچ گیا۔ پہلے تو اُنھوں نے یہی چاہا کہ فوراً پرمٹ دلوا دیں مگر ان کے اسسٹنٹ نے کہا کہ یہ نہیں ہوسکتا۔ ۲۱ر نومبر کو مدت گزر گئی۔ اب گورنمنٹ آف انڈیا اجازت دے تو ہوسکتا ہے۔ اُس پر اُنھوں نے دُوسرے ہی دن یعنی ۱۰ر جنوری کو ایک D.O. گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا جس میں میرا معاملہ سمجھا کر سفارش کی گئی ہے۔ الغرض جتنی مدد وہ کرسکتے تھے، کی۔ اب وہ D.O. گورنمنٹ آف [انڈیا] کے دفتر متعلقہ پرمٹ میں ہوگا۔ وہاں کے اہل کاران دفتر سے مل کر اُس کا جواب حسبِ دلخواہ بھجوانا ہے۔ جب تک اہل دفتر نہ چاہیں کام نہیں بن سکتا۔ جوش سے مشورہ کرو کیا صورت اختیار کی جائے۔ عرش ملسیانی اور جگن ناتھ آزاد سے بھی پوچھو، کوئی تدبیر بتائیں۔ مہتہ صاحب اب اپنی سابق جگہ پر چلے گئے ہیں۔ اب میرا معاملہ

---

[۱] نقطے مطابق اصل۔

[۲] نام، پتا اور تاریخ انگریزی میں ہے۔

گورنمنٹ آف انڈیا کے جانچ میں جا چکا۔ وہیں سے اجازت ملے تو رہائی ہو۔ زیادہ کیا لکھوں دن گن رہا ہوں۔ بہت کمزور ہوگیا ہوں۔ جلا وطنی کا غم بُری بلا ہے۔

خیر اندیش۔ یگانہ

(۵۱)

میرزا یگانہ چنگیزی لے معرفت مولانا رشید ترابی
۱۴ ایکلیٹن روڈ۔ کراچی
۱۲ر فروری ۱۹۵۲ء

پیارے عزیز سلامت رہو

تمھارا خط مورخہ ۲۸ر جنوری پیش نظر ہے۔ میں کئی ہفتے سے کوشش کر رہا ہوں کہ مسٹر مہتہ سے ملوں، انھوں نے وقت بھی مقرر کیا مگر میں خود ناسازی مزاج کی وجہ سے وہاں تک پہنچ نہ سکا۔ ذرا سی ہوا لگ جاتی ہے تو طبیعت حال سے بے حال ہو جاتی ہے۔ ابھی میں نے اُن سے کوئی رقم نہیں لی ہے مگر اب ضرورت ہے۔ چاہتا ہوں آیندہ اتوار کو اُن کے ہاں جاؤں۔

آج میں جوشؔ کو بھی ایک خط لکھ رہا ہوں کہ کئی ہفتے ہو چکے کہ اب تک کچھ حال معلوم نہیں لہٰذا پہلے لکھنؤ اک تار بھیج کر یاددہانی کریں اور اس سے بھی کام نہ چلے تو وہ خود جا کر اس کام کو انجام دیں۔ میری صحت بگڑتی جا رہی ہے۔ تنفس بہت بڑھ گیا ہے۔ دن گزرتے جاتے ہیں۔ خدا جانے کل کیا ہو۔ ابھی تو کوئی ایسا خطرہ نہیں ہے مگر یہ سختیاں کب تک برداشت کر سکوں گا! میرزا یگانہ

(۵۲)

۱۴۔ ایکلیٹن روڈ، کراچی لے
۳ر مارچ ۵۲ء

پیارے عزیز سلامت رہو۔ چار مہینے تک کوشش کرتے کرتے ۲۴ر فروری

لے نام، پتا اور تاریخ انگریزی میں ہے۔ یہ خط جس کاغذ پر لکھا گیا ہے، اُس کی پیشانی پر مولانا رشید ترابی کے اخبار "منتظر" کا نام اور پتا چھپا ہوا ہے۔

لے پتا اور تاریخ انگریزی میں ہے۔ خط کے آخر میں بھی انگریزی میں "بنام لالہ دوار کا داس شعلہ دہلی" کے الفاظ لکھے ہیں۔

کر دیں۔ مسٹر مہتہ سے ملا۔ گھڑی گھڑی جا پڑتا ہوں۔ ان سے مل کر آیا تو دوسرے دن ۲۵ فروری
سے پھر بیمار پڑ گیا۔ بخار آنے لگا۔ ڈاڑھ کے درد کی وہ شدت کہ منہ پھول گیا۔ دیکھو کر ڈ معلوم ہوتا ہے
خیر مسٹر مہتہ سے میں نے ایک سو دس روپے ۲۴ فروری کو لیے اور اب اپنے اور تمہاری والدہ
کے علاج کی طرف متوجہ ہوا ہوں۔ مگر یہ سب دل کو بہلانے کی تدبیریں ہیں۔ یہاں رہ کر کچھ بھی
نہ ہوگا۔ تمہاری والدہ کی ناسازیِ مزاج سے طبیعت کو اور فکر پیدا ہو گئی ہے مگر کیا چارہ ہے۔
میں آج پھر جوش کو خط لکھ رہا ہوں کہ وہ خود لکھنؤ جا کر میرے کاغذات کی تکمیل کرا کے بھجوا دیں تو
مجھے یہاں سے نجات حاصل [ہو] ورنہ معلوم نہیں وہاں دفتری کارروائی کب ختم ہوگی۔ زیادہ
شوقِ دید۔ میرزا یگانہ چنگیزی

(۵۳)

سلطان بہادر روڈ۔ منصور نگر
لکھنؤ۔ ۴ ار اکتوبر ۱۹۵۲ء

عزیز من سلامت رہو
کی ٹکیوں سے کچھ فائدہ تو محسوس ہوا۔ اور کچھ دنوں تک استعمال
کروں تو بہتر ہوگا۔ چند شیشیاں بھیج دو یا SOLOMON کمپنی کو لکھ دو کہ مجھے دے دیں اور
تمہارے حساب میں لکھ لیں۔ زیادہ کیا لکھوں۔ خدا جانے یہ خرچہ کب تک چلے گا۔ ستر برس تو
چل چکا۔

راقم۔ میرزا یگانہ

(۵۴)

سلطان بہادر روڈ۔ منصور نگر۔ لکھنؤ
۱۴ ار اکتوبر ۱۹۵۲ء[1]

پیارے عزیز سلامت رہو
کوئی دس بارہ دن ہوئے اک کارڈ لکھ چکا ہوں جس کا کوئی جواب نہیں
آیا۔ اب پھر یاد دلاتا ہوں کہ ۱۱ کی چند شیشیاں بھیج دو یا یہاں SOLOMON کمپنی کو
لکھ دو کہ وہ مجھے مہیا کر دے اور تمہارے حساب میں لکھ لے۔ میرے مزاج کا تو وہی حال ہے،
ادھر چار، پانچ دن سے بخار بھی آ رہا ہے۔ اپنی خیریت لکھو۔ میرزا یگانہ

---

[1] خط کے آخر میں دو بارہ تاریخ لکھی ہے جو ۱۴ ار ۱۱ر ۵۲ء ہے۔ یہ سہو قلم ہے۔ اس خط میں
دس بارہ روز پہلے کے جس خط کا حوالہ ہے وہ ۴ ار اکتوبر کو لکھا گیا تھا۔

(۵۵)

پیارے عزیز سلامت رہو

تمھاری خیریت مزاج معلوم نہیں۔ دل لگا ہوا ہے۔ جلد اطلاع دو میں
اپنے اسی حال میں روز و شب گزار رہا ہوں۔ آٹھ دن قبل کی احتیاط اور دوا سے اتنا ہو سکا
کہ میں ۵ ۔ اکتوبر کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے مشاعرے میں شریک ہو سکا۔ کوئی تین گھنٹے تک
بیٹھا رہا۔

بالکل خلافِ توقع حاضرینِ مشاعرہ نے جتنی تحسین و آفرین کی میرے کلام کی،
وہ میری موجودہ گئی گزری حالت کو دیکھتے ہوئے تعجب کی بات تھی۔ اہلِ لکھنؤ کو یہ معلوم کر کے
یقیناً جلن پیدا ہوا ہوگا۔ یگانہ

(۵۶)

سلطان بہادر روڈ، منصور نگر
لکھنؤ، ۲۹ ۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء

پیارے عزیز سلامت رہو

کا پارسل مل گیا اور خط بھی۔ امید ہے اب تمھارا مزاج بخیر
ہوگا۔ بیمار پڑنا تو اب میرا کام ہے۔ تمھیں بیمار پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔
مشاعرے میں میرا آنا مشتبہ ہے۔ اگر طبیعت بحال رہی تو چلا آؤں گا۔

زیادہ شوقِ دید[۲]۔ میرزا یگانہ

(۵۷)

سلطان بہادر روڈ۔ منصور نگر۔ لکھنؤ
۱۳ ۔ نومبر ۱۹۵۲ء

پیارے عزیز سلامت رہو

ارادہ تو کر رہا ہوں کہ کل رات کو روانہ ہو کر پرسوں ۱۵ ۔ نومبر کی صبح کو
دہلی پہنچوں۔ مگر بھائی جان اس دفعہ میرے ٹھہرنے کا انتظام وہیں چاندنی چوک کسی ہوٹل میں
کرو۔ اس کی ذمہ داری بلانے والوں پر ہوگی۔ اخراجات انھیں کے ذمہ رہیں گے۔ زیادہ

---

[۱] اس خط پر تاریخ نہیں ہے۔ قیاس ہے کہ اکتوبر ۵۲ء کے آخری دنوں میں یہ خط لکھا گیا ہوگا۔
[۲] اس کے بعد ایک رباعی تھی جو بوجوہ حذف کی گئی۔

شوقِ دید۔ نرملا کو دعائیں۔ [illegible] کو دعائیں۔ میرزا یگانہ چنگیزی[1]

(۵۸)

۲۵۰۔ سلطان بہادر روڈ
کاظمین، لکھنؤ[2]

پیارے دوست سلامت رہو

اُمید ہے تم سب خیریت سے ہوگے۔ میں بحمد اللہ اچھا تو ہوں مگر چار پانچ دن بعد سوکھنے کی نوبت آجائے گی۔ کچھ بھیج دو تو سُوکھے دھانوں پانی پڑ جائے۔ واہ کیا شریفانہ زندگی گزار رہا ہوں۔ توبہ ہی توبہ۔ یگانہ

(۵۹)

میرزا یگانہ چنگیزی
سلطان بہادر روڈ۔ منصور نگر
لکھنؤ۔ ۶ر دسمبر ۱۹۵۲ء

میرے پیارے دوست خدا تمھیں خوش رکھے

تمھارا خط مورخہ ۲۶ر نومبر میرے سامنے رکھا ہے ایک ہفتہ سے۔ میں ۱۷ر نومبر کو دہلی سے بخار میں مبتلا ہو کر یہاں آیا۔ جب سے اب تک بیمار ہی پڑا ہوں۔ دو ایک دن بخار کم ہوتا ہے پھر آجاتا ہے۔ طاقت بہت کم ہوتی جاتی ہے۔ سال بھر سے یہی حال ہے۔

تمھارے عزیز دوست پر حادثۂ غم کی خبر سن کر افسوس ہوا۔ ہاں اسی تلخی و شیرینی کے پھیر بدل ہی میں تو زندگی اک کیفیت مسلسل میں ڈوبی رہتی ہے اور آگے بڑھتی ہے ورنہ:

سکھ ہی سکھ ہو تو پھر اجیرن ہو جائے[3]

فلک کو میری طرف سے دعائیں۔ محترمی حضرت جوشؔ ملسیانی کی خدمت میں میرا اسلام لکھ بھیجو۔ میرزا یگانہ

---

[1] خط کے آخر میں ایک رباعی ہے (درشن کچھ بھی نہیں مگر نام بڑا) جو غیر مطبوعہ کلام کے تحت شائع کی جا رہی ہے۔

[2] پتا انگریزی میں لکھا ہے۔ اس خط پر تاریخ نہیں ہے۔ قیاس ہے کہ یہ دسمبر ۵۲ء کی کسی تاریخ کو لکھا گیا تھا۔

[3] اس مصرع کے بعد مکمل رباعی بھی لکھی گئی ہے۔ یہ "ترانہ" (ص ۱۵۶) میں شامل ہے۔

(٦٠)

سلطان بہادر روڈ۔ منصور نگر
لکھنؤ۔ ۶ ر دسمبر ۱۹۵۲ء

پیارے عزیز سلامت رہو

جب سے جو پڑا ہوں تو اب تک اُٹھا نہیں۔ دو ایک دن بخار کم ہوا۔ تیسرے دن پھر آگیا۔ پھر وہی پھر وہی۔ طاقت اب اتنی نہیں کہ جلدی سے پلٹ آئے۔ غذا دو لقمے زیادہ کروں تو اُلٹا نقصان پہنچے۔ خیر یہی ہے اور رہے گا۔ کھانسی کی وہ شدت کہ الامان۔ کیا کہوں راتیں کیسوں کر کٹتی ہیں۔

کہنا یہ ہے کہ بچارے آغا جان کی طرف جلد توجہ کرو، ایسا نہ ہو کہ تمہارا یہ بھائی بے روزگاری کے ہاتھوں خدا نخواستہ ذہنی اعتدال کھو بیٹھے۔ وہ آج کل کراچی میں ہیں تلاش معاش میں۔ تم اُن کے متعلق بجائے خود کوئی منصوبہ بنا کر ہمدردانہ لب ولہجہ میں ان سے باتیں طے کر لو۔ اور جیسا مناسب سمجھو اُنھیں ہدایت کرو۔ راہ پر لے آؤ۔ ایسے میں سویرا ہے۔

میرزا یگانہ

اُن کا پتا:
میرزا آغا جان چنگیزی، معرفت اڈیٹر صاحب "منصف"
ابراہیم جی حکیم جی بلڈنگ۔ پرارتھنا سماج روڈ۔ بندر روڈ۔ کراچی

(٦١)

میرزا یگانہ چنگیزی[1]
معرفت نیشنل ٹریڈنگ کمپنی۔ سانگلی بنک بلڈنگ
۲۹۶۔ بازار گیٹ، فورٹ۔ بمبئی
۱۹ ر دسمبر ۱۹۵۲ء

پیارے عزیز سلامت رہو۔ تمہارا خط جو آغا جان کے بارے میں ہے لکھنؤ ہوتا ہوا مجھے یہاں ملا۔ میں بیمار پڑا ہوں، بخار کسی دن نہیں اُترا۔ یہاں اک ڈاکٹر کا علاج ہو رہا ہے۔

میرے اک مخلص عزیز جو سن میں تو تمہارے ہی قریب ہیں اور خلوص و

---

[1] نام، پتا اور تاریخ انگریزی میں ہے۔

محبت ہیں ہی، اگرتم ان سے بہت بیننیر ہوتا انھوں نے مجھے یہاں بلاکر جا یا کر شاید کچھ تبدیل آب و ہوا سے اور کچھ علاج سے فائدہ ہو جائے۔ وہ مجھ پر بہت مہربان ہیں، خاص توجہ رکھتے ہیں مگر کوئی کیا کرے۔ کھانسی کی شدت کے وقت ہر شب کو موت کے قریب ہو جاتا ہوں۔

تمھاری والدہ اپنی سادگی اپنی بے وقوفی کے ہاتھوں اور زیادہ تر احکام کی سختیوں کے باعث وہاں پڑی ہوئی ہیں، اور یہاں میں جس حال میں ہوں تم جانتے ہو۔ قانونی مواخذہ کے ڈر سے اُنھوں نے وہاں جاکر اپنی قومیت بدل دی ہے یعنی پاکستانی ہوگئی ہیں۔ افسوس! میں نے آغاجان کو تو لکھ دیا ہے کہ مستقل واپسی کے متعلق کاغذات مرتب کر کے مسٹر مہتہ کے پاس پیش کردیں، اور تم بھی مسٹر مہتہ کو خاص توجہ دلاؤ کہ اس کام میں جہاں تک ممکن ہو ہائی کمشنر صاحب کو خاص توجہ دلائیں کہ یہ معاملہ بس ایک غریب شاعر کا ہے کسی لکھ پتی کا نہیں ہے۔ اور دہلی میں بعض افسروں کی مدد لو کہ یوپی گورنمنٹ سے بصیغہ ضروری بذریعہ تار اجازت بھجوادیں کہ یگانہ بیگم صاحبہ کو لکھنؤ میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرنے میں اسٹیٹ گورنمنٹ کو کوئی عذر نہیں ہے کیونکہ جب شوہر کو مستقل سکونت کی اجازت مل گئی تو بیوی کے لیے کوئی امر مانع تو نہیں ہے۔

جوشؔ سے مشورہ کرو۔ کام لو۔ معلوم ہوا ہے کہ وہاں تمھاری والدہ کا دماغی سکون بھی بُری طرح پامال ہو رہا ہے۔ میرزا یگانہ چنگیزی

(۶۲)

سلطان بہادر روڈ منصور نگر
لکھنؤ۔ ۲۱ فروری ۱۹۵۳ء

پیارے عزیز سلامت رہو۔

معلوم ہوتا ہے تم آج کل زیادہ فکر مند ہو ورنہ اتنے دنوں تک مجھ سے غافل ہرگز نہ رہتے۔ دیکھو میں اب تک جی رہا ہوں۔ ۲۲ دسمبر کو بمبئی میں خاتمہ بالکل قریب تھا مگر پھر آئی ہوئی ٹل گئی۔ لکھنؤ تک زندہ پہنچ گیا۔ یہاں وہی حال ہے، ہر آٹھ دس دن کے بعد حال سے بدحال ہو جاتا ہوں۔ تلوؤں اور پنڈلیوں کا دم نکلا جا رہا ہے اور آس پاس کوئی نہیں۔ گھر میں جو لوگ ہیں وہ اوپر کا کام تو کر دیتے ہیں مگر بُرے وقت اپنے پاس کون آئے؟ بیگم وہاں پھڑپھڑا رہی ہیں کچھ بنائے نہیں بنتی۔ ہر قدم پر دفتری اڑنگے۔ پرمٹ کے بعد پاسپورٹ کا طریقہ نکلا ہے۔ پاسپورٹ کے لیے اُنھوں نے درخواست دی۔ کئی مہینے کے بعد جواب [illegible] ہے کہ جن بیویوں کے شوہر ہندوستان میں رہ ہیں انھیں پاکستانی

نہیں سمجھا جائے گا نہ پاسپورٹ دیا جانے گا۔ پیچھے صاحب۔ یہاں اس گورنمنٹ سے رجوع کیجیے۔ مگر یہ کون کرے۔ گھر سے باہر تو نکلنے کی طاقت نہیں۔ اچھا یہ سب فضول باتیں لکھ گیا۔ ایک شیشی MENDACO کی جلد بھیج دو۔ زیادہ کیا لکھوں۔

کتنی[1] سیدھی اور سادہ سی بات ہے کہ جب شوہر کو یہاں کی گورنمنٹ نے مستقل طور پر واپس لے لیا تو پھر اُس کی بیوی کے بارے میں مزید گفتگو کا کیا موقع ہے۔ مگر ہائی کمشنر صاحب سے یہ کون کہے؟ یگانہ

(۶۴)

سلطان[2] بہادر روڈ۔ منصور نگر
لکھنؤ۔ ۳۰ر اپریل ۱۹۵۳ء

پیارے عزیز، خدا تمہیں خوش رکھے آباد رکھے۔

ہزار ہزار شکر ہے تمہاری اور مسٹر رام رتن مہتہ کی توجہ و کوشش سے بیگم مجھ تک پہنچ گئیں۔ ۴ر اپریل کو یہ بڑا کام ہو گیا۔ تمہیں اور تمہاری بیوی بچوں کو بہت بہت دُعائیں فرماتی ہیں۔

تمہارا محبت نامہ مورخہ ۱۲ر اپریل میرے سامنے ہے۔ آج جواب لکھنے کے قابل ہوا ہوں۔ میرے پیارے تم نے صحیح کہا ان بیہودگیوں اور بدمعاشیوں کا میرے ذہن پر کوئی بُرا اثر نہیں ہوا۔ بیگم نے بھی دیکھ لیا کہ اتنے بڑے واقعے پر بھی مجھ میں کوئی بدحواسی نہیں پائی گئی، کیوں کہ میں نے جو کچھ کیا اس پر مطمئن ہوں۔ عزت جسے کہتے ہیں وہ اپنی ذات میں موجود ہوتی ہے کوئی خارجی چیز نہیں ہے۔ ان غریب جاہلوں کو یہ نہیں معلوم کہ اُنھوں نے میرا مُنہ کالا کیا کہ اپنا اور اپنی قوم کا؟

خیر بھائی جان اب تو یہ مسئلہ طے ہو گیا کہ میری لاش کا وارث کوئی نہ ہوگا (بیوی کے سوا) اور جس کا کوئی وارث نہ ہو اُس کی وارث گورنمنٹ۔ مسلمان تو ہرگز میری میت کے پاس کھڑا نہ ہوگا نہ کسی قبرستان میں دفن ہونے دے گا۔ آگے تم جانو تمھیں اس بارے میں کیا کرنا چاہیے۔

میں اب سارے محلے، سارے لکھنؤ سے CUT-OFF ہوں۔ خدا

---

[1] یہ عبارت بعد میں حاشیے پر اضافہ کی گئی ہے۔

[2] پتے کے قریب خالی جگہ میں انگریزی میں لفظ "پرسل" لکھا ہے۔

خوش رکھے، میرے بھائی محمد نقی سلمہٗ نے بڑے بڑے کام کیے اور وقتی روزانہ اپنے ہاں سے کھانا دانا بھجوایا کرتے ہیں اور میری خدمت کرتے ہیں۔

میرے مکان پر سپاہی کا پہرہ ہے۔ جان کا خطرہ ہے مگر اب ویسا نہیں جیسا پہلے دو تین دن تک تھا۔ مقدمے کی پیشی نہ معلوم کب ہوگی۔ یہاں جان میں جان نہیں ضعف کے مارے بُرا حال ہے۔ عدالت کیوں کر جاؤں گا کیا کروں گا۔ مقدمہ پولیس چلا رہی ہے حراست لے جا کا۔ پانچ ملزمین گرفتار ضمانت پر رہا ہیں۔ I am too short of money.

میرزا یگانہ چنگیزی

(۶۴)

سلطان بہادر روڈ۔ منصور نگر
لکھنؤ۔ ۱۲ر مئی ۱۹۵۳ء

پیارے عزیز، خوش رہو، آباد رہو۔

دیکھو تو سہی میں اب تک جی رہا ہوں۔ رنجیدہ تو میں ہوا نہیں البتہ ناتوانی اور سخت جانی کے ہاتھوں تکلیفیں اُٹھا رہا ہوں۔ کہتے ہیں مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ اور سو مصیبتوں کی ایک مصیبت ہے وجہ معاش کی تنگی۔ خدا کی پناہ۔

MENDACO نے مجھے کچھ یُوں ہی سہارا سا تو ضرور دیا مگر جو شیشی آپ نے بھیجی تھی وہ بس آٹھ دن کی تھی۔ کم سے کم ۳۲ دن کے لیے کچھ شیشیاں بھیج دو۔ تمھاری والدہ محترمہ اب آگئی ہیں اور ان کے لیے دو بوتل تیل کی بھی بھیج دو۔ بچی اور بچے کو دُعائیں۔ درگا داس سلمہٗ کو دُعائیں۔ میرزا یگانہ

(۶۵)

میرزا یگانہ چنگیزی
سلطان بہادر روڈ۔ منصور نگر
لکھنؤ۔ ۲۲ر مئی ۱۹۵۳ء

پیارے عزیز سلامت رہو

کوئی دس بارہ دن ہوئے میں نے پوسٹ کارڈ لکھا تھا، جواب میں MENDACO کا انتظار کر رہا ہوں۔ ۹۶ گولیوں کی ایک شیشی بھجوا دو۔ سخت ضرورت ہے۔ اپنی خیریت لکھو کیسے ہو کاروبار کا کیا حال ہے۔ تمھاری والدہ دعائیں کہتی ہیں۔

دعا گو۔ میرزا یگانہ

(۶۶)

سلطان بہادر روڈ، منصور نگر[1]
لکھنؤ۔ ۱۵ مئی ۱۹۵۳ء

میرے پیارے

تم مجھ سے اتنے مایوس کیوں ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میں نے پیٹ کی خاطر تکلیف انتہائی ہے۔ لیکن بڑے کاموں کے لیے بڑی قربانیاں درکار ہوتی ہیں۔ ازرہِ کرم بلاتاخیر MENDACO (۹۶ گولیاں) بھیج دو۔ اور اگر ممکن ہو تو کچھ رقم بھی۔ نرملا اور درگاداس کے لیے میری بہترین خواہشات۔

تمہارا۔ میرزا یگانہ

(۶۷)

سلطان بہادر روڈ، منصور نگر
لکھنؤ۔ ۱۴؍ جون ۱۹۵۳ء

پیارے عزیز سلامت رہو

دوا کا پارسل پہنچا اور خط بھی ملا۔ افسوس ہے لالہ رتن چند سے آپ سے ان بن ہوگئی۔ بدلتا [ہے] رنگ آسماں کیسے کیسے۔ یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ تمہاری مالی حالت پریشانی کا باعث ہے۔ خیر زمانے پر نہ سہی دل پہ اختیار رہے۔

معلوم ہوا کہ "ریاست" میں کوئی مضمون میرے متعلق شائع ہوا ہے۔ وہ پرچہ کسی طرح حاصل کرکے مجھے ضرور بھیج دو۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ بھائی میرے مسودات جو کچھ بھی ہیں منتشر پڑے ہیں۔ مگر اب ان کا میرے پاس رہنا بیکار ہے۔ تم کہو تو ایک بکس میں بند کرکے بھیج دوں۔ میرزا یگانہ

(۶۸)

میرے پیارے شعلہ[2]

میرے عظیم دوست، بمبئی کے ہاشم صاحب سے ملو۔ دو ہی تو میرے دوست ہیں، ایک دوارکا داس اور دوسرے ہاشم اسمٰعیل جو ہمیشہ میری دیکھ بھال کرتے رہے ہیں۔ ازرہِ کرم "گنجینہ" [کا مسودہ] ان کے حوالے کردیں تاکہ وہ جس طرح

---

[1] و [2] اصل خط انگریزی میں ہے۔ یہاں ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

چاہیں اس کو کام میں لائیں۔

تمہارا۔ میرزا یگانہ۔ ۲۲؍ جون ۵۳ء

سلطان بہادر روڈ۔ منصور نگر۔ لکھنؤ

(۶۹)

میرا موجودہ پتا:
میرزا یگانہ چنگیزی [1]۔
پیلا مکان۔ شاہ گنج، لکھنؤ
۱۸؍ جولائی ۱۹۵۳ء

پیارے عزیز سلامت رہو

محبت نامہ مورخہ ۹؍ جولائی پیشِ نظر ہے جس سے معلوم ہوا میرا رجسٹری شدہ لفافہ آپ کو مل گیا۔ الحمدللہ۔

آپ نے جو شعر لکھا ہے بالکل میرے حسبِ حال ہے۔ دن بدن حالت دل ختم ہوتی جاتی ہے۔ دو دن تو بخار بھی آیا مگر کھانسی کی وہ شدت ہے دن رات کہ پیٹ میں سانس نہیں سماتی۔ پاؤں میں اتنی طاقت نہیں کہ باہر نکل سکوں چکر آنے لگتا ہے۔ ان حالات میں مَیں ۲؍ جولائی کو وہ مکان جس میں سولہ سال سے تھا جبراً و قہراً چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ اہلِ محلّہ نے اتنا ستایا کہ ٹرنک اور بستر اور بیوی کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا۔ سارا سامان چھوڑ کر گھر میں قفل ڈال کر چلا آیا، اور زیادہ بیمار پڑ گیا۔ ۱۲؍ جولائی کو معلوم ہوا کہ مکان پر یاروں نے قبضہ کر لیا اور سامان بھی لُٹ گیا۔ مجھ میں اتنا بھی دم نہیں کہ تھانے جا کر رپٹ لکھوا سکوں۔ یہاں جب سانس لینا اتنا دشوار ہے تو تھانہ پولیس کیسا؟ کیسا گھر کیسا بار۔

Persecution of Yagana going on.

اب کچھ معلوم نہیں کہاں جاؤں گا کہاں ٹھہروں گا۔ .... [2]

میرزا یگانہ چنگیزی

---

[1] نام اور پتا انگریزی اور اردو دونوں میں لکھا ہے۔ تاریخ صرف انگریزی میں ہے۔

(۷۰)

میرزا یگانہ چنگیزی[1]
پیلا مکان، شاہ گنج۔ لکھنؤ
۱۳ اگست ۱۹۵۳ء

پیارے عزیز خوش رہو آباد رہو
بہت دنوں سے تمہارا حال کچھ معلوم نہیں۔ کیسے ہو حالات کیا ہیں۔ اپنی خیریت کبھی کبھی لکھ بھیجا کرو۔

میں ادھر تین چار دن سے کچھ اچھا ہوں یعنی دو روٹیاں کھا لیتا ہوں اور لیٹا رہتا ہوں۔ اُدھر دو ہفتے تک طبیعت بہت نڈھال ہو گئی تھی۔ ایک روٹی مشکل سے کھا لیتا تھا۔ اب ذرا اچھا ہوں، مگر تلووں اور پنڈلیوں کی طاقت گھٹتی جا رہی ہے:

اسیر جسم ہیں میعاد قید لامعلوم
یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم
(مولانا شاہ عظیم آبادی)

دعا گو۔ میرزا یگانہ[2]

(۷۱)

میرزا یگانہ چنگیزی
پیلا مکان۔ شاہ گنج، لکھنؤ
۱۲ اکتوبر ۱۹۵۳ء

پیارے عزیز سلامت رہو، خوش رہو
پچھلے خط میں تم نے اپنی ناسازی مزاج کی اطلاع دی تھی۔ دل لگا ہوا ہے۔ اب کیسا مزاج ہے۔ امید ہے اب کوئی شکایت نہ ہو گی۔ میں آج کل کسی قدر بہتر ہوں۔ یعنی ضعف میں کچھ کمی ہے۔ گھر میں ضرورت سے چل پھر لیتا ہوں۔

راقم۔ میرزا یگانہ چنگیزی

---

[1] نام پتا اور تاریخ انگریزی میں۔

(۷۲)

میرزا یاس یگانہ چنگیزی۔
پیلا مکان۔ شاہ گنج، لکھنؤ۔
۱۱، نومبر ۱۹۵۳ء

پیارے عزیز سلامت رہو

دو سو روپے کا ایک چک بھیج رہا ہوں اپنے کھاتے میں جمع کرا کے رقم میرے پاس بھیج دو۔ مزاج کئی دن سے ناساز ہے۔ آج سے کل تک طبیعت ٹھیک ہوگئی تو لکھنؤ ریڈیو سے میری ایک تقریر ہوگی اپنی شاعری کے باب میں، یعنی شعر مع تبصرہ۔

کوئی تین ہفتے گزر گئے ہیں نے اک خط لکھا تھا کوئی جواب نہیں آیا۔ اب تمہارا مزاج کیسا ہے۔ اپنی خیریت ذرا جلد لکھ بھیجا کرو۔ جی لگا رہتا ہے۔ یگانہ

(۷۳)

پیلا مکان شاہ گنج، لکھنو
۱۵، دسمبر ۱۹۵۳ء

میرے پیارے عزیز سلامت رہو

تمہارا خط مورخہ ۹ دسمبر سامنے ہے۔ میں نے غالباً دوسرے ہی دن تمہاری تجویز کے مطابق بیگم کے معاملے کے متعلق تفصیلی حالات جوشؔ کو لکھ بھیجے۔ غالباً وہ کچھ نہ کچھ سلسلہ جنبانی کر رہے ہوں گے۔ اپنی طبیعت کا یہ حال ہے کہ تمہارے خط کا جواب لکھنے میں سات دن گزر گئے۔ اتنا ضعف ہے کہ پڑے رہنے کے سوا کچھ ہو نہیں سکتا۔ بہت دنوں سے چاہتا ہوں کہ ایک دن سکریٹریٹ جاکر خود دریافت کروں کہ بیگم کے کاغذات منزل بہ منزل یہاں تک پہنچے یا نہیں۔ غالباً مہتہ صاحب کاغذات گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیج چکے ہوں گے۔ اب چند روز باقی رہ گئے ہیں، خاموش دم سادھے بیٹھا ہوں۔ قانونی شکنجے سے خدا بچائے۔ بات یہ ہے کہ تم لوگ موجود ہو تو میرا دل قوی ہے، ورنہ بڑی پریشانی کی بات ہے کہ دن اتنے قریب آ گئے (۲، جنوری) اور یہاں کچھ معلوم ہی نہیں کہ اس معاملے میں کیا ہو رہا ہے۔ خیر، ڈر رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔

ہاں مسٹر ہاشم اسمٰعیل نہایت شائستہ شریف انسان ہیں اور دل میں ہم ایسوں کا درد رکھتے ہیں۔ پہلے گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم تھے، ایران اور افریقہ میں سفیر کی حیثیت سے رہ چکے ہیں۔ میری ہر وقت دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔ خدا

انھیں خوش رکھیے۔ اب میں منتظر ہوں تمہارے جواب کا کہ بیگم کے کاغذات گورنمنٹ آف انڈیا سے یوپی گورنمنٹ میں پہنچے یا ابھی کچھ دیر ہے۔ خدا حافظ۔ یگانہ

(۷۴)

پیلا مکان شاہ گنج لکھنؤ
۲۲ رجنوری ۱۹۵۴ء

پیارے عزیز سلامت رہو

یہ تو ممکن ہی نہیں کہ تم مجھ سے اتنے دنوں تک غافل بیٹھے رہو ایسے حال میں۔ ہو نہ ہو کوئی ایسی ہی پریشانی ہے جو مجھ سے بے خبر ہو۔ تمہارے خطوں سے تمہاری FINANCIAL اور SOCIAL CONDITION کی طرف جو اشارہ پایا جاتا ہے وہ البتہ۔۔۔۔۔[1] مختصر یہ کہ میں دن رات کی کھانسی اور تنفس کی شدت سے بے چین رہتا ہوں۔ بیگم کے ویزا کی مدت ۲۱ جنوری تو ختم ہو گئی اور مجھ میں اتنا دم نہیں کہ گھر سے باہر نکل سکوں۔ خیر حسنِ اتفاق سے ۱۰ مارچ تک اور مہلت مل گئی ہے۔ یہاں کے پاسپورٹ۔۔۔۔[2] سے میں بڑی محنت اور کوشش کے بعد ایک دن ملا تھا انھوں نے بیگم کی PERMANENT SETTLEMENT کے معاملے میں بالکل اُکھڑی اُکھڑی باتیں کیں کہ قانون کے معاملے میں ہم کیا مدد کر سکتے ہیں، اور یہ بھی کہہ دیا کہ یہ معاملہ تو گورنمنٹ آف انڈیا کے ہاتھ میں ہے اور یہاں سے جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ ہم آپ پر ظاہر بھی نہیں کر سکتے۔ غرض یہ کہ بالکل اکھڑے ہوئے تھے۔ حالانکہ اصل منظوری STATE GOVT کی ہے، انھوں نے گورنمنٹ آف [انڈیا] پر ٹال دیا۔

معلوم ہوتا ہے مہتہ صاحب نے جو کاغذات بھجوا دیے ہیں وہ یہاں پہنچ گئے ہیں اور خفیہ پولیس کے حوالے کر دیے گئے ہیں تحقیقات کے لیے۔ خفیہ پولیس بھلا نقصان پہنچانے کے سوا اور کیا مدد کرے گی۔ معلوم ہوتا ہے مہتہ صاحب نے بیگم کے کاغذات اس طرح مستحکم کر کے نہیں بھیجے جس طرح مسٹر سہگل نے میرے معاملے کو مستحکم کر کے تار بھیج کر یوپی گورنمنٹ سے اجازت منگوائی تھی۔ بیدھی سی بات ہے شوہر زندگی کی آخری منزل میں ہے، ایسی حالت میں بیوی کی یہ درخواست بالکل واجب اور قابلِ منظوری ہے مگر معاملہ خفیہ پولیس کے ہاتھوں میں دے دیا گیا۔ افسوس میں گھر سے باہر نکلنے کی طاقت نہیں رکھتا، پیروی کون کرے

---

[1] نقطے مطابقِ اصل۔

[2] یہاں سے کاغذ دریدہ ہونے کی وجہ سے ایک لفظ ضائع ہو گیا ہے۔

جوش نے اپنی مہربانی سے اپنے ایک دوست سعید حسن صاحب آئی سی ایس کو اک چٹھی لکھ دی اور مجھے لکھا تھا کہ اُن سے مل لوں، وُہ کچھ مدد کریں گے مگر میں دن رات پلنگ پر پڑا رہتا ہوں، تھوڑی دُور بھی رکشا پر جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ دیکھوں کب اُن سے ملنے کی نوبت آتی ہے۔ اب تو مدت بس ۸ر مارچ تک ہے، پھر اللہ جانے کیا ہوگا۔ یہاں تو گھڑی گھڑی حالت نازک ہوجاتی ہے۔ کراچی میں میری لڑکی اور داماد وغیرہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ میں یہاں موجود ہوں اور دہلی میں شعلہ صاحب موجود ہیں، وہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک کرلیں گے مگر یہاں کا یہ حال ہے اور تمھارا دہ حال ہے۔ آگے تم جانو زیادہ کیا لکھوں لکھا نہیں جاتا۔ ہاں ایک ضروری بات یہ ہے کہ میں تمھیں ڈیڑھ سو روپے بھیجنا چاہتا ہوں تاکہ تم کراچی خط لکھ کر شہریار میرزا سلمہٗ کو دلادو۔ اب بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے رقم یہاں SOLOMON CO. کے پاس جمع کردوں یا براہِ راست تمھیں بھیج دوں۔ یگانہ

(۷۵)

پیلا مکان شاہ گنج، لکھنؤ
۳ر فروری ۱۹۵۴ء

پیارے عزیز سلامت رہو

تمھارا خط پہنچا۔ مہتہ صاحب کے خط کا خلاصہ بھی دیکھا۔ تانت باجی راگ بوجھا۔ اب بتاؤ کیا ہوگا۔ جوش سے کیا باتیں ہوئیں، کیا طے پایا۔ میں تو پلنگ پر پڑا رہتا ہوں۔ سینہ اور پیٹھ سردی کے مارے اور کھانسی کے مارے نہایت کمزور۔ آج ڈاکٹر کے ہاں گیا کشاں کشاں رکشا پر بیٹھ کر۔ دُوسرا نسخہ لکھا ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔

دعاگو۔ میرزا یگانہ

(۷۶)

پیلا مکان۔ شاہ گنج، لکھنؤ
۱۳ر فروری ۱۹۵۴ء

پیارے عزیز سلامت رہو

میرا پچھلا خط کتنا ضروری تھا مگر معلوم نہیں تم کیا کررہے ہو۔ کل پھر میں نے جوش کو لکھا ہے۔ یہاں کے پاسپورٹ افسر کے پاس کل کشاں کشاں پہنچا۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ کی اہلیہ کے کاغذات آئے ہوں گے تو گورنمنٹ آف انڈیا میں بھیج دیے گئے ہوں گے۔ یا بھیج دیے جائیں گے، ایں بتا نہیں سکتا یہاں سے کیا لکھا گیا۔ مگر

یہاں مستقل سکونت کی منظوری گورنمنٹ آف انڈیا دے گی، جب سے پاسپورٹ کا رواج ہُوا ہے اسٹیٹ گورنمنٹ مستقل سکونت کی منظوری نہیں دیتی۔ یہ اُن کا بیان ہے۔ اللہ جانے حقیقت کیا ہے۔ ممکن ہے پاسپورٹ جاری ہونے کے بعد قاعدہ قانون بدل گیا ہو۔ اچھا بھائی گورنمنٹ آف انڈیا منظوری دے گی تو پھر تم اور جوشؔ مل کر جلد منظوری حاصل کرنے کی تدبیر کرو، مہلت تو یہاں بہت کم ہے یعنی ۱۰ مارچ کو (خدانخواستہ) بیگم کو روانہ ہونا چاہیے۔[1]

(۷۷)

پیلا مکان۔ شاہ گنج، لکھنؤ[2]
۱۵ فروری ۱۹۵۴ء

پیارے عزیز سلامت رہو
کل سے جی نڈھال ہو رہا ہے، پرسوں ایک خط تمھیں بھیج چکا ہوں اور ایک خط پرسوں ترسوں جوشؔ کو بھیج چکا ہوں۔ بیگم کے پاسپورٹ کی مدت ختم ہو رہی ہے ۱۰ مارچ تک۔ یوپی کے پاسپورٹ افسر کہتے ہیں، اُن کے کاغذات کے متعلق یہاں سے کیا لکھا گیا، یہ بتایا نہیں جائے گا، مگر اب PERMANENT SETTLEMENT کی منظوری گورنمنٹ آف انڈیا دے گی، اسٹیٹ گورنمنٹ کو اب اختیار نہیں۔ اللہ جانے حقیقت حال کیا ہے۔ تو بھائی جان اب تو میں پڑا ہُوا ہوں نڈھال۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا سے کام پڑا ہے تو تم اور جوشؔ جلدی منظوری حاصل کرو ورنہ خدا جانے کیا ہو۔ میرزا یگانہ

(۷۸)

پیلا مکان شاہ گنج لکھنؤ
۲۸ مارچ ۱۹۵۴ء

پیارے عزیز سلامت رہو، خوش رہو
تمھارا محبت نامہ مورخہ ۲۶ مارچ ملا۔ کیا کہوں کتنے رنج کی بات ہے کہ اب تم بھی اپنے حالات اور صحت کے لحاظ سے دُکھی رہنے لگے ہو، خیر کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ یہ دُکھ بھی گزر جائے گا۔
نہ جانے بیگم کا OVERSTAY کتنی پریشانی کا باعث ہو گا مگر میں کیا کروں اور کوئی

---

[1] اس خط کے آخر میں یگانہ نے اپنا نام نہیں لکھا۔
[2] خط کی پیشانی پر انگریزی میں لفظ "ارجنٹ" لکھا ہے۔

کیا کرے۔ اچھا مجھے جلد ہی پتا بتاؤ کہ مسٹر سہگل (خدا انھیں خوش رکھے) جو کہ ڈپٹی پرمٹ آفیسر تھے اور جنھوں نے مجھے پاکستان سے رہائی دلائی تھی، وہ آج کل کہاں ہیں، وہ .R. G سہگل ہیں یا .K. G سہگل۔ ۲۳ر دسمبر ۵۲ء کو ریل پر اک صاحب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ اب اُن کا تبادلہ کراچی سے گورنمنٹ آف انڈیا کے کامرس ڈپارٹمنٹ میں ہو گیا، لہٰذا ان کا صحیح نام اور پتا مجھے جلد لکھ کر بھیجو شاید وہ میری مدد کر سکیں۔ میرزا یگانہ

"کھانا پسند تو کیا آیا ہوگا مگر وہ تعریف بھی فرماتے رہے اور زہر مار بھی کرتے رہے[1]" زہر مار کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ غالباً تمھارا مطلب یہ ہے کہ کھانا مزے کا تو نہ تھا مگر کھا لیا، اُگل نگل کے۔ مگر یہ کیا بات ہے، محبت سے کھلایا تو باسی ٹکڑے بھی ہوتے تو مزہ دے جاتے۔[2]

(۷۹)

پیلا مکان شاہ گنج، لکھنؤ
۳۰ر مارچ ۱۹۵۴ء

پیارے عزیز سلامت رہو

تمھارے خط کا جواب دے چکا ہوں۔ دو تین دن سے مزاج پھر زیادہ ناساز ہے۔ آج دیکھتا ہوں تو MENDACO کی شیشی میں بھی تین گولیاں پڑی ہیں؛ دو گولیاں ابھی کھا لیں۔ اچھا تو اب جلدی سے ایک شیشی MENDACO 24 DAY SIZE بھیج دو۔ زیادہ کیا کہوں۔ خدا تمھارے بگڑے کام سنوار دے۔ میرزا یگانہ

(۸۰)

میرا موجودہ پتا:[3]
میرزا یگانہ
چوکی نخاس۔ شاہ گنج لکھنؤ
یکم مئی ۵۴ء

پیارے عزیز خوش رہو آباد رہو

---

[1] یہ شعلہ کے خط کا جملہ ہے۔
[2] یہ پیراگراف خط میں بعد میں اضافہ کیا گیا ہے۔
[3] یہ عبارت، نام، پتا اور تاریخ انگریزی میں ہے۔

تمہارا خط مورخہ ۲۴ اپریل رجسٹری شدہ آج ملا جو تمہاری دیرینہ محبت کا ثبوت ہے۔ تم میرے متعلق اتنے فکرمند ہو اور ہونا ہی چاہیے۔

اچھا تو سنو میرے ہوش و حواس تو اب تک درست ہیں مگر سینہ اپنا کمزور ہے کہ ہر وقت ہچکی لگی رہتی ہے اور دونوں پنڈلیاں کمزور ہوتی جارہی ہیں۔ تلووں کی طاقت خرچ ہو رہی ہے، مختصر یہ کہ میں بڑی مشکل سے اُٹھ کر پاخانہ تک جاتا ہوں۔ بیگم میرے پاس نہیں۔ اب تک کچھ نہیں معلوم کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے اُن کی درخواست PERMANENT SETTLEMENT پر کیا فیصلہ صادر کیا۔ کچھ نہیں معلوم پولیس کیا کارروائی کرے گی۔ اب یہ سب باتیں دریافت کرنا مجھ سے ممکن نہیں۔ جو ہو سو ہو۔ جو شخص تو بالکل گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھ رہے۔ عزیز نے جو تم سے بیان کیا اس کی مکرر تصدیق معتبر ذریعے سے کر کے مجھے جلد اطلاع دو کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے منظوری دی تو کب دی اور وہ کاغذات یوپی گورنمنٹ کو واپس بھیج دیے گئے یا نہیں۔ یہاں تو یہ حالت ہے کہ میں اپنے دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا۔ ایک غریب آدمی کو دو دن (۲۸، ۲۹ اپریل) سکریٹریٹ بھیج کر دریافت کرانا چاہا کہ بیگم کے کاغذات پر کیا حکم ہوا۔ مگر یہاں یہ اندھیر کہ سکریٹریٹ کے دروازے پر جو لوگ ADMISSION TICKET دینے کے لیے مامور ہیں وہ غریبوں کو سخت پریشان کرتے ہیں اور ٹکٹ نہیں دیتے۔ داخلہ ٹکٹ مل جاتا تو وہ اندر جا کر پاسپورٹ آفیسر سے ملتے اور دریافت کرتے، مگر اندر جا ہی نہ سکے واپس آ گئے، اب میں کیا کر سکتا ہوں۔

تم کسی طرح صحیح طور پر اتنا دریافت کر کے اطلاع دو کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے بیگم کو ہندوستان میں مستقل طور پر رہنے کی اجازت دے دی یا نہیں دی۔ اور وہ کاغذات لکھنؤ بھیج دیے گئے یا وہیں دہلی میں پڑے ہیں[1] میرزا یگانہ

(۸۱)

میرزا یگانہ[2]
چوک نخاس، شاہ گنج، لکھنؤ
۴، ۵، ۵۴ء

پیارے عزیز سلامت رہو

تمہارے رجسٹری شدہ خط کا جواب اُسی دن بھیج چکا ہوں کہ بیگم

---

[1] خط کی دوسری طرف یہ عبارت لکھی ہے: " MENDACO کی دو چھوٹی شیشیاں آٹھ آٹھ دن کی مل گئیں۔ معلوم ہوا ہے دوا اُن کے پاس تھی شہر بھر میں کہیں نہیں ہے۔"

[2] نام، پتا اور تاریخ انگریزی میں ہے۔ خط کی پیشانی پر انگریزی میں لفظ "ارجنٹ" لکھا ہے۔ پتے کے نیچے "جواب کا سخت انتظار رہے گا" کے الفاظ بعد میں اضافہ کیے ہیں۔

اب تک میرے پاس ہیں۔ ویزا کی مدت گزر چکی ہے اور اب تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے اُن کی درخواست (مستقل سکونت ہندوستان) کے بارے میں کیا فیصلہ کیا۔ میں نے اُسی خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ عرش ملسیانی کی زبانی جو کچھ تمھیں معلوم ہُوا ہے اس کی معتبر ذریعے سے تصدیق کرکے مجھے اطلاع دو کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے کیا فیصلہ کیا۔ یہاں تو کوئی اطلاع نہیں ہے نہ کوئی ذریعہ ہے کہ دریافت کرسکوں۔ میرے پاس کوئی آدمی نہیں۔ یگانہ

(۸۲)

میرزا یگانہ چنگیزی
چوکی نخاس شاہ گنج لکھنؤ

عزیز من سلامت رہو

اتنی کوشش کرنے کے بعد بھی تمھیں کچھ معلوم نہ ہوسکا، اب میں کیا کروں۔ ادھر دو دن میں شاید اور کسی سے کچھ معلوم ہوسکا ہو تو اطلاع دو۔ سخت الجھن میں پڑا ہُوں۔

مسٹر سہگل کا پُورا نام اور پتا لکھ بھیجو۔ غالباً وہ کامرس ڈپارٹمنٹ میں ہیں گورنمنٹ آف انڈیا میں۔

میرزا یگانہ ۹-۵-۱۹۵۴ء

(۸۳)

میرزا یگانہ۔ جناب کی گلی۔ شاہ گنج۔ لکھنؤ
۲۲ رمئی ۱۹۵۴ء

پیارے عزیز سلامت رہو

بہت دنوں سے تمھارا خط نہیں آیا تو آج چار پانچ . . . [۲] میں نے ایک پوسٹ کارڈ تمھیں بھیجا۔ اُس کے بعد ہی تمھارا ایک پوسٹ کارڈ ملا اور پھر دُوسرا پوسٹ کارڈ۔

کل سے میری طبیعت پھر نڈھال ہے۔ لیٹا رہتا ہوں۔ کھانسی کی بھی شدت ہے۔ میرے پاس تو اب ایک پُرزہ ایک پرچہ تک نہیں رہا۔ سلطان بہادر روڈ سے جب نکلا ہُوں تو سارا گھر یُوں ہی چھوڑ کر نکلا تھا۔ گرہستی کا سارا سامان لُوٹ لیا گیا اور رنج تو اِس کا ہے کہ زندگی بھر کی کمائی MANUSCRIPTS بھی لُٹ گئی۔ کون جان سکتا ہے

---

[۱] نام اور پتا انگریزی میں ہے اور خط کے آخر میں ہے۔

[۲] یہاں سے چند لفظ ضائع ہوگئے ہیں۔

کہ اُس دفتر پریشان میں کیا کیا چیزیں تھیں۔ یگانہ[1]

(۸۴)

میرزا یگانہ چنگیزی[1]
چوکی نخاس، شاہ گنج۔ لکھنؤ
۲۴ر جون ۱۹۵۴ء

پیارے عزیز سلامت رہو

آج طبیعت ذرا بحال ہے تو خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ ۱۶ر جون کو شہر یار میرزا[2] سلّمہٗ پاکستان سے دہلی اور آگرہ ہوتے ہوئے مجھ تک پہنچے۔ معلوم ہوا کہ اُنھیں اور میرے نواسے جاوید سلّمہٗ کو تم نے خوب خوب پلاؤ اور پکوان وغیرہ کھلائے، ماشاءاللہ کیوں نہ ہو۔ امید ہے نرملا سلمہا اور اُن کا بچہ اچھا ہو گا۔

۲۱ر جون کو خفیہ پولیس کا اک جوان اک سرکاری مراسلہ بیگم کے دستخط کے لیے لایا جسے سرسری طور پر دیکھ کر معلوم ہوا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے اُنھیں ہندوستان میں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ شکر ہے۔ یگانہ ۲۴ $\frac{6}{54}$

(۸۵)

میرزا یگانہ چنگیزی[3]
چوکی نخاس، شاہ گنج، لکھنؤ
۴ر اگست ۱۹۵۴ء

ارے یار کیا بات ہے کیوں مجھے بھلا بیٹھے۔ یہ جانتا ہوں کہ تم نہایت غیر مطمئن حالات سے گزر رہے ہو مگر اتنی بے خبری بھی کیا۔ کبھی کبھی ادھر کی کروٹ بھی لے لیا کرو اور دیکھ لیا کرو ہیں کیوں کر صبح سے شام اور شام سے صبح کرتا ہوں اور جیسے جاتا ہوں۔ کوئی کام کرنے کے قابل نہیں۔ سانس لینا دو قدم چلنا مصیبت ہے۔ کیا کہوں۔

---

[1] یگانہ آرٹ" کے عنوان کے تحت، خط کے آخر میں دو رباعیاں لکھی ہیں (۱) کیا کھیے زمین کتنی ہے زر کتنا ہے۔ (۲) مردانِ خدا کسی کے آگے نہ جھکے) یہ دونوں رباعیاں غیر مطبوعہ کلام کے تحت شائع کی جا رہی ہیں۔

[1] نام، پتا اور تاریخ انگریزی میں ہے۔

[2] اس نام پر شعلہ نے یہ نوٹ لکھا ہے: "میرزا کے داماد — بلند اقبال کے شوہر — شعلہ"

[3] نام، پتا اور تاریخ انگریزی میں ہے۔

میرا MANUSCRIPT کہاں ہے کس حالت میں ہے۔ یگانہ
میرزا حیدر بیگ سلمہٗ کا خط آیا ہے کراچی سے جس میں میرا ایک مطلع
نقل کیا ہے:

زمانے پر نہ سہی دل پہ اختیار رہے
دکھا وہ زور کہ دنیا میں یادگار رہے

اس سے پتا چلتا ہے کہ اس لڑکے نے میرا اصول زندگی میری سیرت کو سمجھا ہے۔ یہ دیکھ کر جی خوش ہوا۔ غالباً تم بھی اس کی نظرِ انتخاب کی داد دو گے۔ یگانہ

(۸۶)

چوکی نخاس، شاہ گنج، لکھنؤ

پیارے عزیز سلامت رہو

دن رات کی ایذا سے دم اُلٹنے لگا ہے۔ سینے میں سانس نہیں سماتی۔ دونوں پاؤں اور تلوے سنسناتے رہتے ہیں۔ دو قدم چلنا مصیبت ہے۔ خیر یہ دُکھڑا کب تک رویا جائے گا۔

کہنا یہ ہے کہ ۲ر جولائی ۵۳ء کو جب میں سلطان بہادر روڈ سے چلا گھربار اور تمام اثاثہ اور کتابیں مسودات وغیرہ چھوڑ کر تو دو تین ٹرنک اور بستر ساتھ لے لیے تھے اور یہ ریڈیو۔ پانچ VALVE کا فرگوسن ریڈیو (انگلش) نہایت اعلیٰ۔ اب میرے لیے بیکار ہے۔ میں اسے پیاری نرملا کو اپنی یادگار کے طور پر دیتا ہوں۔ جس طرح بن پڑے کسی آتے جاتے کے ہاتھ ریڈیو منگوا لو۔ اِس کا لیسنس ۳۱ر دسمبر ۵۴ء تک کا موجود ہے۔

میرے مسودات اب یورپ بھیج دو یا کوئی تجویز پیش کرنا چاہو تو کرو۔

جواب کا منتظر۔ میرزا یگانہ

[۶ر ستمبر ۱۹۵۴ء] 6.9.54.

(۸۷)

چوکی نخاس شاہ گنج، لکھنؤ
۱۰ر ستمبر ۱۹۵۴ء

پیارے عزیز سلامت رہو

یہ خط ذرا بے چینی کی حالت میں لکھ رہا ہوں۔ سانس زوروں سے چل رہی ہے۔ پاؤں میں دم نہیں۔ مگر ابھی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔

۹ ستمبر کو میں نے اک رجسٹری شدہ لفافہ تمھیں بھیجا ہے، اُس کے جواب کا ہنوز انتظار ہے۔ اُمید ہے تم ہر طرح باخیریت سے ہوگے۔ میرزا یگانہ

(۸۸)

میرزا یگانہ چنگیزی
چوکی نخاس۔ شاہ گنج، لکھنؤ
۲۹ ستمبر ۱۹۵۴ء

میرے پیارے عزیز خوش رہو آباد رہو

منا بابو اور عزیزی لالہ مدن لال آئے اور تمھارا خط دیا۔ پڑھ کر دل بھر آیا اور اب یہ دُوسرا خط مورخہ ۵ ستمبر بھی سامنے ہے جس میں تم نے مجھے "حبیب" کا مرتبہ عطا کیا ہے اور اپنے کو "خاکپائے حبیب" لکھا ہے۔ خلوص و وفا کی اس نعمت کے سامنے دنیاوی مکروہات اور زندگی کی تلخیاں کیا حقیقت کیا وزن رکھتی ہیں، کچھ بھی نہیں۔ میری خوش نصیبی میں شک کیا ہے۔ شکر کا مقام ہے کہ میں تمھیں خوش رکھ سکا اور تم نے اِس خلوص و محبت کے ساتھ مجھے اپنے دل میں جگہ دی۔ اپنا حبیب جانا۔ اس سے بڑھ کر میری عزت اور کیا ہوتی۔ اِس کے سامنے تمام "رسوائیاں" ہیچ اور بے معنی ہیں۔

مگر اُس آخری وقت میں فقط تم اور مسٹر ہاشم اسمٰعیل دونوں مجھے پیش نظر رکھتے ہیں۔ باقی اور جتنے احباب تھے، ایسے انجان ہو گئے جیسے کبھی کی جان پہچان ہی نہ تھی۔

غنیمت ہے کہ اب تمھارے مرض میں افاقہ ہے۔ تم نے نرملا سلتھا کے بارے میں لکھا ہے کہ بڑی نیک بیٹی ہے، بڑی توجہ سے تیمارداری کرتی اور تمھاری پائنتی سنبھالے رہتی ہے مگر مجھے یہ سن کر بڑی ہنسی آئی کہ اُس کا خلوص جاٹوں کا سا خلوص ہے بندے مار! واہ جی واہ۔

یہ معلوم کر کے اطمینان ہُوا کہ تمھیں MSS. کی نقل رکھنے کی بھی فکر ہے۔ ہاں یہی ہونا چاہیے مگر اس کے متعلق میں اتنا ضرور کہوں گا کہ جس سے بھی نقل کراؤ اپنے سامنے بٹھا کر نقل کراؤ۔ کاغذات اُسی کے حوالے نہ کرو کیونکہ یہ کاغذات ایسے تو ہیں نہیں، اور جس کسی کو دو چار صفحے سے زیادہ نہ دو۔ پُورا مسودہ ہرگز نہ دو۔ چار پانچ جو ایک نشست میں نقل ہو سکیں، اُتنے ہی دو۔ اب دُوسری بات یہ ہے کہ نقل کرنے والا ایسا ہو جو صحیح نقل کر سکے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی . . . سے یہ کام لیا نہیں جا سکتا۔ میرے خیال میں بشیشر پرشاد منور لکھنوی کو ہموار

کرسکے اُن سے یہ کام لے سکو تو لے لو۔ میں جانتا ہوں وہ میرے ہمدرد ہیں۔ بہی خواہ ہیں۔
مگر یہ فقط میرا اک خیال ہے۔ کام تو تمھیں اپنی رائے پر کرنا ہے اپنے بھروسے کے آدمی سے
کام لینا ہے۔ نقل میں کچھ غلطی رہ جائے گی تو اُسے میں درست کر دوں گا۔ الغرض ان مسودات کو
یورپ بھیجنا ضرور ہے۔ میرزا یگانہ

(۸۹)

موجودہ پتا:
پیلا مکان، شاہ گنج۔ لکھنؤ
۱۹ دسمبر ۱۹۵۴ء

پیارے عزیز سلامت رہو

کتنے دن ہو گئے تمھارا کوئی خط نہیں آیا۔ عرشؔ ملسیانی سے بھی
تمھاری خیریت دریافت کی وہاں سے بھی کوئی جواب نہ ملا۔

ایک مہینہ بیس دن سے میں نہایت سختیوں میں گزار رہا ہوں۔ ڈاکٹری
علاج چھوڑ کر اب یونانی علاج کر رہا ہوں، فقط دل کی تسلی کے لیے۔ گھڑی بھر میں دل دماغ کی
حالت کچھ سے کچھ ہو جایا کرتی ہے۔

گورنمنٹ آف انڈیا میں میرے الاؤنس کی تجدید کی کارروائی پیش تھی۔
ذرا دریافت کرو کیا فیصلہ ہوا۔ خدا تمھیں خوش رکھے۔

جوشؔ کو گزشتہ تین مہینوں میں کوئی تین خط لکھ چکا ہوں کچھ جواب
نہیں۔ یگانہ

(۹۰)

موجودہ پتا:
میرزا یگانہ چنگیزی
پیلا مکان۔ شاہ گنج، لکھنؤ۔ ۲۶۔ دسمبر ۱۹۵۴ء

پیارے عزیز سلامت رہو

تمھارا محبت نامہ مورخہ ۲۴ دسمبر ملا۔ اِس سے پہلے کا خط نہیں ملا
کیونکہ میں پھر سابق جگہ پر مجبوراً واپس ہوا ہوں۔ حالات سخت سے سخت ہوتے گئے۔

//

تمھاری صحت کی حالت ہیں اور گھٹتا پڑتا جاتا ہے۔ روز بروز الجھن بڑھتی جاتی ہے۔ یہ اور رنج کی بات ہے کہ تمھیں دمہ کی شکایت پیدا ہوگئی ہے۔

معلوم نہیں میرے مسودات کہاں ہیں۔ اب اُنھیں جلد OXFURD بھیج دو اور مجھے اطلاع دو۔ اپنے پاس رکھنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ میری حالت آج کل یہ ہے کہ پلنگ کے پاس ہی تسلہ لگا دیا جاتا ہے اور یہیں رفع حاجت کو بیٹھ جاتا ہوں۔ اتنا دم نہیں کہ کمرے سے نکل کر انگنائی نانگھ کر پاٹخانے تک جاؤں۔ زیادہ کیا لکھوں خدا تم پر اپنا فضل و کرم رکھے۔ یگانہ

(۹۱)

پیلا مکان۔ شاہ گنج، لکھنؤ
۲۱۔ فروری ۱۹۵۵ء

میرے پیارے عزیز خدا تمھیں تندرست رکھے۔ خوش رکھے۔

آج کتنے انتظار کے بعد تمھارا محبت نامہ مورخہ ۱۸ فروری ملا۔ تمام حالات تمام سرگزشتیں معلوم کرنے کے بعد قدرے اطمینان ہوا کہ خیر جو کچھ بھی ہوا سو ہوا اب تک خدا کا فضل ہے۔ میں بہت بے چین تھا اتنے دنوں تک خط نہ آنے کی وجہ سے۔ آج میرے ہوش و حواس کچھ بہتر ہیں آج ہی خط کا جواب لکھ رہا ہوں۔

میرے مسودات کی نقل لینے کی جو کوشش تم نے کی ہے، اُمید ہے کہ اب یہ کام انجام پا جائے گا۔ مگر تمھارے تھوک میں خون آنے کی اطلاع سے وحشت ہوتی ہے۔ تمھارے عزیز دوست کی موت کی خبر بھی سُنی۔ خیر خدا کی مرضی۔ سگریٹ پینا نہ تم چھوڑو گے نہ میں، چاہے جو کچھ بھی ہو کیا کیا جائے۔ خیر اک رباعی سنو اور غور کرو۔ یگانہ

(۹۲)

پیلا مکان شاہ گنج۔ لکھنؤ
۱۳ مارچ ۱۹۵۵ء

پیارے عزیز، خوش رہو۔

تمھارا محبت نامہ مورخہ ۱۸ فروری پہنچا، پڑھ کر اطمینان ہوا کہ مسودات کے بارے میں تم ضروری تدبیریں کر رہے ہو۔ اس خط کا جواب میں دے چکا ہوں جو تمھیں مل چکا اور جس کے جواب میں تم نے CONTINUATION SHEET پر دوسرا خط لکھا ہے۔

اس کا جواب اب تک نہیں دے سکا۔ دیکھ کر جی خوش ہوا کر تم میرے پاس آنا چاہتے ہو۔ تمہارا اور ہاشم اسمٰعیل کا خط آجاتا ہے تو دل کو اک بچا یا سا لگ جاتا ہے۔ بھلا اس سے بڑھ کر مسرت اور کیا ہوگی کہ خود تم میرے پاس آجاؤ اور تمہیں اپنے پاس بٹھا کر کچھ باتیں کروں۔ ہاشم صاحب کے بھی کئی خط آئے ہیں جن کا ابھی تک میں جواب نہیں دے سکا۔ وُہ پھر کراچی جا رہے ہیں۔ اب وہیں کے پتے سے اُن کو خط لکھوں گا۔ اُنھوں نے میرا فوٹو مانگا ہے۔ ڈیڑھ مہینے تک ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے میں امین آباد تک بھی جانے کے قابل نہ تھا۔ کل جا سکا اور فوٹو کھچوایا۔ تیار ہو کر آجائے تو اُنھیں بھیج دُوں۔ وہ میری اک مختصر سی سوانح عمری لکھنا چاہتے ہیں، اس کے لیے فوٹو کی ضرورت ہے۔

آج تمہارا خط مورخہ دیروزہ ملا جس سے معلوم ہوا کہ تمہارے نواسے کو کھسرہ ہو گئی تھی جس سے وہ بہت پریشان رہا۔ خیر خدا نے فضل کیا اور اب ماشاءاللہ اچھا ہو رہا ہے۔ شکر ہے تم مجھ سے ملنے کے لیے بے قرار ہو۔ آؤ میرے پیارے جلد آؤ۔ اس سے بڑھ کر اور کیا مسرت ہو سکتی ہے۔ تم مجھے پڑھا لکھا دانائے راز کہتے ہو۔ بھلا علم و فضل سے مجھے کیا علاقہ۔ ہاں میرے لیے باعثِ فخر وہ باتیں ہیں جنھیں تم نے جانچا ہے اور مجھ سے محبت کرتے ہو۔ کسی موقع پر تم نے میرے بارے میں لکھا تھا[1] He means what he says بلیں اس سے زیادہ تعریف اور کیا ہوگی؟ ہاں یہ بھی بڑی بات ہے کہ آخر عمر میں مجھ پر ڈریپ..... ایسا کھل گیا کر تو بہ ہی تو بہ۔

مردانِ عمل کو اجر کی پروا کیا؟ خود ذوقِ عمل اجر ہے اندیشہ کیا؟
دُنیا میری بلا سے خوش ہو کہ نہ ہو میں اپنے سے خوش ہوں تو غمِ دنیا کیا؟

میرزا یگانہ

جلد آؤ اور آ کر دیکھو میں جسمانی ایذاؤں کے علاوہ رہائش اور اپنے حالات کے اعتبار سے کیا کیا امتحان دے رہا ہوں، اور بحمداللہ اب تک ثابت قدم ہوں۔ کتنا خوفناک مستقبل ہے مگر پنہاں بر چشم قلندر۔

(۹۳)

پیلا مکان شاہ گنج، لکھنؤ
۱۲ اپریل ۱۹۵۵ء

پیارے عزیز سلامت رہو

آج کئی دن ہوئے تمہارے اک خط کی نقل مجھے پہنچ گئی تھی۔ مگر

---

[1] ان الفاظ کے نیچے لکیر کھینچ کر یہ لکھا ہے: "رام رتن منہ کو۔"

میں کیا کہوں کس حال میں ہوں اگرچہ اب تا بہتر حالت میں ہوں۔ دو سطریں لکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ اُس خط کی نقل سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ تمھارے پاؤں میں چوٹ آگئی ہے اور اب تک اُس کی تکلیف دفع نہیں ہوئی۔ غالباً اب دفع ہوگئی ہوگی۔ کیفیت مزاج سے جلد اطلاع دو۔ میں اب اس حال میں ہُوں کہ ڈاک خانے میں خط ڈلوانا چاہتا ہوں اور کوئی آدمی نہیں ملتا۔ یگانہ

(۹۴)

موجودہ پتا: معرفت کوٹھی ادبستان
دین دیال روڈ۔ لکھنؤ

پیارے عزیز خوش رہو

اکیلا رہ گیا ہوں۔ یہاں جھونپڑی ڈال کے پڑا ہوں۔ دنیا بڑی بے وفا ہے۔ ادھر کئی دن سے طبیعت زیادہ نڈھال ہے، موسم ہے برسات کا۔
کیا بات ہے کیوں اتنے دنوں سے بے خبر ہو۔ کیسے ہو، صحت کا کیا حال ہے۔ یگانہ

(۹۵)

پیلا مکان، شاہ گنج، لکھنو
۹ ستمبر ۱۹۵۵ء

پیارے عزیز سلامت رہو

وہاں پروفیسر مسعود حسن کے باغ میں چھپر ڈال کر ایک مہینہ چوبیس دن رہا۔ مگر برسات کا زور بندھا تو پھر میں زمین پر نہ تھا، آب و گِل میں پڑا تھا اور مرض کی شدت نے اور زیادہ پریشان کیا، آخر مجبور ہو کر ۹ اگست کو پھر یہاں چلا آیا۔ کیا کہوں صبح سے شام اور شام سے صبح کیونکر ہوتی ہے۔ دن میں کئی بار حالت خراب ہو جاتی ہے۔ وہ تو چالیس برس کا ساتھ چھوڑ کر ۲ ستمبر کو کراچی روانہ ہوگئیں۔ اب میں ہوں اور تمھاری توجہ۔ جلد ایک نوکر مہیا کرو۔ پچیس روپیہ ماہوار خشک۔ تیمارداری کرنے والا کوئی نہیں۔ دن کو تو خیر ایک آدھ آدمی خبر گیری کر لیتے ہیں مگر ہر وقت کون خبر لے۔ حالت نازک ہوتی جا رہی ہے۔ کئی مہینے سے ایک ایک سے کہتا ہوں کہ کوئی آدمی نوکر رکھوا دو مگر نا کے سوا ہاں کوئی نہیں کہتا۔ ایک آدمی ملا تھا مگر چور نکلا۔ جوش کو بھی لکھا ہے۔ یہاں تو کوئی سنتا نہیں۔ میری کون سُنے گا۔ یگانہ